MAUR402CCT

اردو نظم

ایم۔اے۔اردو

(چوتھا سمسٹر)

چودھواں پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔500032، تلنگانہ، بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course : Urdu Nazm
ISBN: 978-81-975411-2-4
First Edition: June, 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	3500
Price	:	265/- (The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Md Nehal Afroz, DDE, MANUU
Cover Designing	:	Dr. Mohd. Akmal Khan, DDE, MANUU
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Urdu Nazm

Paper XIV

For M.A. Urdu 4th Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

مدیر و پروگرام کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس اِدارت

پروفیسر نکہت جہاں

پروفیسر، اردو

نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس

سابق صدر، شعبہ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر ارشاد احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، اردو

نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

ڈاکٹر محمد نہال افروز

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد اکمل خان

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد جعفر

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

کورس کو آرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر محمد نسیم، ڈاکٹر رام منوہر لوہیاپی جی کالج، اٹوا، سدھارتھ نگر، اتر پردیش	اکائی 1, 7
پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	اکائی 2
ڈاکٹر محمد نہال افروز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 3, 9
پروفیسر عتیق اللہ، سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 4
پروفیسر عبدالحمید اکبر، صدر شعبہ اردو، خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی، گلبرگہ	اکائی 5
ڈاکٹر محمد جعفر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 6
پروفیسر بیگ احساس (سبکدوش)، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 8, 14
ڈاکٹر خلیق انجم (سبکدوش)، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی / ڈاکٹر محمد جعفر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 10
پروفیسر مجید بیدار، سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	اکائی 11
ڈاکٹر منور حسین، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ	اکائی 12
پروفیسر بیگ احساس (سبکدوش)، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد / ڈاکٹر محمد جعفر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 13
پروفیسر یوسف سرمست (سبکدوش)، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد	اکائی 15
ڈاکٹر محمد اکمل خان، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 16

فہرست

پیغام	وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	07
پیغام	ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو	08
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	09

بلاک I : نظم نگاری کا فن

اکائی1۔ نظم کی تعریف، قسمیں	11
اکائی2۔ اردو نظم کی روایت	31
اکائی3۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری: آدمی نامہ	46
اکائی4۔ اردو نظم اور ہیئت کے تجربے	64

بلاکII : اردو میں نظم جدید

اکائی5۔ اردو نظم اور انجمن پنجاب	80
اکائی6۔ مولانا حالی کی نظم نگاری: مناجات بیوہ	100
اکائی7۔ اکبر الہٰ آبادی کی نظم نگاری: برق کلیسا	127
اکائی8۔ اقبال کی نظم نگاری: ساقی نامہ	142

بلاک III : اقبال کے معاصرین

اکائی9۔ چکبست کی نظم نگاری: رامائن کا ایک سین	163
اکائی10۔ جوش کی نظم نگاری: کسان	180
اکائی11۔ اختر شیرانی کی نظم نگاری: اے عشق کہیں لے چل	199

بلاک IV : اردو نظم 1936 کے بعد

اکائی 12۔ ترقی پسند تحریک اور اردو نظم	218
اکائی 13۔ فیض کی نظم نگاری: ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے	234
اکائی 14۔ مخدوم کی نظم نگاری: چاند تاروں کا بن	253
اکائی 15۔ حلقہ ارباب ذوق اور اردو نظم	270
اکائی 16۔ اختر الایمان۔ یادیں، ن۔م۔ راشد۔ زنجیر، میر اجی۔ کلرک کا نغمہ محبت	284
نمونہ امتحانی پرچہ	316

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔(1)اردو زبان کی ترویج و ترقی(2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی(3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4)تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرداور ممتازبناتے ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کاواحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کادامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثررسائل و اخبارات میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورحاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے ،یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تیئں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کردی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پرشروع ہو چکاہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی پچیسویں سالگرہ منا رہی ہے مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامت فاصلاتی تعلیم از سر نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامت فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہورہے ہیں۔گر چہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورت حال کے باعث انتظامی امو راورترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں‌کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر،مانو

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہورہے ہیں۔مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا اوراس کے بعد 2004میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھر پور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گز شتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ڈی ای بی UGC-DEBاس بات پر زور دیتارہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیاجائے۔چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے ،لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یوجی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی موادSLMاز سرِ نوبالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یوجی،پی جی،بی ایڈ،ڈپلوما اور سر ٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلارہا ہے۔بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔متعلمین کی سہولت کے لیے 9علاقائی مراکزبنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگراور 6ذیلی علاقائی مراکزحیدرآباد، لکھنؤ، جموں ، نوح، وارانسی اور امراوتی کاایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ان مراکز کے تحت سرِ دست144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centers) نیز 20پروگرام سنٹرس (Programme Centers)کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کردیا ہے ،نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ویڈیو ریکارڈنگ کالنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس(SMS) کی سہولت فراہم کی جارہی ہے ،جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات ،کونسلنگ ،امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتاہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اورمعاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہو گا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

زبان انسانی خیالات وجذبات کے اظہار کا موثر وسیلہ اور معاشرتی عمل ہے۔اس کے ذریعے انسان اپنا مافی الضمیر واضح کرتا ہے اوریہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔زندگی کی دلکشی اور رنگینی زبان کی بدولت ہے۔ہندوستانی زبانوں کی فہرست میں اردو کا نمایاں اور تاریخی مقام ہے۔اگر چہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی تاہم اس کی وسعت اور بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اسے بولا اور سمجھا جا رہا ہے اور کئی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اسے پڑھایا جارہا ہے۔عالمی سطح پر اردو گیارہویں نمبر پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔اردو کا پیرایہ اظہار خوش گوار نزاکت کا آئینہ دار ہے۔اردو کا لہجہ دل آویز اور شیرینی کا شاہ کار ہے۔یہ زبان ان چند زبانوں میں سے ایک ہے ،جو اپنے اندر تمام انسانی آوازوں کی بہ خوبی ادائیگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی زبان کو روزمرہ کے کام تک ہی محدود رکھنا کافی نہیں ہوتا۔بول چال کے علاوہ اس کا لکھنا، پڑھنا اور اس میں موجود ادب سے واقف ہونا بھی از حد ضروری ہے۔تخلیقی اعتبار سے ادب کی مختلف نوعیتیں ہیں،جہاں ادب شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کا فریضہ انجام دیتا ہے وہیں اپنے قاری کو مسرت سے بصیرت تک پہنچانے کا سامان بھی مہیا کرتا ہے اور سب سے اہم درس وتدریس کی دنیا میں طلبا کی تربیت اور معلومات کی ترسیل کا بھی اہم وسیلہ ہے۔اسی مقصدکے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کی تعلیمی ضرورت کو پورا نے کے لیے نصابی کتابوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن(UGC) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تا کہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا تعلیمی معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبہ کے لیے دوران تعلیم ایک نظامِ تعلیم سے دوسرے نظامِ تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یوجی سی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے تمام مضامین میں نصابی کتابوں کی تخلیق و اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ان کتابوں کی تیاری میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ اکتسابی مواد نہ صرف معیاری اور ہمہ گیر ہو بلکہ مضمون کے تمام اہم موضوعات کی نمائندگی بھی کرتا ہو اور مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے معاون و مددگار بھی ہو سکے۔

ایم۔اے اردو کا یہ کورس چار سمسٹرز پر محیط ہے۔ہر سمسٹر میں چار، چار پرچے ہیں۔سب ہی پرچوں میں چار بلاک ہیں ،جنہیں سولہ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے تحت موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آپ تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ہر سمسٹر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طلبا کو چاروں پرچوں کے امتحانات دینے کے علاوہ تفویضات کی تکمیل بھی لازمی طور پر کرنا ہے، تبھی وہ اس کورس میں کامیاب قرار دیے جائیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم۔اے اردو کے چودھویں پرچے کی یہ کتاب پیش کر رہے ہیں، جس کا عنوان”اردو نظم“ ہے۔طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہو سکے تجویز کردہ کتابوں اور مشاورتی جماعتوں سے بھی بھرپور استفادہ کریں گے۔

پروفیسر نکہت جہاں
کورس کو آرڈی نیٹر

اردو نظم

بلاک I : نظم نگاری کا فن

اکائی 1:   نظم کی تعریف، قسمیں

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید
1.1 مقاصد
1.2 نظم کی تعریف
1.3 نظم کی قسمیں
1.3.1 مستزاد
1.3.2 مسمّط
1.3.3 مثلّث
1.3.4 مربّع
1.3.5 مخمّس
1.3.6 مسدّس
1.3.7 مسبّع
1.3.8 مسمّن
1.3.9 متسّع
1.3.10 معشّر
1.3.11 ترکیب بند
1.3.12 ترجیع بند
1.3.13 ریختی
1.4.14 واسوخت

1.3.15 شہر آشوب
1.3.16 بارہ ماسہ
1.4 اکتسابی نتائج
1.5 کلیدی الفاظ
1.6 نمونہ امتحانی سوالات
1.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

اردو شاعری میں مختلف اصناف رائج ہیں، جن میں ایک اہم صنف نظم بھی ہے۔ نظم ایک بیانیہ صنف ہے، جس میں موضوع اور بیان دونوں اعتبار سے تنوع پایا جاتا ہے۔ اس صنف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو میں غزل جیسی مقبول ترین صنف کے ہوتے ہوئے بھی نظم نے اپنی اہمیت کو منوالیا۔ نظم کے ارتقا کی ایک لمبی تاریخ ہے۔اس صنف کے بڑے شاعر کے طور پر نظیر اکبر آبادی کا نام لیا جاتا ہے۔ انہوں نے ہی اس صنف کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے بعد سر سید تحریک کے زیر اثر حالی اور آزاد نے نظم پر خصوصی توجہ دی اور اس صنف شاعری کو مقبول صنف بنا دیا۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے تحت اس صنف میں بہت سارے موضوعی اور ہیئتی تجربے کیے گئے۔ اس اکائی میں آپ ان ہی تمام باتوں پر تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نظم کی تعریف بیان کرسکیں۔
- نظم کی اہمیت سے واقف ہوسکیں۔
- نظم کی مختلف ہیئتی اقسام پر روشنی ڈال سکیں۔
- نظم کی مختلف موضوعی اقسام پر گفتگو کرسکیں۔

1.2 نظم کی تعریف

نظم شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جو کسی ایک عنوان کے تحت کسی ایک موضوع پر لکھی جاتی ہے۔ نظم کی ایک خاص بات یہ ہے کہ

اس میں ہیئت کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ بحر اور قافیہ سے پابند بھی ہوتی ہے اور ان قیود سے آزاد بھی۔ اس میں مضامین کی وسعت ہوتی ہے۔ نظم زندگی کے کسی بھی موضوع پر کہی جاسکتی ہے۔

نظم عربی زبان کا لفظ ہے، جو فارسی کے توسط سے اردو میں داخل ہوئی۔ نظم کے لغوی معنی پرونا، موتیوں کو تاگے میں پرونا، سلک وغیرہ کے ہیں۔ لغات کشوری میں نظم کے معنی اس طرح درج ہیں۔

"پرونا موتیوں کا دھاگے میں، مجازاً کلام موزوں، شعر، آرائش، آراستہ کرنا۔"

اردو کے زیادہ تر لغات میں یہی معنی درج ہیں اور قدیم اردو شعرا نے بھی اسے انہیں معنوں میں برتا ہے۔ میر حسن "تذکرہ شعرائے اردو" میں سودا کے بارے میں لکھتے ہیں: نظمش طرب انگیز است"۔ میر کے بارے میں لکھتے ہیں۔"ساخت نظمش گلشن ہارا۔" مرزا غالب نظم سے جملہ شاعری مراد لیتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:"سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔"

ان کے علاوہ جامع اللغات میں نظم کے معنی اس طرح درج ہیں:"شعر، کلام موزوں، چند شعروں کا مجموعہ جو ایک ہی مضمون ہو۔" جامع اللغات کے آخری الفاظ (چند اشعار کا مجموعہ جو ایک ہی مضمون پر ہو) سے دور جدید کی اس نظم کا تصور ابھرتا ہے، جو مغربی اثرات سے وجود میں آکر ایک صنف کی حیثیت سے پروان چڑھی۔ چند اشعار ایک موضوع پر ہونے کا مطلب تسلسل و ربط ہے، یعنی تمام اشعار آپس میں منسلک ہوں اور تمام اشعار مل کر موضوع یا خیال کو مکمل کریں۔ لیکن تسلسل بیان سے یہ ابہام پیدا ہوتا ہے کہ غزل کو چھوڑ کر تمام اقسام شعر یعنی قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ترکیب بند، ترجیع بند اور مسمط کی آٹھوں شکلیں سب میں تسلسل بیان ہوتا ہے تو اب صنف نظم کی شناخت کیسے ہو، جب کہ صنف نظم کے لیے کوئی ہیئت بھی متعین نہیں ہے۔ جیسے کہ غزل کی ہیئت متعین ہے کہ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں گے۔ تمام ثانی مصرعے ہم قافیہ ہوں گے۔ آخری شعر یعنی مقطع میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرے گا۔ اس کا ہر شعر خود میں معنی کے لحاظ سے مکمل ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس میں تسلسل بیان نہیں ہوگا۔ یا مثنوی کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں گے اور ہر شعر کا قافیہ بدل جائے گا، لیکن نظم کے لیے ایسی کوئی ہیئت نہیں ہے۔ نظم ہمیشہ غزل، مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، متسع، معشر، ترکیب بند، ترجیع بند، عادی اور آزاد ہیئتوں میں لکھی جاتی رہی ہے۔

اس کے علاوہ قصیدہ، مرثیہ، واسوخت اور شہر آشوب کی طرح نظم کا کوئی موضوع بھی متعین نہیں ہے۔ قدیم و جدید نظم کے سرمائے پر نظر ڈالیں تو یہ مناظر قدرت، پرندوں، تہواروں، موسموں، تاریخی واقعات، اخلاقی و مذہبی موضوعات، حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ، قومی، معاشی و سیاسی مسائل، فلسفیانہ رموز و نکات، غرض زندگی و کائنات کے تمام موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے نظر آتی ہے۔ لیکن نظم، غزل و مثنوی کی ہیئت میں لکھے جانے کے باوجود نہ غزل ہے، نہ مثنوی اور نہ قصیدہ۔ بلکہ یہ اپنے آپ میں ایک صنف شعر ہے، جسے ہم نظم کہتے ہیں، جس کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اس کی شناخت کا دارومدار اس کے موضوع، تسلسل خیال اور مرکزی فکر پر ہے۔ اس تعلق سے شمیم احمد لکھتے ہیں:

"معنوی اعتبار سے "نظم" ایک نہایت بسیط، وسیع اور ہمہ گیر اصطلاح ہے۔ یہاں تک کہ اگر اصناف سخن میں سے غزل کو منہا کر دیا جائے تو دیگر تمام اصناف سخن مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، اور شہر آشوب، در حقیقت نظم ہی کے مختلف موضوعات واسالیب قرار پائیں گے، یعنی ہر وہ شعری تخلیق جو خیال کی ریزہ کاری پر نہیں خیال و فکر کی شیرازہ بندی، تسلسل خیال اور ربط پر مبنی ہے وہ وسیع تر معنوں میں نظم ہے، لیکن نظم سے یہاں ہماری مراد نہ قصیدہ ہے، نہ مرثیہ، نہ مثنوی، نہ شہر آشوب، نہ واسوخت بلکہ وہ صنف ہے جسے ہم "نظم" ہی کہتے ہیں۔"

(شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، انڈیا بک امپوریم، بھوپال، 1981، ص100)

نظم میں موضوع ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط ہوتے ہیں۔ نظم میں جو بنیادی موضوع ہے اس کے ارد گرد سارا تانا بانا بنا جاتا ہے اور اس کے ذریعے ایک بنیادی تاثر قائم کیا جاتا ہے۔ اس کا واقعاتی بیان اور رنگا رنگی اس کی شناخت میں معاون ہوتی ہے۔ کلیم الدین احمد کے خیال میں اچھی نظم کا معیار یہ ہے کہ شعریت کو اس کے شعروں میں ہی نہیں لینا چاہیے بلکہ وہ پوری نظم میں جاری ہو اور یوں جاری وساری ہو کہ کسی مخصوص شعر کو نظم سے الگ کرنا ممکن نہ ہو۔

کلیم الدین احمد کا یہ بھی خیال ہے کہ ہر نظم مبسوط اور طوالانی نہیں ہوتی، ربط تسلسل البتہ شرط ہے۔ ورنہ نظم مختصر بھی ہو سکتی اور ہوتی ہے۔ (کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، 1966، ص5-6)

1.3 نظم کی قسمیں

اردو ادب کی دو اصناف ہیں۔ اردو نثر اور اردو نظم یعنی اردو شاعری۔ پھر اردو شاعری کی بھی بہت سی اصناف ہیں۔ مثلاً حمد، نعت، منقبت، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ ان ہی میں سے ایک صنف "نظم" بھی ہے۔ نظم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ کچھ ہیئت کے لحاظ سے، کچھ مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے اور کچھ موضوع کے اعتبار سے۔ ہیئت کے لحاظ سے نظم کی جو قسمیں ہیں وہ اس طرح ہیں: پابند نظم، آزاد نظم، معریٰ نظم، نثری نظم، نظم ثلاثی، گیت، دوہا، ماہیہ، سانیٹ، ترائیلے، ہائیکو، چار بیت وغیرہ۔ ان اقسام کے بارے میں آپ اسی بلاک کی چوتھی اکائی میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ اس اکائی میں آپ مصرعوں کی تعداد اشعار کے لحاظ سے اور موضوعی اعتبار سے نظم کی قسموں کا مطالعہ کریں گے۔ ان قسام میں مستزاد، مسمط، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مسمن، متسع، معشر، ترکیب بند، ترجیع بند، ریختی، واسوخت، شہر آشوب اور بارہ ماسہ شامل ہیں۔

1.3.1 مستزاد:

مستزاد نظم کی ایک خاص قسم ہے۔ مستزاد کے لفظی معنی "اضافہ کیا ہوا یا زیادہ" کے ہیں۔ لغات کشوری میں اس کے معنی "زیادہ کیا گیا، ایک قسم شعر کی جس کے ہر مصرعے کے آخر میں ایک کلمہ وزن میں زیادہ لایا جاتا ہے" درج ہے۔ یہ اضافہ مستزاد نظم میں اس طرح ہوتا ہے کہ کسی مصرعے یا شعر کے آخر میں کچھ موزوں فقرے جوڑ دیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک اہم بات یہ ہے کہ مستزاد کے لیے کوئی

خاص بحر نہیں ہوتی بلکہ یہ کسی بھی بحر میں ہو سکتا ہے۔اضافہ کیے گئے جملے غزل یا نظم کے قافیوں کے ہم قافیہ بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف قافیے میں بھی ہو سکتے ہیں۔عام طور سے کسی مصرعے یا شعر پر ایک یا دو مصرعوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔اس طرح کی نظموں کو مستزاد کہتے ہیں۔مستزاد کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

میں ہوں عاشق مجھے غم کھانے سے انکار نہیں   کہ ہے غم میری غذا

تو ہے معشوق تجھے غم سے سروکار نہیں   کھائے غم تیری بلا

(بہادر شاہ ظفر)

اسی طرح ہم قافیہ مستزاد کی مثال دیکھیے:

تاریک افق کے ماتھے سے صدیوں کی سیاسی چھوٹ گئی

ظلمات کا سینہ چاک ہوا، لو سانس کی بھی ٹوٹ گئی   لو صبح کی پو بھی پھوٹ گئی

مستزاد اپنے آپ میں نہ تو کوئی باقاعدہ صنف ہے اور نہ ہی کوئی مستقل ہیئت۔ نظم کی پہلے سے موجود ہیئتوں پر محض چند جملوں کا اضافہ ہے۔انشااللہ خاں انشانے تو پانچ پانچ جملوں کا اضافہ کیا ہے۔ایک مثال دیکھیے:

میں پھاند کر دیوار جو کل رات نہ جاتی   کنڈی نہ ہلاتی / جا کر نہ جگاتی / نیند اس کو نہ آتی / جوبن کی دہ ماتی / تیوری نہ ہلاتی

اور چٹکیوں میں میرے تئیں صبح اراتی   ہاتھوں کو نچاتی / گاتی نہ بجاتی / کھانے کو نہ کھاتی / آنکھیں نہ ملاتی / سو سو حیلے بناتی

خیال رہے کہ شاعروں کو نت نئے تجربوں کا شوق ہوتا ہے، لہٰذا مستزاد بھی اسی شوق کا نتیجہ ہے۔اس سے زیادہ نظم کی اس قسم کی اور کوئی اہمیت نہیں ہے۔

1.3.2 مسمّط:

مسمط عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادّہ تسمیط اور معنی "لڑی میں پروئے ہوئے موتی" ہے۔آئینہ بلاغت میں اس کا مطلب "ایسی نظم جو کئی بندوں پر مشتمل ہو خواہ بصورت مربع، مخمس، مسدس، مسمن وغیرہ جس میں ہر ہر بند کے مصرعے سوائے آخر کے ہم قافیہ ہوں اور تمام بندوں کے آخری مصرعے کے پہلے بند کے مصرعِ آخر کے تابع ہوں" درج ہے۔

اصطلاح شعر کے مطابق اس کا مفہوم ایسی نظم سے ہے جو بہ لحاظ ہیئت مختلف بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان سب کو ملا کر "مسمط" کہتے ہیں۔ مسمط کی کسی ہیئت میں کہی گئی نظم کے پہلے بند کے تمام مصرعے باہم قافیہ ہوتے ہیں۔ بعد کے تمام بندوں کے مصرعے، آخری مصرعے کو چھوڑ کر الگ الگ قافیوں میں باندھے جاتے ہیں۔ ہر بند کا آخری مصرعہ پہلے بند کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ پوری نظم میں یہی اصول اختیار کیا جاتا ہے۔ مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے مسمط کی آٹھ قسمیں قرار پاتی ہیں:

1. تین مصرعوں کا بند — مثلّث
2. چار مصرعوں کا بند — مربّع
3. پانچ مصرعوں کا بند — مخمّس
4. چھ مصرعوں کا بند — مسدّس
5. سات مصرعوں کا بند — مسبّع
6. آٹھ مصرعوں کا بند — مثمّن
7. نو مصرعوں کا بند — متسّع
8. دس مصرعوں کا بند — معشّر

ذیل میں ان آٹھوں اقسام پر الگ الگ مع مثال گفتگو کی جا رہی ہے۔

1.3.3 مثلّث:

مثلّث عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی تین کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں تین مصرعوں والی نظم کو "مثلّث" کہتے ہیں۔ اس کے پہلے بند کے پہلے تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ بعد کے ہر بند کے دو مصرعے کسی اور قافیے میں ہوتے ہیں، لیکن تیسرا مصرعہ پہلے بند کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

شفق کی چھاؤں میں چرواہا جب بندی بجاتا ہے
تصور میں مرے ماضی کے نقشے کھینچ لاتا ہے
نظر میں ایک بھولا بسرا عالم لہلہاتا ہے

مرے افکار طفلی کو ہے نسبت اس کے نغموں سے
میں بچپن میں کیا کرتا تھا الفت اس کے نغموں سے
جبھی بنسی کی لے میں عہد طفلی جھلملاتا ہے

(اختر شیرانی)

دریا سے ہٹ کے سامنے چھوٹا سا ایک گاؤں
پگڈنڈیوں سے دور، وہاں پیپل کی چھاؤں
یہ دھندلی سی صورتیں، یہ میلے میلے پاؤں
(سلام مچھلی شہری)

1.3.4 مربّع:

چار مصرعوں پر مشتمل شاعری کو مربع کہتے ہیں۔ تنقیدی اصطلاحات میں لکھا ہے کہ مربع اس نظم کو کہتے ہیں جو چار چار مصرعوں کے بندوں کی شکل میں لکھا جائے۔ اس کے پہلے بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ بعد میں آنے والے ہر بند کے پہلے تین مصرعے الگ قافیہ رکھتے ہیں یعنی آپس میں متحد القوافی ہوتے ہیں اور چوتھا مصرعہ بند اول کے ساتھ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

تخریب کے جادہ سے گزرنا نہیں ہرگز خطرات کے طوفان سے ڈرنا نہیں ہرگز

منزل کی طرف بڑھ کے ٹھہرنا نہیں ہرگز بے نام کیے دہر میں مرنا نہیں ہرگز

(رابعہ سلطانہ، ناشادؔ)

دوسری مثال:

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ بجے گا محبت کا نقار خانہ

حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ کروصبر آتا ہے اچھا زمانہ

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن

رکے گا نہ علام ترقی کیے بن کروصبر آتا ہے اچھا زمانہ

پہلی مثال میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہیں، لیکن دوسری مثال میں پہلے بند کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہیں اور دوسرے بند میں تین مصرعے الگ قافیہ میں ہیں اور چوتھا مصرعہ پہلے بند کے ساتھ ہم قافیہ ہے۔ یہ دونوں قسمیں مربع کی مثالیں ہیں۔

مربع میں بھی چار مصرعے ہوتے ہیں اور رباعی میں بھی، لیکن دونوں میں کچھ نمایاں فرق ہے۔ مثلاً پہلا فرق یہ ہے کہ رباعی میں تیسرے اور مربع میں چوتھے مصرعے کا قافیہ الگ ہوتا ہے۔ مربع کے پہلے بند کے چاروں مصرعے بالعموم ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ رباعی کے برخلاف مربع کے لیے کوئی مخصوص بحر نہیں ہوتی۔ یہاں پر رباعی کی بھی ایک مثال ملاحظہ ہو:

کچھ بھی نہیں چاہتے وہ چندے کے سوا　　اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا
گلچیں ہے ہر اک نہیں ہے بلبل کوئی　　ان نکتہ کو کون سمجھے بندے کے سوا

1.3.5 مخمّس:

مخمس بھی عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی پانچ کے ہوتے ہیں۔ شعری اصطلاح میں مخمس اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔اس کی بھی بنیادی مسمطی شکل وہی ہے جو دوسری اقسام مسمط کی ہے، لیکن اس میں قافیوں کی ترتیب کہیں زیادہ اور متنوع قسم کی ہوتی ہیں، نظری احمد کی زیادہ تر نظمیں مخمس کی شکل میں ہیں۔ مخمس کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ پہلی قسم میں پہلے بند کے پانچوں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف یا صرف ہم ردیف ہوتے ہیں۔اس کے بعد ہر بند کے پہلے چار مصرعے آپس میں ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اور پانچواں مصرعہ پہلے بند کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔:پہلی قسم کی مثال ملاحظہ ہو:

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی　　کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی　　بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی

یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہیے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں　　تعظیم جس کی کرتے ہیں تو اب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقماں کیا ہے یاں　　عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں

حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

(نظیر اکبر آبادی)

دوسری قسم میں ایک بند کے پہلے تین مصرعے آپس میں ہم قافیہ وہم ردیف یا صرف ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر بند کا چوتھا اور پانچواں مصرعہ باہم ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔اس کی بھی ایک مثال دیکھیے:

موسم کی پابند نہیں ہیں قدرت کے گلزار
چلتی ہیں ہر سمت ہوائیں مستی میں سرشار
کانٹے جن پر وارے جائیں لاکھوسر و چنار
نقاش فطرت کے آگے کیا ہے دستِ مانی
لہراتا، بل کھاتا، بڑھتا، جھل جھل کرتا پانی

1.3.6 مسدّس:

مسدس عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی چھ (6) کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں مسدس اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں چھے مصرعے ہوتے ہیں۔ مسدس کے ہر بند کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور آخری دو مصرعے اپنا الگ قافیہ رکھتے ہیں۔ مسمط کی تمام ہیئتوں میں اس ہیئت کو سب سے زیادہ عزت و مقبولیت ملی۔ رزمیہ شاعری کے ضمن میں اس ہیئت کے مروج یا مستعمل ہونے میں اس کی ہیئتی توانائی معاون ہوتی ہے۔ مسدس میں موضوع اور بندوں کی تعداد کی پابندی نہیں ہوتی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم "مسدس مد و جزر اسلام" اسی ہیئت میں ہے، جو اردو ادب میں مسدس حالی کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کی شہرہ آفاق نظم "شکوہ اور جواب شکوہ" بھی مسدس کی ہیئت میں ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر کربلائی اور شخصی مرثیے اسی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔ حامد اللہ افسر میرٹھی نے لکھا ہے کہ "اعداد میں جس قدر اصناف رائج ہیں ان میں سے کسی میں مضامین عالیہ کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود نہیں ہے جتنا مسدس میں ہے۔" لہٰذا مسدس اردو نظم کی سب سے کامیاب قسم ہے۔ مسدس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

(مولانا حالی)

موسم گل ہے، چمن ہے اور بھری برسات ہے　　تختہ سنبل کے نیچے اک اندھیری رات ہے
جلوہ ہر ایک ذرّہ سے خدا کی ذات ہے　　چشم دل محوِ جمالِ حسنِ موضوعات ہے

پھول کا ہر صفحہ کیاہے، وادی تجرید ہے
غنچہ سر بستہ اک عالم توحید ہے

1.3.7 مسبّع:

مسبع کے معنی "سات" کے ہیں، یعنی جس نظم کے ہر بند میں سات مصرعے ہوں اس کو "مسبع" نظم کہتے ہیں۔ اس قسم کی نظم میں قافیے کا وہی التزام برقرار رکھا جاتا ہے جو اس سے پہلے کی قسموں کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ یوں کبھی کبھی ساتواں یا چھٹا اور ساتواں دونوں مصرعوں کے قوافی بدل دیے جاتے ہیں اور یہی التزام باقی سبھی بندوں میں قائم رکھے جاتے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

اب تم میرے پاس آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعت مہر ہو ،فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشہ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کیے کی سزا پائی ہے

(اسرار الحق مجاز)

محبوب سے تو چھا گل ، ٹھہرے تو ہلچل، راہوں میں اک کھلبلی
گرتے گھروندے، اٹھتی امنگیں، ہاتھوں میں گاگر بھری
کانوں میں بالے، چاندی کے ہالے،پلکیں گھنی گھردری
ہڈی پہ چہرے، پہروں پہ آنکھیں ،آئی جوانی چلی
ٹیلوں پر جوبن، ریوڑ کے ریوڑ،کھیتوں پہ جھالر چڑھی
وادی میں بھیگے، روڑوں کی پٹی، چشموں کی چمپا کلی
سانچے نئے اور باتیں پرانی،مٹی کی جادو گری

(محبوب خزاںؔ)

1.3.8 مسمّن:

مسمّن کے معنی "آٹھ" کے ہیں،یعنی جس نظم کے ہر بند میں آٹھ مصرعے ہوں اس کو "مسمّن" نظم کہتے ہیں۔ مسمّن کے لیے اس کے پہلے بند کے تمام مصرعوں کا ہم قافیہ وہم ردیف ہونا ضروری ہے۔پہلے بند کے بعد ہر بند کے پہلے چھ یا سات مصرعے الگ قافیہ میں ہوتے ہیں اور آخر کے ایک یا دو مصرعوں میں پہلے بند کے قافیہ کی رعایت ہوتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم "عاشق نامہ" مسمن کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔مثال کے لیے اس نظم کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان
ہر باغ میں، ہر دشت میں ، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں ،بار نگ میں ، نیر نگ میں پہچان
منزل میں ، مقامات میں، فر سنگ میں پہچان
نِت روم میں ، اور ہند میں اور زنگ میں پہچان
ہر راہ میں، ہر ساتھ میں، ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں، ہر آہنگ میں پہچان
ہر دھوم میں، ہر صُلح میں، ہر جنگ میں پہچان

(نظیر اکبر آبادی)

1.3.9 متسّع:

"متسّع" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی نو(9) کے ہیں۔ شعری اصلاح میں جس نظم کے ہر بند میں نو مصرعے ہوتے ہیں اس کو متسّع کہتے ہیں۔ اس قسم کی نظم میں پہلے بند کے تمام مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔ بعد کے بندوں میں ابتدائی آٹھ مصرعے کے قافیے ایک جیسے ہوتے ہیں اور آخر مصرعے کا قافیہ پہلے بند کے قافیے پر ہوتا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

مرے وطن کی سر زمیں جمیل و دلکش و حسیں
مرے وطن کا آسماں عظیم و عزم آفریں
یہ پر خلوص بستیاں ،فلاح و خیر کی امیں
سکوں پسند و صلح جو بلند ظرف و پاک بیں
یہ زر فروش کھیتیاں ستارہ خیز و خور جبیں
شگوفہ باز و گل چکاں نظر نواز نازنیں
رواں دواں ہے چار سو فضامیں روح انگبیں
مذاقِ دید چاہیے تجلیاں کہاں نہیں
مراوطن مراوطن حیات و کائنات میں

(طپش صدیقی)

1.3.10 معشّر:

"معشّر" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی دس(10) کے ہیں۔ شعری اصلاح میں جس نظم کے ہر بند میں دس مصرعے ہوتے ہیں اس کو معشّر کہتے ہیں۔ اس قسم کی نظم میں پہلے بند کے تمام مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ بعد کے بندوں میں ابتدائی نو مصرعوں کے قافیے ایک جیسے ہوتے ہیں اور آخر مصرعے کا قافیہ پہلے بند کے قافیے سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

کیا وہ دل بر کوئی نویلا ہے ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے چنبیلی بیلا ہے بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
شہری قصبائی اور گنویلا ہے زر اشرفی ہے پیسا دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے
رنگ ہے ،روپ ہے ،جھمیلا ہے اور بلدیو جی کا میلا ہے

(نظیر اکبر آبادی)

1.3.11 ترکیب بند:

ترکیب بند نظم کی ایک قسم ہے۔ غزل کی طرح اس میں قافیے کا استعمال ہوتا ہے اور مصرعے بھی غزل کی طرح ہوتے ہیں۔ ترکیب بند کے ایک بند میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ اشعار بتائے گئے ہیں۔ ترکیب بند کے لیے بند کی تعداد متعین نہیں ہے، لیکن ایک بند میں جتنے اشعار ہوتے ہیں تمام بندوں میں اشعار کی تعداد اتنے ہی ہوتی ہے۔ یعنی تمام بند اشعار کے لحاظ سے برابر ہوتے ہیں۔ مان لیجیے کہ ایک بند چار اشعار کا ہے تو اس میں تین شعر ہم قافیہ ہوں گے اور چوتھا شعر اسی بحر میں ہوگا مگر اس کا قافیہ بدل جائے گا۔ اس چوتھے شعر کو ٹیپ کا شعر کہتے ہیں۔ اس طرح اس ہیئت کا ایک بند مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام بند تشکیل پاتے ہیں۔ اس میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال نے اپنی نظموں میں ہیئت کے کافی تجربے کیے ہیں۔ ان کی نظم "حضور رسالت مآب" ترکیب بند کی ہیئت میں ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

حضور ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس کے علاوہ مولانا حالی نے مرثیہ غالب" بھی ترکیب بند میں لکھا ہے۔ اس کی بھی ایک مثال ملاحظہ ہو:

کیا کہوں حال دردِ پنہانی   وقت کو تاہ و قصہ طولانی

عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد   دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی

کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال   گوشہ فقرو بزمِ سلطانی

ہے سراسر فریب وہم و گماں   تاج فغفور و تخت خاقانی

بے حقیقت ہے شکل موج سراب   جام جمشید و راح ریحانی

لفظِ مہمل ہے نطق اعرابی   حرف باطل ہے عقل یونانی

ایک دھوکا ہے لحن داودی   اک تماشا ہے حسن کنعانی

نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک   چشمہ خضر کا ہو گر پانی

لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے   گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمہ زندگی میں آب نہیں

1.3.12 ترجیع بند:

ترجیع کے معنی لوٹانے کے ہوتے ہیں۔ ترکیب بند میں ٹیپ کا شعر ہر بند میں نیا ہوتا ہے جب کہ ترجیع بند میں ٹیپ کے شعر کی تکرار ہوتی ہے۔ بعض نظموں میں ٹیپ کے شعر کے بجائے ٹیپ کا مصرعہ ہی بار بار دہرایا جاتا ہے۔ مجاز کی نظم " آوارہ" ترجیع بند کی ایک مثال ہے۔ اس کے ہر بند کے آخر میں " اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں" کی تکرار ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بہ در مارا پھروں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر رکھی ہوئی شمشیر سی

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اسی طرح نظیر اکبر آبادی کی اکثر نظمیں ترجیع بند میں ہیں۔ یہاں پر ان کی نظم "برسات کی بہاریں" کی مثال پیش کی جارہی ہے، جس میں ہر بند کے آخر میں "کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں" کی تکرار ہے۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں　　سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھماوٹ قطرات کی بہاریں　　ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں　　جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں　　گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

1.3.13 ریختی:

ریختی بھی اردو نظم کی ایک قسم ہے۔ اس میں عورتوں کے جذبات کا اظہار خود عورتوں کی زبان میں ہوتا ہے۔ انشا اور رنگین اس صنف کے موجد ہیں۔ آگے چل کر مرزا جان جاناں نے بھی اس کے ذخیرے میں بہت اضافہ کیا۔ ریختی اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ ہے۔ دراصل ریختی مردوں کے ذریعے عورتوں کی مخصوص زبان، محاورے اور روزمرہ میں عورتوں کے باہمی معاملات اور جنسی جذبات کے اظہار پر مبنی شاعری ہے، جو غزل کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ریختی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے گھر میں زناخی آئی کب　　میں نگوڑی بھلا نہائی کب
لڑکی مدت سے گئی ہے وہ روٹھ　　میری اس کی ہوئی صفائی کب

ہر گز آتی نہیں ہے سانچ کو آنچ پیش جاوے گی یہ بڑائی کب
گوندھ کر ہاتھ پاؤں میں رنگینؔ اس نے مہندی مرے لگائی کب

(رنگین)

کیا کسی باغ میں ہے آج بڑی سوتی صبح کیوں مرے سامنے کمبخت نہیں ہوتی صبح

ہر کسی شخص کی امید کی کھیتی ہو ہری بیج ایسا کوئی مالن نہیں کیوں بوتی صبح

اوس پھولوں پہ پڑے تو نہ سمجھیو انشاؔ یہ کسی کے لیے ہے آنسوؤں سے روتی صبح

(انشاؔ)

1.3.14 واسوخت:

واسوخت کا لفظ "واسوختن" سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی "عاشق کا معشوق سے منہ موڑلینا" ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں شاعر وفا کے قصے بیان کرتا ہے۔ محبوب کی بے وفائی اور تغافل کا گلہ وشکوہ کرتا ہے اور رقیب کے ساتھ تعلق پر رنجیدہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خودکسی اور محبوب کی طرف راغب ہونے کی دھمکی بھی دیتا ہے۔ یعنی واسوخت وہ صنف ہے جس میں محبوب کو جلی کٹی سنائی جاتی ہے۔ یہ صنف فارسی سے اردو شاعری میں داخل ہوئی۔ لکھنؤ شہر اس کا مولد قرار پاتا ہے اور میر تقی میر واسوخت کے پہلے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ واسوخت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ایک مدت ہوئی بدنامی و رسوائی ہے بے کسی بے دلی درویشی و تنہائی ہے
صبح جب دی ہے دعا گالی تری کھائی ہے ابتدا سے مری ذلت تجھے خوش آئی ہے

خلق کیا کیا تری بے طوریوں سے کہتی نہیں
میں بھی ناچار ہوں اب منہ میں زباں رہتی نہیں

(میر تقی میر)

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

1.3.15 شہر آشوب:

"شہر آشوب" کے لغوی معنیٰ "بربادی، بگاڑ، فتنہ و فساد" کے ہیں۔ کسی شہر، بستی یا ملک میں رونما ہونے والے فتنہ و فساد یا طوائف الملوکی جیسے حالات سے پیدا ہونے والی مصیبتوں اور مسائل کے ذکر پر مشتمل نظم کو "شہر آشوب" کہتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی ہیئت متعین نہیں۔ یہ مسمط کی کسی بھی ہیئت میں لکھی جا سکتی ہے۔

اردو میں شاہ حاتم کو شہر آشوب کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ حاتم کے معاصر شاکر ناجی نے بھی شہر آشوب کہے ہیں۔ سودا نے بھی اپنے قصیدوں میں شہر آشوب کہے ہیں۔ میر تقی میر نے اپنے شہر آشوب میں لشکر کی ہجو اور سپاہیوں کی مفلسی کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے شعرا نے شہر آشوب کہے ہیں۔

شہر آشوب کے عمومی موضوعات نظموں میں جا بجا ملتے ہیں، لیکن باقاعدہ طور پر بہ حیثیت ایک صنف کے شہر آشوب اب کم ہی لکھے جاتے ہیں۔ جدید دور میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے نئے طرز کے شہر آشوب لکھے ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا کے "مخمس شہر آشوب" کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے، جس میں ناقدریِ زمانہ اور دلی میں بے روزگاری کا گلہ کیا گیا ہے:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول
پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو، لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول

بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

1.3.16 بارہ ماسہ:

بارہ ماسہ نظم کی ایسی قسم ہے جس میں ایک براہن کے بارہ مہینے کی دکھ بھری داستان بیان کی جاتی ہے۔ یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے۔ بارہ ماسہ کو "موتی نظم" بھی کہتے ہیں۔

برہ (ہجر) کی ماری عورت، جس کا شوہر کہیں پردیس چلا گیا ہے، اس کی یادیں اسے تڑپاتی ہیں اور ہر مہینے اس کے دل پر موسم کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اسی کا سلسلہ وار بیان "بارہ ماسہ" کہلاتا ہے۔ سال کے بارہ مہینوں کا بیان "بکرم سمبت" (ہندی کیلنڈر) کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔

اردو کا سب سے مشہور بارہ ماسہ افضل جھنجھانوی کا "بکٹ کہانی" ہے۔ اس کے علاوہ گوہر، جوہر، مداری لال اور قدرت کے نام بھی بارہ ماسہ لکھنے والوں میں اہم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بارہ ماسہ سے اظہار عشق اور تخاطب عورت کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس صنف میں برہ کی

ماری عورتیں اپنی سکھیوں اور سہیلیوں کو بھی اپنا ہمراز بناتی ہیں۔ بیان کے اظہار میں شدت اور جدائی کی تڑپ کی سچائی ہوتی ہے۔ بارہ ماسے کا بارھواں مہینہ اساڑھ ہے، جس میں پیا کو دیکھنے کی خوشی اور اپنے شوق کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس طرح بارہ ماسہ خالص ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا پس منظر رکھنے والی صنف ہے۔ مثال کے طور پر بارہ ماسہ کا ایک بند ملاحظہ ہو:

سنو سکھیو! بکٹ موری کہانی　　　　بھئی ہوں عشق کے غم سوں دیوانی

نہ مجھ کو بھوک دن نہ نیند راتا　　　　برہ کے درد سوں سینہ پراتا

1.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- نظم شاعری کی ایک ایسی قسم ہے جو کسی ایک عنوان کے تحت کسی ایک موضوع پر لکھی جاتی ہے۔ نظم کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہیئت کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ بحر اور قافیہ سے پابند بھی ہوتی ہے اور ان قیود سے آزاد بھی۔ اس میں مضامین کی وسعت ہوتی ہے۔ نظم زندگی کے کسی بھی موضوع پر کہی جاسکتی ہے۔
- اردو ادب کی دو اصناف ہیں۔ اردو نثر اور اردو نظم یعنی اردو شاعری۔ پھر اردو شاعری کی بھی بہت سی اصناف ہیں۔ مثلاً حمد، نعت، منقبت، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ ان ہی میں سے ایک صنف " نظم " بھی ہے۔ نظم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ کچھ ہیئت کے لحاظ سے، کچھ مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے اور کچھ موضوع کے اعتبار سے۔
- مستزاد نظم کی ایک خاص قسم ہے۔ مستزاد کے لفظی معنی "اضافہ کیا ہوا یا زیادہ" کے ہیں۔ لغات کشوری میں اس کے معنی "زیادہ کیا گیا، ایک قسم شعر کی جس کے ہر مصرعے کے آخر میں ایک کلمہ وزن میں زیادہ لایا جاتا ہے" درج ہے۔
- مسمط عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادّہ تسمیط اور معنی "لڑی میں پروئے ہوئے موتی" ہیں۔ آئینہ بلاغت میں مسمط کا مطلب "ایسی نظم جو کئی بندوں پر مشتمل ہو خواہ بصورت مربع، مخمس، مسدس، مسمن وغیرہ جس میں ہر ہر بند کے مصرعے سوائے آخر کے ہم قافیہ ہوں اور تمام بندوں کے آخری مصرعے کے پہلے بند کے مصرعِ آخر کے تابع ہوں" درج ہے۔
- تین مصرعوں پر مشتمل نظم کو "مثلث" کہتے ہیں۔
- چار مصرعوں پر مشتمل نظم کو "مربع" کہتے ہیں۔
- پانچ مصرعوں پر مشتمل نظم کو "مخمس" کہتے ہیں۔
- چھ مصرعوں پر مشتمل نظم کو مسدس" کہتے ہیں۔
- سات مصرعوں پر مشتمل نظم کو "مسبع" کہتے ہیں۔

- آٹھ مصرعوں پر مشتمل نظم کو "مسمن" کہتے ہیں۔
- نو مصرعوں پر مشتمل نظم کو "متسع" کہتے ہیں۔
- دس مصرعوں پر مشتمل نظم کو "معشر" کہتے ہیں۔
- ترکیب بند نظم کی ایک قسم ہے۔ غزل کی طرح اس میں قافیے کا استعمال ہوتا ہے اور مصرعے بھی غزل کی طرح ہوتے ہیں۔ ترکیب بند کے ایک بند میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ اشعار بتائے گئے ہیں۔
- ترکیب بند کے لیے بند کی تعداد متعین نہیں ہے، لیکن ایک بند میں جتنے اشعار ہوتے ہیں تمام بندوں میں اشعار کی تعداد اتنے ہی ہوتی ہے، یعنی تمام بند اشعار کے لحاظ سے برابر ہوتے ہیں۔
- ترجیع کے معنی لوٹانے کے ہوتے ہیں۔ ترکیب بند میں ٹیپ کا شعر ہر بند میں نیا ہوتا ہے جب کہ ترجیع بند میں ٹیپ کے شعر کی تکرار ہوتی ہے۔ بعض نظموں میں ٹیپ کے شعر کے بجائے ٹیپ کا مصرعہ ہی بار بار دہرایا جاتا ہے۔
- ریختی بھی اردو نظم کی ایک قسم ہے۔ اس میں عورتوں کے جذبات کا اظہار خود عورتوں کی زبان میں ہوتا ہے۔ انشا اور رنگین اس صنف کے موجد ہیں۔
- واسوخت کا لفظ "واسوختن" سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی "عاشق کا معشوق سے منہ موڑ لینا" ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں شاعر وفا کے قصے بیان کرتا ہے۔ محبوب کی بے وفائی اور تغافل کا گلہ و شکوہ کرتا ہے اور رقیب کے ساتھ تعلق پر رنجیدہ ہوتا ہے
- "شہر آشوب" کے لغوی معنیٰ "بربادی، بگاڑ، فتنہ وفساد" کے ہیں۔ کسی شہر، بستی یا ملک میں رونما ہونے والے فتنہ وفساد یا طوائف الملوکی جیسے حالات سے پیدا ہونے والی مصیبتوں اور مسائل کے ذکر پر مشتمل نظم کو "شہر آشوب" کہتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی ہیئت متعین نہیں ہے۔ یہ مسمط کی کسی بھی ہیئت میں لکھی جاسکتی ہے۔
- بارہ ماسہ نظم کی ایسی قسم ہے جس میں ایک براہن کے بارہ مہینے کی دکھ بھری داستان بیان کی جاتی ہے۔ یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے۔ بارہ ماسہ کو "موتی نظم" بھی کہتے ہیں۔

1.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مستزاد	:	اضافہ کیا ہوا، زیادہ
مسمّط	:	لڑی میں پروئے ہوئے موتی
مثلّث	:	تین مصرعوں پر مشتمل نظم
مربّع	:	چار مصرعوں پر مشتمل نظم

مخمّس	:	پانچ مصرعوں پر مشتمل نظم
مسدّس	:	چھ مصرعوں پر مشتمل نظم
مسبّع	:	ساتھ مصرعوں پر مشتمل نظم
مسمّن	:	آٹھ مصرعوں پر مشتمل نظم
متسّع	:	نو مصرعوں پر مشتمل نظم
معشّر	:	دس مصرعوں پر مشتمل نظم

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. نظم کے لغوی معنی کیا ہیں؟
2. مستزاد کے کیا معنی ہیں؟
3. مربع میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟
4. پانچ مصرعوں والی نظم کو کیا کہتے ہیں؟
5. معشّر کے معنی کیا ہیں؟
6. مسمّن میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟
7. مخمس کی کتنی قسمیں بتائی گئی ہیں؟
8. ترجیع کے معنی کیا ہیں؟
9. واسوخت کا پہلا شاعر کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟
10. بارہ ماسہ کا دوسرا نام کیا ہے؟

1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. نظم کی تعریف بیان کیجیے۔
2. مستزاد کی تعریف مثال کے ساتھ پیش کیجیے۔
3. معشر کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کی ایک مثال بھی پیش کیجیے۔
4. ریختی کی تعریف بیان کرتے ہوئے مثالوں سے واضح کیجیے۔
5. شہر آشوب میں کس طرح کا موضوع نظم کیا جاتا ہے؟ بیان کیجیے۔

1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اردو نظم کی مختلف قسموں پر مضمون قلم بند کیجیے۔
2. واسوخت اور بارہ ماسہ کی تعریف بیان کیجیے نیز مثالیں بھی پیش کیجیے۔
3. ترکیب بند اور ترجیع بند کے فرق کو مثالوں کے ساتھ واضح کیجیے۔

1.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اردو نظم اور اس کی قسمیں	ساحل احمد
2. ادبی اصناف	گیان چند جین
3. نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا
4. اردو شاعری کا فنی ارتقا	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
5. جدید اردو نظم: نظریہ اور عمل	عقیل احمد صدیقی

اکائی 2: اردو نظم کی روایت

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 اردو نظم کی روایت

2.2.1 اردو نظم کا دکنی دور

2.2.2 اردو نظم کا ابتدائی دور شمالی ہند میں

2.2.3 نظیر اکبر آبادی

2.2.4 1857 کے بعد نظم

2.2.5 انجمنِ پنجاب اور نظم

2.2.6 انجمنِ پنجاب سے باہر نظم

2.2.7 ترقی پسند تحریک اور اردو نظم

2.2.8 حلقۂ ارباب ذوق

2.2.9 اردو نظم آزادی کے بعد

2.3 اکتسابی نتائج

2.4 کلیدی الفاظ

2.5 نمونۂ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

اردو اصنافِ شعر میں، نظم کو ایک خصوصی حیثیت حاصل ہے جب کہ غزل اردو کی مقبول ترین صنف ہے۔ مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ کو بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ ہماری مروجّہ، متداول اور روایتی اصنافِ سخن ہیں۔ قدیم شعری سرمائے میں بھی ایسی نظموں کی خاصی تعداد ہے جو مختلف ہیئتوں میں ایک ہی موضوع اور کسی ایک خاص عنوان کے تحت لکھی گئیں اور محض ہیئت کی بنیاد پر کبھی ان کو مثنوی کہا گیا، کبھی قصیدہ اور کبھی مسدّس۔ تاہم اس نوع کی نظموں کی مقبولیت کے اپنے اپنے جواز تھے۔ نظم میں کسی ایک موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ نظم میں موضوعات ایک سے زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ ارتقائے خیال بھی نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں یہ ارتقا واضح ہوتا ہے، مختصر نظموں میں یہ ارتقا واضح نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔

اردو شاعری میں موضوعاتی نظمیں محمد حسین آزاد سے قبل بھی موجود تھیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ماضی میں نظم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جو اس وقت کے مختلف اصناف میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ اردو نظم کے سلسلے میں ہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ مغربی شاعری اور نظم نگاری سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ اردو شاعری کی قدیم روایت سے بھی گہرا رہا ہے۔ اس لیے اردو شاعری کی قدیم روایت کے وہ حصے خاصے اہمیت کے حامل ہیں جو نظم کو جدید صورت میں تشکیل دینے میں مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- اردو نظم کے دکنی دور پر تبصرہ کرسکیں۔
- اردو نظم کے ارتقا میں نظیر اکبر آبادی کی اہمیت کو بیان کرسکیں۔
- 1857 کے بعد اردو نظم کی صورت حال کو بیان کرسکیں۔
- انجمنِ پنجاب اور اس سے باہر نظم کی صورت حال پر گفتگو کرسکیں۔
- ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو نظم کا جائزہ لے سکیں۔
- حلقۂ ارباب ذوق میں نظم کی روایت کا جائزہ لے سکیں۔
- آزادی کے بعد اردو نظم کی صورت حال پر گفتگو کرسکیں۔

2.2 اردو نظم کی روایت

2.2.1 اردو نظم کا دکنی دور:

اردو نظم کا پہلا گہوارہ سر زمین دکن ہے۔ اس کی ابتدا نویں صدی ہجری میں ہوئی ہے۔ دکنی شاعری کا دور چودھویں صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ ادبی و شعری نقطہ نظر سے یہ دور خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کے مشہور شاعر نظامیؔ، اشرف بیابانی، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی، رستمی، ابن نشاطی، نصرتی، ہاشمی وغیرہ ہیں۔

حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ دکن کے مشہور صوفی گزرے ہیں۔ انہوں نے عربی اور فارسی میں کچھ رسالے لکھے تھے۔ اس کے علاوہ دکنی میں کچھ نظمیں بھی کہی تھیں۔ ان کی نظم 'چکی نامہ' کا ذکر خوب ہوتا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے چکی کے گیت کی صورت میں عورتوں کو مذہبی حقائق یاد دلائے ہیں۔ فنّی لحاظ سے یہ ایک معمولی نظم ہے۔ لیکن اس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ پہلا صاحبِ دیوان شاعر گذرا ہے۔ اُس کی نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان میں موسموں' تہواروں' عمارتوں اور قلی قطب شاہ کی محبوباؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہندوستانی پھولوں' پھلوں' چرندوپرند' رسم و رواج کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ شوخ' سانولیوں' پریم پیاریوں کے پریم کی باتیں اور گھاتیں بیان کرنا اس شاعر کا محبوب مشغلہ ہے۔ دکن کی سر زمین اور ماحول کی ساری رعنائیاں اور دل فریبیاں اس کی نظموں میں سموئی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ نظمیں صحیح معنوں میں ہندوستانی تہذیب کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہ ساری باتیں اور یہی جذبات قلی قطب شاہ کی نظموں میں نمایاں طور سے ملتے ہیں۔ قلی قطب شاہ کی نظموں میں موضوع کا ربط تو ملتا ہے لیکن منطقی ارتقا اور تعمیر کی کمی صاف جھلکتی ہے۔ اس کی نظموں میں گیرائی اور گہرائی نہیں ملتی تاہم یہ نظم نگاری کی ابتدائی کوششوں میں سے ہیں۔ اس لیے ان کی اہمیت اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔

قدیم دکنی دور میں چند اور شعرا کا نام لیا جاسکتا ہے جنہوں نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے علاوہ کچھ نظمیں بھی لکھیں۔ ان میں برہان الدین جانم اور علی عادل شاہ ثانی شاہی قابل ذکر ہیں۔

2.2.2 اردو نظم کا ابتدائی دور شمالی ہند میں :

شمالی ہند میں افضل جھنجھانوی اور جعفر زٹلی کے یہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے مل جاتے ہیں۔ افضل جھنجھانوی کی "بکٹ کہانی" میں 1325 اشعار ہیں۔ یہ ایک منظوم افسانہ ہے جو بارہ ماسے کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس نظم میں افضل نے ایک پتی ورتا عورت کے جذبات و کیفیات کی مکمل تصویر کشی کرنے کی سعی کی ہے۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ میر حسن نے اسے شمالی ہند کی نمائندہ اور قابل قدر تصنیف قرار دیا ہے۔ محمود شیرانی تو اسے اردو نظم کی اہم کڑی شمار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ناقدین اور تذکرہ نگاروں نے بھی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

جعفر زٹلی نے ہجو یہ نظموں پر خاص توجہ دی' ان کی نظموں میں عریانی ' فحاشی ' تلذذ اور خیالات کی سطحیت ملتی ہے۔ ان کی زبان

میں بھی ناہمواری پائی جاتی ہے۔ جعفر زٹلی سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ اس لیے اپنی نظموں میں انہوں نے خارجی حقائق کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ ان کی نظم ''انقلاب زمانہ'' نہایت مشہور ہوئی۔

دلّی میں ولیؔ کے دیوان کی آمد کے بعد جن شعرا نے اردو شاعری کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا' ان میں فائز' حاتم' آبرو' مظہر جان جاناں' خان آرزو' وغیرہ اہم ہیں۔ فائز کا شمار اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں غزل کے علاوہ مختلف موضوعات پر مسلسل نظمیں بھی ملتی ہیں جو خاصی تعداد میں ہیں۔ فائز نے اپنی نظموں میں قدیم زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ان کی یہ تمام خوبیاں اپنے عہد کے شاعروں میں انہیں ممتاز و منفرد بناتی ہیں۔

حاتم بھی نظم گو شعرا کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی مسلسل نظموں کے بہت سارے نمونے ملتے ہیں۔ روبہ زوال معاشرے پر حاتم کی بڑی گہری نظر تھی۔ انہوں نے تباہ و برباد ہوتی ہوئی دہلی کی بڑی عبرت ناک تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے موضوعات کو بخوبی برتا ہے۔ ان کی نظموں میں خیالات کا تسلسل ملتا ہے لیکن موضوع کا ارتقا نہیں ملتا۔ زبان و بیان بھی معمولی درجے کے ہیں۔ شاہ حاتم کے علاوہ فائز، شاکر ناجی وغیرہ کے یہاں بھی نظموں کے نمونے ملتے ہیں۔

2.2.3 نظیر اکبر آبادی:

آگے چل کر میر و سودا کا دور آتا ہے۔ اس دور میں بھی اردو شاعری اپنے ارتقائی منازل سے گزرتی رہی۔ دہلی اور لکھنو میں اردو کے کئی اہم اور نامور شعرا پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ چند ممتاز شعرا کے نام اس طرح ہیں۔ سودا' میر' میر حسن' جرات' انشا' مصحفی' نظیر' درد' اثر' ذوق' مومن' غالب' ناسخ اور آتش وغیرہ۔ اس کے علاوہ مرثیہ گو شعرا جن میں ضمیر' خلیق' انیس اور دبیر وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ دور غزل گوئی کے لیے مشہور ہے۔ نظیر کے علاوہ کسی نے نظم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس لیے نظیر کے علاوہ کسی شاعر کو نظم گو شاعر کا درجہ دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی اس دور کا تنہا ایسا شاعر ہے جس نے روایت سے ہٹ کر شاعری کی اور نظم کو اپنے تجربات و خیالات کا وسیلہ بنایا۔ نظیر کا یہ تجربہ بالکل نادر اور انوکھا تھا۔ انہوں نے خواص کے بجائے عام لوگوں کے لیے شاعری کی۔ نظیر کے مشاہدے میں غیر معمولی گیرائی تھی۔ نظیر اکبر آباد میں رہتے ہوئے بھی ایک باشعور اور حساس فنکار کی طرح سارے ملک کی تقدیر' اس کی زبوں حالی اور ابتری کا نظارہ کر رہے تھے اور تباہی و بربادی کے اس روح فرسا نظارے سے متاثر ہو رہے تھے۔ نظیر نے اپنی اکثر نظموں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مسلسل جنگ' لوٹ مار' قتل عام' آبادیوں اور شہروں کی ویرانی و بربادی' فصلوں کی تباہی' صنعت و حرفت کی بے قدری' بیروزگاری اور ان سب سے پیدا ہونے والی معاشی' معاشرتی دقتیں اور اخلاق سوز واقعات وغیرہ' یہی سارے عوامل تھے جن میں نظیر کی شاعری پروان چڑھتی ہے اور یہی سیاسی و سماجی حالات ان کی مختلف نظموں کے موضوعات بنتے ہیں۔ نظیر کا تنوع اور ان کی معلومات بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہیں۔ آج اردو نظم کافی آگے بڑھ چکی ہے لیکن نظیر کی حیثیت ایک روشن مینار کی سی ہے جو بہت سارے نظم نگاروں کی راہ روشن کر رہا ہے۔

نظیر کا انتقال 1830ء میں ہوتا ہے۔ ان کے بعد کچھ دنوں تک نظم کی دنیا سنسان و خاموش رہتی ہے۔ پھر اردو نظم کی دنیا میں محمد

حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی اہم نظم گو شعرا کی حیثیت سے منظر عام پر آتے ہیں۔ نظیر سے لے کر آزاد تک کا عہد خاص طور سے غزل کا عہد رہا۔ اس زمانے میں مثنوی، مرثیہ اور قصیدے بھی لکھے گئے لیکن نظم پر باقاعدہ توجہ نہیں دی گئی۔

2.2.4 : 1857 کے بعد نظم:

جدید نظم کے اولین علم برداروں میں محمد حسین آزاد کا نام سر فہرست ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ نئی تہذیب اور نئے علوم و فنون کے اثرات سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں، جس سے یہاں کی تہذیب بدل رہی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات نے نظم کا نیا تصور قائم کرنے میں مدد دی۔ کرنل ہالرائیڈ اس وقت پنجاب کے سر رشتہ تعلیم کے منتظم اعلیٰ تھے۔ ان کے مشورے اور لاہور کے اہل علم ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی مدد سے 21 جنوری 1865ء کو محمد حسین آزاد نے 'انجمن پنجاب' قائم کی تاکہ اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے انہیں ایک پلیٹ فارم مل سکے۔ انجمن پنجاب کا قیام ایک تاریخی قدم تھا۔ کرنل ہالرائیڈ اس انجمن کے سرپرست تھے۔ اور انہیں کی صدارت میں 1867 میں پہلی بار جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد حسین آزاد نے "نظم اور کلام موزوں" کے باب میں کافی اہم لکچر دیا۔ اس کے بعد یہاں ماہانہ لکچر ہونے لگے۔ آزاد نے قدیم شاعری کی خامیاں اور جدید نظمیہ شاعری کے محاسن کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی۔ آزاد کے انہیں لکچر زنے لوگوں کے ذہنوں کو جدید نظم کی طرف مائل کیا۔ 75-1874 کے جلسے میں ایک اہم بات یہ ہوئی کہ مصرعہ طرح پر غزلیں پڑھنے کے بجائے مختلف موضوعات پر نظمیں پڑھی گئیں۔

2.2.5 انجمن پنجاب اور نظم:

انجمن پنجاب کا دائرہ اغراض و مقاصد کے اعتبار سے کافی وسیع نظر آتا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کی وجہ سے لوگ کافی ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے کسی بھی اقدام کو خدشے اور بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انجمن کے قیام کا مقصد اس بدگمانی کو دور کرنا بھی تھا۔ شروع میں اس جلسہ میں شریک ہونے والے انگریزی ملازم، امرا اور رؤسا ہوا کرتے تھے۔ لیکن جلد ہی اس میں عام لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اس طرح حکام کی دلچسپی اور سرپرستی سے یہ انجمن کامیابی کی راہ پر چل نکلی۔

جب 30 مئی 1874ء میں انجمن پنجاب نے مصرع طرح کے بجائے ایک مخصوص موضوع پر نظمیں لکھ کر مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی تو لاہور میں ایسے مشاعروں کا سلسلہ چل نکلا۔ ان میں سے اکثر مشاعروں میں مولانا الطاف حسین حالی نے بھی شرکت کی۔ پہلے مشاعرے میں یعنی 19 اپریل 1874 میں محمد حسین آزاد کا لکچر اور مثنوی "شب قدر" پڑھی گئی۔ دوسرے میں یعنی 30 مئی 1874 کو برسات کے موضوع پر نظمیں پڑھی گئیں۔ تیسرے یعنی 30 جون 1874 کو 'زمستان' کے عنوان پر نظمیں ہیں۔ چوتھے یعنی 3 اگست 1874 کو 'امید' کے موضوع پر نظمیں کہی گئیں۔ اس طرح کچھ وقفے کے ساتھ مختلف موضوعات پر گیارہ مشاعرے ہوئے جس میں اکثر شریک ہونے والے شعرائے کرام اس طرح تھے: آزاد، حالی، انور حسین، ذوق کاکوری، اشرف بیگ، قادر بیگ، مضطر دہلوی، راحت دہلوی، مرزا مشرف بیگ دہلوی، فکری دہلوی، امام بخش، کرشن لعل، رفیق، حقیر، محمد سعید اور بہت سارے دوسرے شعرا۔

شروع شروع میں بعض گروہوں کی جانب سے ان مشاعروں کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان پر تنقیدیں کی گئیں۔ بعض اخبارات نے محمد

حسین آزاد کی مخالفت میں تبصرے بھی شائع کیے۔ 1875ء میں مشاعرہ بند ہو گیا۔ لیکن جدید نظم کی جو بنیاد پڑی وہ آہستہ آہستہ مضبوط اور مستحکم ہوتی گئی۔ اس ضمن میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک علاحدہ صنف کی حیثیت سے نظم کو پوری طرح پھلنے پھولنے کے لیے اس دور جدید کا انتظار کرنا پڑا۔ جس نے انیسویں صدی کے وسط میں زندگی کی بنیادوں میں تبدیلی پیدا کر دی''۔

محمد حسین آزاد:

اس مشاعرے میں آزاد نے برسات' زمستان' تہذیب' امید' حب وطن اور قناعت وغیرہ کے موضوعات پر نظمیں پڑھیں۔ آزاد کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے شاعری میں نئی اصناف کا اضافہ کیا اور مثنوی کے دائرے کو مزید وسعت بخشی۔ آزاد کی شاعری نیچرل شاعری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ نظم جدید کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ آزاد اور حالی نے بیشتر نظموں میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے ایسا کرتے ہوئے شعوری یا غیر شعوری طور سے انیس اور نظیر کی شاعری کی توسیع کی ہے لیکن آزاد کی منظر نگاری میں فطری حسن اور سادگی ملتی ہے۔ آزاد نے اپنی شاعری کو روایتی حسن و عشق سے آزاد کرایا اور اردو شاعری کو نئی آب و تاب سے روشناس کیا۔

الطاف حسین حالی:

حالی نے بھی انجمن پنجاب کے مشاعرے میں نشاط امید' برکھارت' حب وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف وغیرہ نظمیں پڑھیں۔ مدو جزر اسلام سرسید کی ایما پر لکھی گئی۔ یہ مسدس مسلمانوں کے ماضی و حال کا آئینہ ہے۔ ان کی دیگر نظموں میں شکوہ ہند' مناجات بیوہ' چپ کی داد وغیرہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی نظموں میں قومی دردمندی کا جذبہ بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔ حالی اپنی نظموں میں شاعر سے زیادہ مصلح نظر آتے ہیں۔

2.2.6 انجمن پنجاب سے باہر نظم:

شبلی نعمانی بنیادی طور پر ناقد تھے لیکن انہوں نے ایک محقق' مورخ اور شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کی۔ انہوں نے چند اہم نظمیں لکھی ہیں۔ وہ اپنی نظم 'صبح امید' میں نادر اور معنی خیز تشبیہوں' استعاروں اور دل پذیر ترکیبوں کے استعمال سے حسن پیدا کرتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے 'صبح امید' کو مسدس حالی پر ترجیح دی ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی، شرر اور اکبر الہ آبادی:

اردو نظم کے ارتقاء میں اسمٰعیل میرٹھی کا نام بھی اہم اور قابل ذکر ہے۔ اسمٰعیل نے تصور اور تخیّل میں موضوع تلاش کرنے کے بجائے اپنے اطراف کا غائر مطالعہ کیا۔ اور روزمرہ زندگی کے واقعات' فطری مناظر' گھریلو اشیا اور پالتو جانوروں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ان پر چھوٹی چھوٹی نظمیں جو اکثر بچوں کے لیے ہیں۔

اردو نظم میں جدید اسلوب اور جدید ہیئت کو رائج کرنے اور اسے فروغ دینے کے لیے باقاعدہ تحریک چلانے کا سہرا عبدالحلیم شرر کے سر ہے۔ انہوں نے مغربی نظموں کے نمونوں کے اتباع میں ایک بے قافیہ نظم لکھنے کی شعوری تحریک چلائی اور فلپانا اور مظلوم ورجینا جیسی غیر مقفیٰ نظم لکھی۔

اکبرالہٰ آبادی کو اردو نظم کے ارتقا میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ انہوں نے طنزومزاح کے اسلوب میں نظم نگاری کے نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ انہوں نے انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا۔ برق کلیسا اور جلوہ دربار دہلی ان کی انفرادی رنگ کی نظمیں ہیں۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی نظموں میں بھی فطرت کی مصوری کے نمونے پیش کیے ہیں۔

شاد عظیم آبادی اور دیگر نظم نگار:

شاد عظیم آبادی نے بھی کچھ اہم نظمیں کہی ہیں۔ یہ سب اصلاحی رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان کی ایک نظم 'یاد عظیم آباد' 1875ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں انہوں نے اپنی محبت قومی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نظم نگاری کے حوالے سے نظم طباطبائی' شوق قدوائی' وحیدالدین سلیم' درگا سہائے سرور جہاں آبادی' نادر کاکوروی' منشی جوالا پرشاد برق' کیفی دہلوی' مہاراجہ کشن پرشاد شاد' پنڈت امرناتھ ساحر وغیرہ شعرا بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن جو اہمیت چکبست اور اقبال کو میسّر ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ چکبست کی قابل ذکر وطنی نظموں وطن' فریاد قوم' ہماراوطن' آوازہ قوم اور خاک ہند میں ہندوستان کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے۔

تلوک چند محروم نے بھی انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا اور کئی انگریزی نظموں کو اردو نظم کے قالب میں ڈھالا۔ موت کا موسم' ایک خاندان کی قبر' ایام غم' سپاہی کا خواب' حسرت پرواز اور ترانہ عشق وغیرہ ان کی ترجمہ کی ہوئی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی شام سرما' شفق شام' تصویر بہار' نورجہاں کا مزار وغیرہ موثر نظمیں ہیں۔

علامہ اقبال:

اردو نظم کے ارتقا میں اقبال کی دین ناقابل فراموش ہے۔ اقبال کے سامنے حالی' نظیر' آزاد' شبلی اور اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں بطور نمونہ موجود تھیں۔ انہوں نے نہ صرف اس سلسلے کو آگے بڑھایا بلکہ اردو میں نظم نگاری کے وقار ومعیار کو بلندی عطا کی۔ اقبال اردو کے اہم مفکر شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے دنیا کے سامنے اپنے مخصوص نظام فکر کو پیش کیا۔ ان کی نظموں میں ربط و تسلسل ہے، فلسفیانہ گہرائی ہے اور ایک مخصوص انداز فکر ہے۔ اقبال کے مخاطب وہ انسان رہے جو حرارت' یقین محکم اور عمل پیہم سے خالی اور جمود اور تعطل کا شکار تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ ان کے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنے کی کوشش کی اور کامیاب زندگی گزارنے کا تصور پیش کیا۔ ان کی کچھ اہم نظمیں خضرراہ' مسجد قرطبہ' ساقی نامہ' ذوق وشوق' والدہ مرحومہ کی یاد میں' شمع وشاعر' ابلیس کی مجلس شوریٰ' ہمالہ' طلوع اسلام' شکوہ' جوابِ شکوہ وغیرہ ہیں۔ ان میں سے اکثر نظمیں فنی خوبیوں کی بلندی پر نظر آتی ہیں۔

جوش ملیح آبادی:

جوش ملیح آبادی کو بھی اردو نظم کے ارتقاء میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے کم و بیش پندرہ شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اقبال کے بعد جوش ہی نظم کے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں شاعر فطرت' شاعر انقلاب اور شاعر شباب کہا جاتا ہے۔ جوش کو الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انہیں فطری' رومانی اور سیاسی نظمیں لکھنے پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہوگا جس پر انہوں نے نظم نہ لکھی ہوگی۔ جوش قوم پرستی' ہندو مسلم اتحاد' حب وطن' جمہوریت' امن اور آزادی خیال کے پجاری ہیں اور ان خیالات کو انہوں نے اپنی نظموں میں بڑے دل چسپ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ شاعری میں 'خاص کر نظم میں' نئے رجحانات کے باوجود اردو نظم کی تاریخ میں جوش ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔

فراق گورکھپوری، اختر شیرانی اور ساغر نظامی:

فراق گورکھپوی کا شمار بھی اردو کے اہم نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خیالات نئے طریقے سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ زندگی کی ناہمواریوں اور داخلی کشمکش کے جذبات مجتمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی آواز میں انکسار ہے۔ زور اور دردمندی کے ساتھ انسانی زندگی پر بھروسہ بھی ملتا ہے۔ فراق آج کے ان ترقی پسندوں میں شمار ہوتے ہیں جو زندگی کے سبھی سنجیدہ مسئلوں کو اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔ رومانی' نیم رومانی اور داخلی رومانی تحریک کے علمبرداروں میں اختر شیرانی اور عظمت اللہ کے نام اہم ہیں۔ نیم رومانی تحریک براہِ راست اقبال سے متاثر ہے۔ اور اس میں جوش اور حفیظ کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے بیشتر شعرا کو شامل کیا جاسکتا ہے اور داخلی تحریک میراجی اور ان کے معاصرین سے لے کر جدید علامت پسند شعراء تک پھیلتی چلی گئی ہے۔

اختر شیرانی کی نظموں کے مطالعہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کا موضوع اسلاف کے کارناموں کا بیاں یا خودی کی فلسفیانہ تشریح نہیں بلکہ کائنات میں عورت کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ ان کی نظموں میں عورت' زندگی کے ایک خاص رخ کی علامت بن کر نمودار ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک عورت صرف حسن اور خیر کا ہی کا سرچشمہ نہیں بلکہ تخلیق اور محبت کا منبع بھی ہے۔

اردو نظم کے ارتقا میں ساغر نظامی کی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ ابتدا میں وہ رومانی نظمیں لکھتے تھے۔ پھر حُب وطن میں محو ہوگئے اور بہت سی حسین اور جوشیلی نظمیں لکھیں۔ دھیرے دھیرے انہوں نے سیاسی رنگ بھی پیدا کر لیا اور آزادی' سماج واد' اور عوام کے حقوق کی باتیں کرنے لگے۔ ساغر نے کئی اہم نظمیں لکھیں جن میں مشعل آزادی اور نہرو نامہ طویل اور اہم ہیں۔

2.2.7 ترقی پسند تحریک اور اردو نظم :

36-1935 میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی۔ کئی اچھے' باصلاحیت اور نوجوان شاعر اس تحریک میں شامل ہوگئے اور کچھ پرانے ادیب بھی اس کی حمایت کرنے لگے۔ اچھے شعرا اور مصنفین نے اس تحریک میں ایک نئی طاقت اور نئی روشنی دیکھی۔ یہاں جن شعرا کا ذکر ہو گا ضروری نہیں کہ وہ سب کے سب پوری طرح ترقی پسند ہیں یا ترقی پسند مصنفین کے سبھی آدرشوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اس انجمن کو ہندوستانی زندگی کے ترقی پذیر افکار کا مرکز بنتے دیکھ کر بہت سے ایسے افراد بھی اس میں شامل ہوگئے جو سطحی خام خیالوں

میں الجھے ہوئے تھے اور اپنی شخصیت کو ایک نیا میدان فراہم کرنا چاہتے تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو علامت نگاری ' ابہام ' تجرید پسندی اور دوسرے خیالات کو ترقی پسندی سمجھ کر اس انجمن میں شامل ہونے آئے تھے۔ واضح رہے کہ ابتدا میں ترقی پسند اور داخلیت پسند شعرا میں کوئی حد فاصل قائم نہیں تھی۔ چنانچہ ایک لمبے عرصے تک تمام جدید نظم گو شعرا کو ترقی پسند شاعری کا داعی اور علمبردار قرار دیا گیا۔ ترقی پسند نظم گو شعرا نے سماجی شعور کی روایت اقبال سے اخذ کی اور بعد میں اس میں مارکسزم کا اضافہ کر کے اقبال کے دوسرے نظریات سے انحراف کیا۔ ایک اور اہم بات جو دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ تقریباً تمام اہم ترقی پسند شعرا کے یہاں رومان کے راستے حقیقت تک رسائی پانے کا ایک واضح رجحان پایا جاتا ہے۔

فیض خالص ترقی پسند نظم گو شاعر ہے۔ رومان کے راستے سے حقیقت کی طرف نکل آنے کا عمل ان کے یہاں واضح دکھائی دیتا ہے۔ فیض کی شاعری میں قدیم شعرا کا وزن اور فن کارانہ حسن بھی ملتا ہے اور نئی زندگی کی بے چینی کے ساتھ ساتھ انقلابی حوصلہ بھی ملتا ہے۔ وہ روایت سے اسی قدر ہٹتے نظر آتے ہیں جتنا وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنا وقت تجربوں میں صرف نہیں کیا بلکہ جو بھی ان کی نظمیں پڑھتا ہے اسے ایک درد انگیز ' پُر امید اور طاقت ور جدت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی غم کو کائناتی غم میں بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کے گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے 'کیا پایا ہے
جُز تیرے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

فیض نے اپنی نظموں کے ذریعے جدید اردو نظم کی ترقی میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اسرار الحق مجاز:

اسرار الحق مجاز بھی ترقی پسند نظم گو شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مجاز کو اس وقت کے ہندوستان کے نوجوانوں کی تمناؤں ' آرزوؤں ' تصوروں اور بے تاب امنگوں کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ "آوارہ"، "بربط شکستہ" ، "ایک غمگین یاد" وغیرہ ان کی خوبصورت نظمیں ہیں۔ گرچہ انہوں نے کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے اعلیٰ درجہ کا لکھا ہے۔

جاں نثار اختر:

جاں نثار اختر کی نظمیں حسین اور جاندار ہوتی ہیں۔ وہ ترقی پسند نظم گو شعرا میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے دور میں وہ بڑی دل فریب اور رومانی نظمیں لکھتے تھے۔ بعد میں دوسرے شعرا کے مانند وہ بھی انقلاب کی طرف آئے۔ ان کے کئی شعری مجموعے

شائع ہو چکے ہیں۔

علی سردار جعفری:

علی سردار جعفری نے بھی شروع میں رومانی نظمیں لکھیں۔وہ بھی بعد میں سماجی اور سیاسی مسئلوں کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ان کے شعور کا ارتقا قومی اور بین الاقوامی شعور کے ساتھ ہوا۔انسان دوستی ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ناانصافی اور ظلم کے خلاف سردار جعفری کے الفاظ اور اشعار تلوار کی مانند نظر آتے ہیں۔پتھر کی دیوار' خون کی لکیر' ایشیا جاگ اٹھا' امن کا ستارہ' ایک خواب ان کے کلام کے مجموعے ہیں اور ایک طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

ساحر لدھیانوی:

ساحر لدھیانوی کی ابتدائی نظموں میں حسن و محبت کا بڑا دلچسپ بیان ملتا ہے۔شکست'میرے گیت، چکلے' گریز' بلاوا' احساس' تاج محل' طلوع اشتراکیت اور پرچھائیاں وغیرہ ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ان کے تشبیہ و استعارے حسین و لطیف ہوتے ہیں۔ان کے اسلوب میں سادگی' نرمی اور تراش کا احساس ہوتا ہے۔

کیفی اعظمی :

کیفی اعظمی بھی ایک مقبول'ترقی پسند اور انقلابی شاعر ہیں۔شروع میں کیفی نے بھی رومانیت میں ڈوبی ہوئی نظمیں کہیں پھر بعد میں شعوری طور پر قوم پرستی اور آزادی کے گیت گائے۔ان کی نظر عالمی اور بین الاقوامی واقعات و سیاسیات پر گہری تھی جس کو انہوں نے اپنی نظموں میں برتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی:

احمد ندیم قاسمی نے اپنی نظموں میں بڑی خوبصورتی سے دیہات کی تصویر کشی کی ہے۔ان کا اسلوب شاعری بڑا جاندار اور ان کے الفاظ بڑے میٹھے لگتے ہیں۔شروع میں انہوں نے رومانیت کو ہی اپنایا تھا مگر دھیرے دھیرے سیاسی بیداری سے متاثر ہو کر فکر انگیز نظمیں لکھنے لگے۔ان کی نظمیں انسان دوستی کا جذبہ جگاتی ہے اور مستقبل کے سنہرے خوابوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

مخدوم محی الدین :

مخدوم ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک عظیم شاعر تھے۔ان کی شاعری ان کی زندگی ہے اور زندگی ان کی شاعری ہے۔وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔غریبوں اور مزدوروں کے ساتھ زندگی گزاری۔سامراجی اور جاگیرداری شکنجوں کے کرب کو محسوس کیا۔مخدوم نے محنت اور محبت دونوں کو مجبور دیکھا اس لیے وہ دونوں ہی کی جیت اور کامرانی کے متمنی نظر آتے ہیں۔یہی مخدوم کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ان کی شاعری میں توانائی'لطافت اور حسن کی فراوانی ہے۔

مجموعی طور سے اردو نظم کے تدریجی ارتقا میں ترقی پسند نظم کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے شاعر کے باطن کو چھوا ہے۔محبت کے جذبے کو ایک کشادہ کینوس عطا کرنے کی کوشش کی۔ترقی پسند نظم گو شعرا نے باطن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے احسان

دانش، وامق جونپوری، ظہیر کاشمیری، غلام ربانی تاباں، شمیم کرہانی، عرش ملسیانی، اختر انصاری، میکش حیدرآبادی، میر حسن، جمیل مظہری پرویز شاہدی، سکندر علی وجد وغیرہ بھی ترقی پسند شعرا تھے۔ ان تمام شعرا نے اردو نظم کے ارتقا میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔

2.2.8 حلقہ ارباب ذوق :

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ایک اور تحریک یا رجحان چلتا رہا جسے "حلقۂ ارباب ذوق" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اہم شعرا میں میراجی، ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالق، قیوم نظر وغیرہ شامل ہیں۔ جدید نظم کو صحیح معنوں میں جن نظم نگاروں نے ہئیتی تنوع اور معنوی عمق کے اعتبار سے مغربی نظموں سے ہمسری کرنے کے قابل بنادیا' ان میں ن۔م۔راشد، میراجی اور فیض احمد فیض وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہانت، وسعتِ مطالعہ اور فکری اپج کی بدولت جدید نظم کے لیے ترقی کی ایک نئی راہ کھول دی۔ ان کے انداز فکر اور طرز اسلوب کے اثرات بہت جلد محسوس کیے گئے اور کئی نئے تعلیم یافتہ شعرا ان کے اتباع میں نئی طرز کی نظمیں لکھنے لگے۔ ان میں ڈاکٹر تاثیر، مجید امجد، اختر الایمان، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ضیاجالندھری، عارف عبدالمتین، ظہور نظر، بلراج کومل، منیر نیازی، خلیل الرحمن اعظمی، قاضی سلیم، محمد علوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ن۔م۔راشد نے بیسویں صدی میں اردو نظم کو ہیئت اور اسلوب کی جدت پسندی کے اعتبار سے مغربی نظموں سے ہم آہنگ کرنے میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی فنی بصیرت سے کام لے کر اردو نظم کو یورپی شاعری کی سطح پر لاکھڑا کر دیا۔ راشد نے جدید اردو نظم کے تشکیلی عمل میں یورپی نظموں کے نمونوں کو سامنے رکھا ہے۔ اس طرح انہوں نے اردو نظم کا ایک نیا معیار قائم کرنے کی سعی کی۔ مغربی ادب کے مطالعہ نے راشد کے ذہن و فکر پر نئے تشکیلی اثرات مرتسم کیے۔ انھیں شخصی تجربات کے اظہار کے لیے نئے شعری پیمانوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے نظم آزاد کو اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی چند اہم نظمیں، ایران میں اجنبی، حسن کوزہ گر، خودکشی، اجنبی عورت، سباویراں، دریچے کے قریب، رقص، کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم وغیرہ ہیں۔

اردو نظم کے ارتقا میں میراجی کا نام اہم ہے۔ میراجی نے اردو نظم کو ہیئت اور طرز دونوں کے اعتبار سے یورپی نظموں کے بلند معیار سے ہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش کی۔ میراجی کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ انگریزی، فرانسیسی، امریکی، جرمنی اور روسی زبانوں کی شاعری کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے ان زبانوں کی کئی نمائندہ نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا۔ میراجی کی نظموں میں جنس ایک اہم موضوع رہا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جنسی موضوع کو بھرپور انداز میں برتنا شروع کیا۔ کروٹیں، دھوبی کا گھاٹ، ایک شام کی کہانی، دوسری عورت اور اخلاق کے نام وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں جنسی الجھن کا موضوع پست سطح سے بلند ہو کر اس دور کی اجتماعی زندگی کے ایک اہم پہلو کا مظہر بن جاتا ہے۔ جنسی جذبہ جب شکستِ آرزو کی ارفع صورت میں ڈھل جاتا ہے تو پُر تاثیر نظمیں وجود میں آتی ہیں۔ اس سلسلے میں نارسائی، کٹھور، مجھے گھر یاد آتا ہے۔ مجاور، دور کنارا، عدم کا خلا قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں دوری کی اذیت، شخصی محرومی، غم انتظار، ذہنی

تلاش اور ذوق تپش کا بیان ملتا ہے۔ اجنتا کے غار قدرے طویل نظم ہے۔ بعد کی اڑان ' اندھا طوفان ' فاختہ ' کو اوغیرہ علامتی نظمیں ہے۔ اونچا مکان میں ایک فاحشہ کی قابل رحم زندگی کا بیان ملتا ہے۔ "کلرک کا نغمہ محبت" میں کلرک کی مجبور زندگی کے ادھورے خوابوں کا سیدھا سادا بیان ملتا ہے۔

میراجی نے اردو نظم کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے آشنا کیا اور اردو نظم کے مزاج میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔ میراجی کے بعد ان کے طرز فکر اور انداز بیان کے اثرات کئی جدید نظم نگاروں میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ میراجی کی نظمیں جدید نظم کے ارتقا میں ایک اہم موڑ کا پتہ دیتی ہیں۔

اختر الایمان جدید اردو نظم کے دائرے کو وسیع تر کرنے میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فیض اور راشد کی طرح سماجی اور معاشرتی مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ ان کی فکری توجہ کا مرکز زندگی کی بدلتی ہوئی قدریں ہیں۔ اختر الایمان کے یہاں غم اور کسک کی ایک گہری کیفیت ابھری ہے۔ ان کو زندگی اور اس کے مظاہر سے بڑا پیار ہے اور وہ شکست و ریخت کے اس عمل سے ہراساں ہے۔ اختر الایمان کے غم میں زیاں کا ایک گہرا احساس شامل ہے۔ اختر الایمان کی بہترین نظمیں اس کیفیت کی عکاس ہیں۔ فیصلہ ' مسجد ' پرانی فصیل ' تنہائی میں ' جواری ' پگڈنڈی 'تعمیر ' واپسی ' دستک ' شکوہ اور یادیں اس سلسلے کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ ان کی کامیاب نظمیں فکری اور فنی عظمت کے نئے گوشے روشن کرتی ہیں۔ خاص طور پر ان کی یہ نظمیں "دست"، "یادیں" اور "ایک لڑکا" فکری عمق ' ایمائی اثر آفرینی اور اسلوب کی انفرادیت کے اعتبار سے جدید نظموں میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

2.2.9 نظم آزاد کے بعد:

آزادی کے بعد اردو نظم میں بہت سارے رجحانات در آئے۔ کچھ رجحانات کا سلسلہ مغرب کی جدید نظموں سے ملتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے زمانے میں انسان 'مشینی زندگی کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ صنعتی نظام حیات میں انسان کی زندگی تنہائی ' بے بسی ' بے چارگی کے احساسات سے دوچار ہوتی ہے۔ لوگ شہروں کی طرف جارہے ہیں۔ بڑے اور صنعتی شہروں کی بھاگ دوڑ سے خاندان کا شیرازہ منتشر ہورہا ہے۔ تنہائی نے خود غرضی کے جذبات کو فروغ دیا ہے۔ انسان کی تمنائیں ' آرزوئیں ' خواہشات صرف اپنی ذات تک ہی محدود ہورہی ہیں۔ یہ دور شدید ذہنی خلفشار ' برہمی اور ملال کا دور ہے۔ صرف اردو ہی نہیں اس دور کی تمام زبانوں کی نظموں میں ان کیفیتوں کا اظہار ہورہا ہے۔ عمیق حنفی کی سندباد ' شہرزاد ' شب گشت ' سیارگان ' ویت نام ' صوت الناقوس ' سبز آگ ' صلصلۃ الجرس وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ذہنی تناؤ اور کشمکش کی کیفیت ساتویں اور آٹھویں دہائی کی اردو نظموں میں عام ہے۔ عمیق حنفی ' وحید اختر ' ابن انشا ' وزیر آغا وغیرہ کی نظموں میں اس دور کی عکاسی ملتی ہے۔ سلیم احمد کی نظم 'مشرق ' کافی مقبول ہوئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے مشرق و مغرب کے دو زاویوں اور دو تہذیبوں کی کشمکش کو پیش کیا ہے ' آدھی صدی کے بعد 'وزیر آغا کی نظم ہے جو پانی کے دھارے کو ایک ایسے انسان کی تمثیل کے طور پر

پیش کرتی ہے جس کی زندگی زمانوں یا تین ادوار کی بے بہالہروں اور کروٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ فہمیدہ ریاض کی نظم 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے ؟ اردو نظم کے سفر کا ایک اہم موڑ ہے۔

2.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- انسان کی کثیر الجہات زندگی کا مکمل اظہار سب سے بہتر صورت میں نظم ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔
- موجودہ دور میں بعض خصوصیات کی وجہ سے سب سے جاندار صنف سخن نظم ہے۔
- اقبال، جوش، علی سردار جعفری، عمیق حنفی، وحید اختر وغیرہ نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن ان کے جوہر اردو نظم ہی میں کھلتے ہیں۔
- بلاشبہ اردو نظم میں زندگی کے تغیر و تبدل' زمانے کی شکست وریخت اور انقلابات کو بڑی خوبی' وضاحت اور علامتی تہہ داری کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔
- ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تمام اصناف سخن جو کبھی آرائش محفل ہوا کرتی تھیں' زمانے کی کروٹوں کے ساتھ فنا ہو گئیں یا انہوں نے اپنی ہیئت ہی بدل دی۔ لیکن اردو نظم میں آج بھی نئی توانائی محسوس کی جا سکتی ہے۔
- یہ اور اس طرح کے بہت سارے اسباب ہیں جن سے ہمیں مستقبل میں اردو نظم کے امکانات روشن اور تابناک نظر آتے ہیں۔
- اردو نظم کی وسعتوں اور امکانات کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ اردو نظم نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ اس کا ارتقائی عمل بھی جاری وساری رہے گا۔

2.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
بسیط	:	پھیلا ہوا
تخصیص	:	خصوصیت
مبنی	:	جس پر کسی چیز کی بنیاد ہو
مستقل	:	مستحکم
بادہ	:	شراب
بوقلمونی	:	رنگارنگ کیفیت

انحطاط	:	نیچے اترنا، زوال
اساسی	:	بنیادی
بصیرت افروز	:	عقل کو روشن کرنے والی
ابتذال	:	بے ہودگی، ناشائستگی
متنوع	:	طرح طرح اور قسم قسم کا
ترسیل	:	روانہ کرنا، نامہ بھیجنا
ابعاد	:	بُعد کی جمع، دوری
مطمع نظر	:	مرکز نظر، نقطہ
چراغ کشتہ	:	بجھا ہوا چراغ

2.5 نمونۂ امتحانی سوالات

2.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کون ہے؟
2. بکٹ کہانی کا شاعر کون ہے؟
3. جعفر زٹلی کی کون سی نظم زیادہ مشہور ہے؟
4. نظیر اکبر آبادی کہاں پیدا ہوئے؟
5. "آدمی نامہ" کس کی نظم ہے؟
6. برسات اور زمستان کس کی نظمیں ہیں؟
7. نشاط امید اور برکھارت کا خالق کون ہے؟
8. مسجد قرطبہ کس کی نظم ہے؟
9. علی سردار جعفری کا تعلق کس تحریک سے ہے؟
10. جدید شاعری کس کی کتاب ہے؟

2.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. اردو نظم کے ابتدائی دور پر نوٹ لکھیے۔
2. اردو نظم میں نظیر اکبر آبادی کی اہمیت کو واضح کیجیے۔

3. 1857 کے بعد اردو نظم کے ارتقا پر نوٹ لکھیے۔

4. انجمن پنجاب کے عہد میں اردو نظم کی صورت حال کو پیش کیجیے۔

5. جدید نظم نگاروں پر نوٹ لکھیے۔

2.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اردو نظم کی روایت پر مضمون قلم بند کیجیے۔

2. اردو نظم نگاری میں ترقی پسند شعرا کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

3. آزادی کے بعد اردو نظم نگاری کے سفر کا جائزہ لیجیے۔

2.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. نئی نظم کا سفر	خلیل الرحمٰن اعظمی
2. نظمِ جدید کی کروٹیں	وزیر آغا
3. جدید شاعری	عبادت بریلوی
4. ترقی پسند اردو شاعری	یعقوب یاور
5. اردو نظم نظریہ اور عمل	ڈاکٹر محمد عقیل صدیقی
6. جدید اردو نظم اور یورپی اثرات	حامدی کاشمیری
7. ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری

اکائی 3: نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری: آدمی نامہ

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 نظیر اکبر آبادی کا تعارف اور نظم نگاری کی خصوصیات

3.2.1 حالات زندگی

3.2.2 نظم نگاری کی خصوصیات

3.3 نظم "آدمی نامہ" کا متن

3.4 نظم "آدمی نامہ" کا تنقیدی جائزہ

3.5 اکتسابی نتائج

3.6 کلیدی الفاظ

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے نظم کی تعریف، فن، اجزائے ترکیبی اور اس کی روایت کا مطالعہ کیا۔ اردو نظم نگاری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کا ذکر بہت احترام سے کیا جاتا ہے۔ نظیر نہ صرف یہ کہ اردو نظم کے پہلے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ انہیں عوامی شاعر کہہ کر بھی یاد کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جن عوامی اور سماجی مسائل کو پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کیا ہے ان میں سے بیشتر موضوعات پر نظیر اکبر آبادی اٹھارہویں صدی ہی میں نظمیں لکھ چکے تھے۔ ان کی نظموں میں سماج اور معاشرے کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ انہوں ایک طرف میلوں ٹھیلوں اور کھیل تماشوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے تو دوسری طرف ہندوستانی تہواروں کو

بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دنیا کی بے ثباتی پر آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، ہنسی نامہ، مفلسی، روٹیاں جیسی نظمیں لکھی ہیں۔

"آدمی نامہ" نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں انہوں نے آدمی کی مختلف صورت اور ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر آدمی اپنے آپ میں مختلف ہوتا ہے اور ہر آدمی کی اپنی الگ ضرورت ہوتی ہے۔ آدمی کی مختلف حرکات و سکنات اور جبلت کو نظیر اکبر آبادی نے بہت ہی خوبصورتی سے نظم کے پیرایے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نظیرؔ اکبر آبادی کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- نظیرؔ اکبر آبادی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔
- نظیرؔ اکبر آبادی کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- نظم "آدمی نامہ" کے متن کی قرأت کر سکیں۔
- نظم "آدمی نامہ" کا تجزیاتی مطالعہ کر سکیں۔

3.2 نظیر اکبر آبادی کا تعارف اور نظم نگاری کی خصوصیات

3.2.1 حالات زندگی:

نظیر اکبر آبادی کا پورا نام ولی محمد تھا۔ وہ شرفائے اکبر آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد سید محمد فاروق، عظیم آباد کے نواب کے مصاحبین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی شادی آگرے کے مقطعہ دار سلطان خان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ سید محمد فاروق کی اکثر اولادیں پیدا ہونے کے بعد فوت ہو جاتی تھیں۔ کئی دعاؤں اور منتوں کے بعد 1736ء میں ان کے گھر ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام ولی محمد رکھا گیا۔ آگے چل کر اسی ولی محمد نے اپنا تخلص نظیرؔ کیا۔ ان کی پرورش بڑے لاڈو پیار سے ہوئی۔ ماں باپ نے انہیں ہر قسم کے شوق پورے کرنے کی سہولتیں فراہم کیں۔ ابتدائی زمانے سے ہی نظیر کو میلے ٹھیلے اور کھیل کود سے دلچسپی رہی۔ ان کے زمانے میں آگرہ علم و فضل کا گہوارہ تھا، جس کا اثر نظیر پر بھی ہوا۔ بچپن سے ہی وہ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ نظیر کی والدہ دہلی کی ایک ہنر مند اور سلیقہ مند خاتون تھیں، اس لیے دہلی کے اثرات بھی میاں نظیر پر مرتب ہوئے۔ نظیر کے سوانح نگاروں میں ان کی پیدائش کی تاریخ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض سوانح نگاروں نے ان کی پیدائش 1735ء لکھی ہے اور بعض سوانح نگار 1740ء بتاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ان کا مقام ولادت دہلی ہے اور بعض ان کی ولادت اکبر آباد بتاتے ہیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 98 برس رہی ہوگی۔

اکبر آباد کے ایک شریف گھرانے میں نظیر اکبر آبادی کی پیدائش ہوئی تھی۔ انہوں نے اضابطہ کوئی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ کوئی ملازمت نہیں کی، باپ دادا کی دولت موجود تھی البتہ محلے کے بچوں کو

پڑھا کر زندگی گزارتے تھے۔ کچھ روز کے لیے متھرا گئے تو وہاں کے مرہٹہ قلعہ دار نے انہیں اپنا استاد مقرر کیا۔ دوبارہ آگرہ آئے تو محمد علی خاں کے لڑکوں کو درس دینے لگے۔ اسی دوران رائے کھتری سے ملاقات ہوئی۔ رائے کھتری نے اپنے بچوں کی تربیت میاں نظیر کے سپرد کر دی۔ آخری عمر میں نظیر کا تعلق کاشی کے سربراہ راجہ بلوان سنگھ کی سرکار سے ہو گیا تھا۔ اپنے خاندان اور ماحول کی وجہ سے نظیر نے سپہ گیری کے فن میں کمال حاصل کیا تھا۔ فارسی اور عربی جانتے تھے۔ ہندی، پنجابی اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔ عوام میں اٹھنا بیٹھا تھا۔ زبان کے عوامی لہجے سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ایک قلندر مزاج آزاد منش انسان تھے۔ اس کا اندازہ ان کی شاعری سے بھی ہوتا ہے۔ نظیر کے والد سنی تھے لیکن وہ امامیہ مذہب کے قائل تھے۔ عبادتوں کی ادائیگی معمولی طور پر کرتے تھے۔ البتہ تعزیہ داری کے اہتمام پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔

ادھیڑ عمر میں ظہور النساء بیگم بنت عبد الرحمن چغتائی سے شادی کی۔ آخری عمر میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ نظیر کو اولادیں بھی ہوئیں ۔1827ء میں فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے اور 98 سال کی عمر میں 25 صفر 1246ھ مطابق 16 ' اگست 1830ء کو انتقال کیا۔ نماز جنازہ سنی اور امامیہ طریقے سے الگ الگ دو مرتبہ پڑھائی گئی۔ البتہ تجہیز و تکفین امامیہ طریقہ پر ہوئی۔ ان ہی کے مکان میں موجود نیم کے درخت کے نیچے دفن کیے گئے۔ نظیر کے مزاج کی شوخی، بانکپن، کھیل کود اور میلے ٹھیلوں کے شوق اور تجربات کے اظہار کے لیے تعلیم ہی ان کو راس آئی۔ ان کا مشاہدہ دنیاوی معاملات کے ساتھ ساتھ زندگی کے پیچ و خم کے متعلق بھی بہت گہرا تھا۔ نظم کی آزادی ان کی آزاد روش سے بڑی مناسبت رکھتی تھی اس لیے وہ نظم نگاری کی طرف مائل ہوئے اور ہر چھوٹے بڑے موضوع پر نظمیں لکھیں۔

آگرے کے ماحول میں پرورش پاتے ہوئے نظیر کو اس زمانے کے عام مشاغل سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ کم عمری ہی سے ان کی طبیعت میں منچلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے محبوب مشغلوں میں داؤ پیچ، کشتی، تلوار چلانا، بانک پٹہ اور بلم وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ کبوتر بازی، مرغ بازی اور پتنگ لڑانے کے فن میں بھی ماہر تھے۔ اُس زمانے میں آگرہ عیش و عشرت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس لیے نظیر کو اپنے شوق پورے کرنے کے بھرپور مواقع ملے۔ وہ شطرنج اور چوسر کھیلنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ چوں کہ منتوں اور مرادوں سے پیدا ہوئے تھے' اس لیے ان کے کسی بھی شوق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ایسے ذوق و شوق اور مشغلوں پر کئی نظمیں موجود ہیں، جو ان کے دور کی عکاسی کرتی ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کے سوانح کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی عمر سے ہی انہیں شاعری کا چسکہ لگ گیا تھا۔ شعر کہتے تھے مگر اس کی حفاظت نہیں کی مختلف تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1182ھ م 1770ء میں جب میر تقی میرؔ دہلی سے آگرہ لوٹے تو نظیر نے ان سے ملاقات کی اور ایک غزل سنائی۔ اس وقت ان کی عمر 34 سال تھی۔34 سال کی عمر پختہ عمر ہوتی ہے۔ یقیناً یہ ان کی پہلی غزل نہیں تھی جو انہوں نے میر تقی میرؔ کو سنائی ہو گی۔ اس کے بعد بھی انہوں نے کئی غزلیں لکھیں لیکن ان کا زیادہ تر رجحان نظم نگاری کی طرف ہی رہا۔

3.2.2 نظم نگاری کی خصوصیات:

نظیرؔ اکبر آبادی ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے دور کے معاشرہ اور سماج کے بہترین شاہد اور عکاس بھی تھے۔ ان کی تمام تر نظموں میں

مشاہداتی فضا موجود ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں زندگی کے تمام موضوعات دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں میلوں ٹھیلوں اور کھیل تماشوں کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی ماحول موجود ہے اور ہندو مسلم تہواروں اور عیدوں پر ان کی کئی نظمیں موجود ہیں۔ عید گاہ اکبر آباد' شب برات' عید الفطر اور ہولی' دیوالی پر نظمیں لکھنے کے علاوہ نظیر اکبر آبادی نے دنیا کی بے ثباتی پر آدمی نامہ' بنجارہ نامہ' ہنس نامہ جیسی مشہور نظمیں لکھیں۔ نظیر کی شاعری میں برسات' طفلی' جوانی اور بڑھاپا سب پر نظمیں موجود ہیں وہ ریچھ اور گلہری پر ہی نظمیں نہیں لکھتے بلکہ ان کی شاعری میں مظاہر حیات بھی مسرت آفریں ہیں۔ لالہ و گل' نسرین و سمن' نیلوفر و سوسن' چنبیلی' مدھ مالتی' مولسری' کنول' موگرہ' کیتکی' موتیا اور سرسوں پر بھی انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے اطراف کی زندگی کے موضوعات کی بھرپور نمائندہ ہیں۔ ریچھ کا بچہ' ہنس کا بچہ جیسی نظمیں یہ ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ نظیر نے اپنے دور کے ہر منظر کو نظم کا موضوع بناتے ہوئے خالص ہندوستانی معاشرہ کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

جس دور میں نظیر اکبر آبادی نے نظم نگاری کی روایت کا آغاز کیا اس وقت سارے ہندوستان میں اردو شاعری معرب اور مفرس تراکیب سے رچی بسی تھی اور ایسے شاعر کو ہی کامیاب سمجھا جاتا تھا جو ثقیل الفاظ اور پیچیدہ طریقہ کو اپنی شاعری میں اختیار کرتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی نے سادہ اور بول چال کی زبان استعمال کی' جس کی وجہ سے ان کی نظمیں عوام کے ذہنوں پر اثر کرنے لگیں۔ نظیر کی شاعری میں عربی اور فارسی تراکیب کا استعمال بہت کم ہے۔ وہ موقع بہ موقع ہندی بھاشا کے الفاظ بھی اپنی نظموں میں استعمال کر لیتے تھے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے نظیر کی شاعری عوامی شاعری کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ نظیر کی عوامی نظموں میں برج' اودھی' سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کا کامیابی کے ساتھ استعمال دکھائی دیتا ہے۔ نظیر کا کمال یہی ہے کہ وہ ہر زبان کے الفاظ کو شاعری میں شامل کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے نظیر کی شاعری عوام میں مقبول رہی۔

نظیر نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے نظیر کی آواز اپنے دور کے شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ غزل گوئی میں انہوں نے نام نہیں کمایا، لیکن نظم گو کی حیثیت سے نظیر اکبر آبادی ساری اردو شاعری میں اہمیت رکھتے ہیں۔ نظیر کے عہد میں نظم گوئی کا تصور نہیں تھا لیکن انہوں نے بے شمار موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ نظیر کی شاعری میں نظم کی مختلف اصناف دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے شہر آشوب' واسوخت' غزلِ مسلسل' پابند نظم' ترکیب بند' ترجیع بند اور قطعات لکھ کر شاعری کی مختلف اصناف کو وسیلہ اظہار بنایا۔ موضوعاتی اعتبار سے نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں سماجی' اخلاقی' معاشرتی اور ہندوستانی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسم ورواج' چرند' پرند' عید، تہوار' دنیا کی بے ثباتی' کھیل کود' میلے ٹھیلے اور مناظرِ قدرت پر ان کی بے شمار نظمیں موجود ہیں۔ نظم ہولی کا یہ رنگ دیکھیے۔

کچھ طبلے کھنکے' تال بجے' کچھ ڈھولک اور مردنگ بجے
کچھ چھیڑیں بین ربابوں کی' کچھ سارنگی اور چنگ بجے

کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈمی اور مرچنگ بجے

کچھ گنگھرو جھنکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجے

اپنی مشہور حمد میں نظیر اکبر آبادی کس طرح حمد باری تعالیٰ سے بیان کرتے ہیں دیکھیے:

اس ارض و سما کے عرصے میں یہ جتنا لچھم کھچا ہے　　　یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے یہ رنگ تجھی نے رچا ہے

حیوان پکھیرو نر ناری کیا بوڑھا بالک بچا ہے　　　کیا دانا' بینا' ہوش بھرا' کیا بھولا' ناداں' کچا ہے

کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

نظیر کا مشاہدہ بڑا گہرا اور وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر رنگ کو اس طرح اپنی نظموں میں سمو دیتے ہیں کہ تصویر سامنے آجاتی ہے۔ برسات پر ان کی نظم کا ایک بند سنیے:

کیچڑ سے ہر مکاں کی تو بچتا بہت پھرا　　　پر جب دکھائی دی کھلے بالوں کی ایک گھٹا

بجلی بھی چمکی حسن کی منھ برسا ناز کا　　　پھسلن جب ایسی آئی تو کچھ بس نہ پھر چلا

آخر کو واں نظیرؔ بھی آکر پھسل پڑا

نظیر کے دور میں نظم کی روایات نہ ہونے کے برابر تھیں، طویل مثنویاں بہت لکھی گئی تھیں۔ مرثیے کے علاوہ قصیدوں کی بڑی دھوم تھی۔ نظیر کا ایک شہر آشوب بہت مشہور ہے جس سے اس زمانے کی سماجی تاریخ سامنے آتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ　　　آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ

مانگو عزیز ایسے بُرے وقت سے پناہ　　　وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ

کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

جتنے ہے آج آگرے میں کارخانہ جات　　　سب پر پڑی ہے آن کے روزی کی مشکلات

کس کس کے دکھ کو روییۓ اور کس کی کہیے بات　　　روزی کے اب درخت کے ہلتا نہیں ہے پات

ایسی ہوا' کچھ آکے ہوئی ایک بار بند

نظیر کی نظموں میں غریبی اور مفلسی کے علاوہ بعض عبرت آموز واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی ایک نظم '' دربیانِ تماشائے دنیائے دوں'' کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو ہنڈی والا ہے وہ خاک چھان بیٹھا ہے　　بنا کے نیاریا زر کی دکان بیٹھا ہے
زمین پھرتی ہے اور پاسبان بیٹھا ہے　　جو چور تھا سو وہ ہو پاسبان بیٹھا ہے

غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

ان کی مشہورِ زمانہ نظم '' تلاش زر'' میں ان کی شدید حس اور عمیق مشاہدے کے علاوہ تجربے کی وسعتیں بھی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اس نظم میں وہ زر اور دولت کی اہمیت اور اس کی خاطر ہونے والی تباہیوں کا حال بیان کرتے ہیں:

کٹتے ہیں ہاتھ پاؤں گلے اور کلائیاں　　ہوتی ہے زر کے واسطے ہر جا چڑھائیاں
کل زر کی ہو رہی ہیں جہاں میں لڑائیاں　　بندوقیں اور ہیں کہیں توپیں لگائیاں

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہراک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

ان کی نظمیں '' موت'' اور '' روٹیاں'' درحقیقت اس دور کی کامیاب عکاسی کرنے کے لیے کافی ہیں۔ نظیر نے اپنی نظموں میں اصناف کی نمائندگی کے بجائے موضوعات کی نمائندگی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ نظم '' موت'' کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

چلتی ہے نت اجل کی سناں گولی اور تفنگ　　دن رات دُن مچی ہے یہاں اور پڑی ہے جنگ
جو جی چھپا کے بھاگا تو اس کا ہوا یہ رنگ　　جن کا قدم بڑھا وہ مرا ' وہیں بے درنگ

وہ بھاگتے میں تیغ و تبر کھاکے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آکے مرگیا

نظیر کی نظموں میں انسان دوستی کا جذبہ نمایاں ہے وہ پورے احساس کے ساتھ انسان کی قدر اور اس کی زندگی کی حفاظت کی اہمیت کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ وہ صرف نادار و مفلس انسان سے ہی محبت نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری میں ہر انسان سے محبت کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی مشہور نظم '' آدمی نامہ'' اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے یہاں انسانیت کا درد ہے۔ روٹی انسان کی زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ وہ ایک ایک روٹی کے لیے در در کی خاک چھانتا ہے۔ بھوکا ہو تو چاند سورج بھی اسے روٹی ہی نظر آتے ہیں۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے — یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لیے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے — ہم تو نہ چاند سمجھے نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں

اپنی مشہور نظم "مفلسی" اور آٹے دال" میں انسان کی بے بسی کو ظاہر کیا ہے۔ نظم "مفلسی" میں لکھتے ہیں:

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر — دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر — جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر

ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

نظیر نے مفلسی کے علاوہ آٹے دال' کوڑی نامہ' پیسہ جیسی نظمیں لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ سب زندگی کے حقائق ہیں اس کے بغیر دنیا میں انسان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کی نظم " آٹے دال" کا یہ بند ملاحظہ ہو:

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں — منشی و میر و وزیر و بخشی و نوّاب و خاں
جاگتے دربار میں کیوں آدھی آدھی رات یاں — کیا عجب نقشہ پڑا ہے آن کر کہیے میاں

سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کی

نظیر اکبر آبادی ایک ایسے حقیقت پسند شاعر ہیں جن کی نظموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانیت کی بقا کے لیے انسان کو جینے کے یکساں وسائل ملنے چاہئیں۔ نظیر نے بعض نظمیں بچوں کے لیے بھی لکھی ہیں جیسے ریچھ کا بچہ' بلی کا بچہ وغیرہ۔ نظیر کے بعض موضوعات تو اتنے دلچسپ اور انوکھے ہیں کہ ان پر آج تک بھی کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا مثلاً کورا برتن' لکڑی' تل کے لڈو وغیرہ۔

اردو کے شاعروں میں اشتراکی خیالات کا نظریہ بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں نظر آتا ہے مگر نظیر اکبر آبادی اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں ہی اشتراکی حقیقت پسندی کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ اشتراکی خیالات میں دولت کی یکساں تقسیم کو اہمیت دی جاتی ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں جہاں روٹی کا ذکر ہے وہیں روزگار کے نہ ملنے پر انسان میں پیدا ہونے والی بے بسی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نظیر مفلسوں اور عام آدمیوں سے ہمدردی کے باوجود اپنے کلام میں بادشاہت یا شہنشاہیت کی مخالف نہیں کی بلکہ ان کی نظمیں " آدمی نامہ "، " تلاش زر"، " روٹیاں"، " مفلسی" ، " آٹے دال"، " کوڑی نامہ" وغیرہ کے مطالعہ سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر نے ہندوستان کے گنگا جمنی کلچر کی نمائندگی کی ہے اور ان کے اشتراکی کلچر میں جہاں " عید الفطر" ، " شب برات" اور " عید گاہ اکبر

آباد" پر نظمیں موجود ہیں تو وہیں " ہولی "، " دیوالی " اور " بسنت " پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔

بنیادی طور پر نظیر ایک عوامی شاعر ہیں اس لیے ان کی شاعری میں جہاں قدرتی مناظر کی عکاسی دکھائی دیتی ہے وہیں عرس، میلوں اور تہواروں کے مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی مشہور نظم " برسات کی بہاریں " قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظم "گرمی" بھی اس بات کی دلیل ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے قدرتی مناظر کو پورے سلیقے کے ساتھ اپنی شاعری میں شامل کیا ہے۔ نظیر کی نظموں میں مناظر قدرت کی عکاسی لفظوں کے ذریعے نمایاں ہے۔ ان کی نظمیں "بنجارہ نامہ" اور "آدمی نامہ" انسان کے مختلف روپ و رنگ اور کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان نظموں کے بین السطور میں اخلاقی اقدار بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کی ایک مشہور نظم " کل جگ " کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے

میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے، دکھ درد دے آفات لے
کل جگ نہیں، کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

قدرتی مناظر کے علاوہ نظیر اکبر آبادی ہر نظم کو کسی نہ کسی فطری منظر سے وابستہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی نظموں میں نیکی، سچائی اور حقیقت کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے نظیر اکبر آبادی کی نظموں کے مناظر اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ ان کی نظم "بل دیو جی کا میلا" اور "عید گاہ اکبر آباد" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر نے اپنے ماحول کے مناظر کو بھی نظموں میں شامل کر لیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی اردو نظم کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے عربی، فارسی، پنجابی، اودھی، برج، کھڑی بولی اور سنسکرت کے الفاظ کو پوری خصوصیات کے ساتھ اپنی شاعری میں شامل کیا۔ نظیر کی شاعری میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی کمی نہیں۔ وہ کفر و ایماں، دیر و حرم، سبحہ و زنار کی تراکیب کے علاوہ عاشق، دلبر، دشت اور آہنگ کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ کھڑی بولی، برج اور پنجابی سے آنند، بھیڑ، جنم، سنسار، لچھن، اوتار، سروپ، پرتپال، مدھ مست کے الفاظ ان کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں۔ وہ نہ صرف چولھا، ہانڈی اور تنور کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں بلکہ ایسے اودھی کے الفاظ بھی ان کی شاعری میں جگہ بناتے ہیں جنہیں صرف انھوں نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ پھل پات کی ترکیب پر خالص اودھی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ مخاطبت کے لیے "بابا" کے لفظ کا استعمال بھی خالص ہندوستانی مزاج کی

نمائندگی کرتا ہے۔ غرض نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں بے شمار ہندوستانی الفاظ استعمال کیے جنہیں نہ نظیر اکبر آبادی سے پہلے کسی شاعر نے استعمال کیا تھا اور نہ نظیر کے بعد کسی شاعر نے اپنی شاعری میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ نظیر کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی جس کا اندازہ ان کی مخمس کے اس بند سے بھی ہوتا ہے۔

رنگریز بیٹھے رنگتے ہیں رنگت ہزاریاں — سرخ و گلابی ، زرد ، سیاہ ، سبز دھاریاں
مخمل کوئی بنی ، کوئی مشرو ، کٹاریاں — جنگل میں جاکے دیکھا تو پھر واں بھی نیاریاں

نت خاک چھانتا ہے پڑا پیٹ کے لیے

نٹ کھٹ ، اچکّے ، چور ، دغا باز ، راہ مار — عیّار ، جیب کترے ، نظر باز ، ہوشیار
سب اپنے اپنے پیٹ کے کرتے ہیں کاروبار — کوئی خدا کے واسطے کرتا نہیں شکار

بلی بھی مارتی ہے چوہا پیٹ کے لیے

بیٹھے ہیں چوک میں جو کہاتے حکیم جی — ڈبیا ہر یک دوا کی بنی ہے دھری سبھی
پیسے دوا کے آویں تو آنکھوں میں آوے جی — بیمار کا تو کچھ نہیں کرتے علاج ، جی

اپنی ہی کچھ کرے ہے دوا پیٹ کے لیے

اس نظم کی لفظیات پر برج، کھڑی، پنجابی اور اودھی کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

3.3 نظم "آدمی نامہ" کا متن

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال، قطب و غوث، ولی آدمی ہوئے — منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے لیے — حتّٰی کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے

خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا

یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور

اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی

اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ　　قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ　　دوڑے ہیں آدمی ہی تو مشعل جلا کے راہ

اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار　　اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑیں بغل میں مار　　کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار

اور اس میں جو پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے مجیرے دائرے سارنگیاں بجا　　گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بجا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا　　اور آدمی ہی ناچے ہیں اور دیکھ پھر مزا

جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں　　روپے کے جن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں　　کم خواب تاش شال دو شالوں میں غرق ہیں

اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا　　اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خونچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا　　کس کس طرح کی بیچیں ہیں چیزیں بنا بنا

اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار　　نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زارزار　　سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار

اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل و جواہر میں بے بہا — اور آدمی ہی خاک سے بد تر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا — گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا ہے چاند سا

بد شکل بد نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں یارو دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے — اور آدمی ہی چور ہے اور آپی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تانگ ہے — دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے

فولاد سے گڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر — یہ آدمی ہی کرتے ہیں سب کار دل پذیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ

اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

3.4 نظم "آدمی نامہ" کا تنقیدی جائزہ

نظم "آدمی نامہ" سولہ (16) بندوں پر مشتمل ہے، جو مخمس کی شکل (ہیئت) میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے آدمی کی مختلف قسمیں اور صفات کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ذیل میں تمام بندوں کی تشریح پیش کی جا رہی ہے۔

اس نظم کے پہلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں جو بادشاہ ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو غریب ہے، فقیر ہے وہ بھی آدمی ہے۔ جس کے پاس مال و دولت ہے وہ بھی اور بے یار و مددگار ہے وہ بھی آدمی ہے۔ یہاں تک کہ جو اچھی اچھی غذائیں کھا رہا ہے یعنی نعمت کھا رہا ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو سوکھے ٹکڑے کھا رہا ہے وہ بھی آدمی ہی ہے۔

اسی طرح دوسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ جو اللہ کے نیک بندے ہیں مثلاً قطب و غوث، ابدال اور ولی وہ بھی آدمی ہی ہیں اور جس نے خدا کی خدائی سے انکار کر کے کافر کہلائے وہ بھی آدمی ہیں۔ اس کے علاوہ جن خدا کے نیک بندوں نے اپنے ہنر اور کمال سے خدا کے نیک بندوں کو فیض پہنچائے وہ بھی آدمی ہیں یعنی اچھے اور برے دونوں قسم کے آدمی اس دنیا میں ہیں۔

تیسرے بند میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو خدائی کا دعویٰ کرتے تھے وہ بھی آدمی تھے خواہ وہ فرعون ہو، نمرود ہو یا شداد، جن

لوگوں نے دنیا میں جنت بنا کر اپنی خدائی کا دعویٰ کیے تھے وہ بھی آدمی ہی تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ اب میں آگے کیا لکھوں آپ خود ہی اس بات پر غور کریں کہ یہاں تک جو کچھ کر رہے ہیں یہ لوگ بھی اللہ ہی کی مخلوق یعنی آدمی ہی ہیں۔

چوتھے بند میں نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں کہ اس دنیا میں مسجد بنانے والے، مسجد میں خطبہ پڑھنے والے اور نماز پڑھنے والے سبھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مسجد میں قرآن اور نماز پڑھنے والوں کی جوتیاں چرانے والے اور ان کو ایسا کرتے ہوئے دیکھنے والے بھی ہی ہیں۔ یعنی اچھے برے، نیک وبد سب آدمی ہی ہیں۔

پانچویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں آگ کے مانند بھی آدمی ہیں اور نور کے مانند بھی۔ یہاں آدمی ہی آدمی کے پاس ہے اور آدمی ہی آدمی سے دور ہے۔ یعنی آدمی کے عمل ہی سے اچھائی اور برائی ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں پر آدمی کو دھوکہ، فریب دینے والا بھی آدمی ہے اور ان کو صحیح راستہ دکھانے والا بھی آدمی ہے۔ یعنی اس دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں، ایک نیک اور دوسرا بد۔ نیک لوگ اچھے اعمال کی بدولت جنت کے حق دار ہیں اور برے لوگ برے اعمال کی وجہ سے جہنم کے حق دار ہیں۔ مطلب یہ کہ آدمی ہی جنت اور جہنم میں جانے والا ہے۔

چھٹے بند میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کے کئی چہرے ہیں۔ اس دنیا میں ایسے بھی آدمی ہیں جو دوسروں کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اور ایسے بھی آدمی ہیں جو اپنے فائدے کے لیے دوسروں کا خون بھی کر دیتے ہیں۔ آدمی ہی دوسرے آدمی کی بے عزتی کرتا ہے اور مدد کو پکارنے ولا اور اس کی مدد کرنے کے لیے آنے والا بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔

ساتویں بند میں نظیر کہتے ہیں کہ اس دنیا میں سفر کرنے ولا، گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر مارنے والا، آدمی کو اپنی بربریت کا شکار بنانے والا، آدمی کو اپنے جال میں پھنسانے والا بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔ جو سچا ہے وہ بھی آدمی ہے اور جو جھوٹا ہے وہ بھی آدمی ہی ہے۔

آٹھویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ یہاں آدمی ہی آدمی (مرد و عورت) سے شادی کرتا ہے اور اس شادی میں شرکت کرنے والے باراتی، وکیل، گواہ اور قاضی (نکاح میں شامل لوگ) سبھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بارات کے آگے ناچنے، گانے اور بجانے والے بھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔ رات کے وقت مشعلیں جلا کر جو لوگ آگے آگے چلتے ہیں وہ بھی اور جو گھوڑے پر سوار ہو کر دلہن بیاہنے آتا ہے وہ بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔

نویں بند میں نظیر نے اپنے زمانے کی سماجی صورت حال کا نقشہ بڑی خوب صوٗرتی سے کھینچا ہے کہ جب رئیسوں اور امیروں کی سواری جاتی ہے تو نقیب (خبر دینے والا، مدح خواں، ہرکارہ) آگے آواز لگاتے جاتے ہیں۔ اور راستے میں پیدل اور سواری پر چلنے والے ان کے ساتھ حقہ، صراحی اور جوتیاں بغل میں دبائے ہوئے دوڑتے جاتے ہیں۔ جن کے کندھوں پر پالکی رکھی ہوتی ہے اور جو پالکی میں بیٹھا ہوتا ہے وہ بھی آدمی ہی ہے۔

دسویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ لوگوں کو پناہ دینے وال بھی آدمی ہے اور ہر طرح کے گانے بجانے والے بھی آدمی ہی ہیں۔ رنڈی کو نچانے والا بھی آدمی ہے اور ان کو دیکھ کر ناچنے والا اور خوش ہونے والا بھی آدمی ہی ہے اور سب کو ناچتے ہوئے دیکھنے والا بھی

آدمی ہی ہے۔

گیارہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں لعل (سرخ رنگ جواہر / معشوق کے ہونٹ) و جواہر (قیمتی / یاقوت / ہیرہ) سب سے زیادہ قیمتی ہیں اور آدمی ہی اس دنیا میں خاک سے بد تر ہو گیا ہے۔ مطلب یہ کہ انسان قیمتی لعل و جواہر حاصل کرنے کے لیے برے کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں چاند کی طرح چمکنے والے خوب صورت آدمی بھی ہیں اور بد شکل اور بد نما چہرے والے آدمی بھی ہیں۔

بارہویں بند میں نظیر کہتے ہیں کہ اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کے پاس روپے پیسے کی فراوانی ہے۔ ان کے قدموں میں پیسوں کے ڈھیر ہیں اور ان کی پیشانی سونے کے مانند چمک دار ہیں۔ چاروں طرف ان کے چرچے ہیں اور وہ قیمتی لباس میں ملبوس ہیں۔ وہیں دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنے جسم پر چیتھڑے پہن رکھے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کو عیش و آرام کی سب چیزیں حاصل ہیں اور ایسے بھی لوگ ہیں جن کو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی اور پہننے کو کپڑے بھی میسر نہیں ہیں۔

تیرہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ میں حیران ہو کہ یہاں آدمی ہی چور ہے، جو چھینا جھپٹی کر رہا ہے۔ آدمی ہی یہاں ہر پریشانی میں مبتلا ہے۔ دوسری طرف ایسے بھی آدمی میں ہیں جو فولاد کی طرح مضبوط ہیں اور ہر مصیبت کو جھیل رہے ہیں۔ یعنی اس دنیا میں ہر طرح کے آدمی موجود ہیں۔

چودہویں بند میں نظیر کہتے ہیں کہ دکان لگانے والے، دکان پر بیٹھنے والے، سامان خریدنے والے سبھی آدمی ہی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ اپنے سروں پر چیزیں رکھ کر بیچ رہے ہیں وہ بھی آدمی ہی ہیں۔

پندرہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ مرنے کے بعد کفن پہنانے والا، قبرستان لے جانے والے، میت میں شرکت کرنے والے اور میت کے ساتھ کلمہ پڑھتے ہوئے چلنے والے سبھی آدمی ہی ہیں۔ اس کے علاوہ مردے کو آخری رسومات ادا کرانے والے اور نماز جنازہ پڑھنے اور پڑھانے والا آدمی ہوتا ہے اور مرنے والا بھی آدمی ہی ہوتا ہے۔

سولہویں اور آخری بند میں نظیر کہتے ہیں کہ شریف سے لے کر بد معاش تک اور بادشاہ سے لے کر وزیر تک سبھی آدمی ہی ہوتے ہیں۔ اور جو کمتر درجے یعنی حقیر و فقیر بھی آدمی ہی ہیں۔ اس دنیا میں پیر اور مرید بھی آدمی ہیں۔ آخری دو مصرعوں میں نظیر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے نظیر اس دنیا میں اچھے اور برے دونوں قسم کے آدمی ہوتے ہیں، جو اعمال سے خود کو اچھا بھی کہلاتے ہیں اور برا بھی۔

نظیر اکبر آبادی کی شہرت نظم نگار کی حیثیت سے تسلیم شدہ ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی بہترین نظموں میں "آدمی نامہ" ایک بہت ہی خوبصورت نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے آدمی کے رنگا رنگ روپ بڑی خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔ آدمی زندگی کے ہر موڑ پر آدمی ہی رہتا ہے۔ اس نظم میں شاعر انسان کی عظمت کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس کی ذلت کا بھی مگر ہر حال میں اسے آدمی ہی گردانتا ہے۔ گر آدمی

ہونے کی شرط اس کی شکل و شباہت ہے تو چاہے جیسا بھی ہو پر ابنِ آدم ہی ہے۔ پادشاہ ہو یا فقیر ہو، ٹکڑے پر گزر بسر کرنے والا ہو یا نعمتیں کھانے والا ہر ایک آدمی ہی ہوتا ہے۔ آدمی اپنے اعمال سے آدمیت کے اعلیٰ مقام پر بھی پہنچتا ہے اور کچھ منکرِ دین ہو کر کفر تک بھی۔ شاعر کہتے ہیں کہ خالق کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے وہ اپنے زہد و ریاضت سے خالق سے بھی مل لیتا ہے۔شاعر نے فرعون، شداد، نمرود کی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں خدا بننے کا شوق تھا۔ خدائی کی اس چاہ میں کسی نے خدائی کا دعویٰ کیا کسی نے بہشت بنائی۔ آدمی رہبر بھی ہے آدمی رہزن بھی ہے۔ شیطانیت کے خصائل رکھنے والا بھی آدمی ہی ہے۔ ساری کارستانی آدمی کی ہے۔ آدمی عبادت کے لیے مسجد بناتا ہے، جس میں آدمی خطبے سناتا ہے۔ امام بھی آدمی ہے اور مقتدی بھی اور ان کی جوتیاں چرا لے جاتا ہے وہ بھی آدمی ہی ہے اور جو اس چور کی حرکت کو تاڑتا ہے وہ بھی آدمی ہے۔ آدمی ہی آدمی کی جان لیتا ہے آدمی ہی آدمی پر جان دیتا ہے۔ آدمی کو عزت آدمی ہی دیتا ہے ذلت بھی آدمی کو آدمی سے ہی ملتی ہے گرچہ دنیا میں جو بھی تماشے آنکھوں کے سامنے نظر آتے ہیں وہ آدمی کے مرہون منت ہیں۔ خدمت گار آدمی اور خدمت کرانے والا بھی آدمی پکارنے والا بھی آدمی دوڑنے والا بھی آدمی۔ جھوٹا، سچا، ایماندار، بے ایمان، راجہ ، پرجا، خوش خوراک، افلاس کا مارا، خوش لباس یا چیتھڑا لپیٹا ہوا تمام تر صورتوں میں آدمی ہی جلوہ گر ہے حتیٰ کہ جنازے پر لیٹا ہوا اور جنازے کو کندھا دینے والے سبھی آدمی ہیں۔

اس نظم میں نظیر کا ایک آفاقی پیغام بھی ملتا ہے کہ کوئی کسی کو حقیر نہ سمجھے جتنے لوگ نظر آتے ہیں سب کے سب آدمی ہی ہیں اس لیے بلا امتیاز شکل وصورت، پیشہ و مشغلہ، ذات و مذہب، رنگ و نسل سب کو آدمی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی اس نظم کے ہر بند کے آخر میں استعمال ہونے والا فقرہ "سو ہے وہ بھی آدمی" ذو معنی ہے پہلا معنی تو یہ ہے کہ چاہے جیسا ہو وہ آدمی ہے جو آدمی جیسا دکھتا ہے، دوسرا مفہوم حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ جس طرح کا بھی آدمی ہو اسے آدمی ہی کہنا پڑے گا۔

16.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اردو نظم نگاری کی تاریخ میں نظیر اکبر آبادی کا ذکر اولیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ نظیر نہ صرف یہ کہ اردو نظم کے پہلے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ انہیں عوامی شاعر کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔
- نظیر اکبر آبادی کا اصل نام ’ ولی محمد ‘ تھا اور ان کے والد کا نام سید محمد فاروق تھا، جن کا شمار عظیم آباد کے نواب کے مصاحبین میں ہوتا تھا۔
- نظیر اپنے والدین کی تیرہویں اولاد تھے۔ اس سے پہلے ان کے بارہ بھائی بہن پیدا ہوئے، لیکن سبھی بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔

- نظیر اکبر آبادی کے سنہ پیدائش اور مقام پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن زیادہ تر محقق اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ نظیر 1735 کے قریب دہلی میں پیدا ہوئے۔
- نظیر کے سوانحی مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدائی عمر ہی سے شاعری کرنے لگے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے غزلیں کہیں اس کے بعد ان کا رجحان نظم نگاری کی طرف ہوا۔
- دہلی کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے نظیر اکبر آبادی بیس بائیس سال کی عمر میں اپنی ماں اور نانی کے ساتھ آگرہ منتقل ہو گئے اور وہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔
- نظیر اکبر آبادی نے طویل عمر پائی۔ ان کا انتقال 16/ اگست 1830ء کو آگرہ میں ہوا۔
- نظیر اکبر آبادی نے اردو شاعری کی بیشتر اصناف سخن مثلاً غزل، رباعی، مثنوی، قصیدہ، نعت الغرض تمام مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن انہیں ان کی نظمیہ شاعری کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔
- نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں سماج اور معاشرے کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ انہوں ایک طرف میلوں ٹھیلوں اور کھیل تماشوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے تو دوسری طرف ہندوستانی تہواروں کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دنیا کی بے ثباتی پر آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، ہنسی نامہ، مفلسی، روٹیاں جیسی نظمیں لکھی ہیں۔
- نظم "آدمی نامہ" سولہ (16) بندوں پر مشتمل ہے، جو مخمس کی شکل (ہیئت) میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے آدمی کی مختلف قسمیں اور صفات کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

3.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
پادشہ	:	بادشاہ
گدا	:	فقیر، سوالی
زردار	:	مالدار، دولت مند
بے نوا	:	غربت، مفلسی
کشف و کرامات	:	اعجاز و تصرف
تیغ	:	تلوار، شمشیر

صید	:	شکاری کا کام یا پیشہ، شکار کرنا
نقیب	:	سردار، سربراہ، کسی قوم یا گروہ کا بڑا یا معتبر آدمی
زارزار	:	کثرت سے رونا، آنسو بہانا
خونچا	:	ٹوکری
اشراف	:	شریف کی جمع، اچھے لوگ

3.7 نمونۂ امتحانی سوالات

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. نظیر اکبر آبادی کا اصل نام کیا تھا؟
2. نظیر اکبر آبادی کے والد کا کیا نام تھا؟
3. نظیر اکبر آبادی کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟
4. نظیر اکبر آبادی کی بیوی کا کیا نام تھا؟
5. نظیر آخری عمر میں کس مرض میں مبتلا ہوئے؟
6. نظم "آدمی نامہ" کتنے بند پر مشتمل ہے؟
7. نظم "آدمی نامہ" کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟
8. نظیر اکبر آبادی جملہ کتنے بھائی بہن تھے؟
9. نظیر اکبر آبادی کے سسر کا کیا نام تھا؟
10. نظیر اکبر آبادی کا انتقال کہاں ہوا؟

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. نظم آدمی نامہ کے حوالے سے آدمی کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
2. نظم "آدمی نامہ" کا خلاصہ بیان کیجیے۔
3. نظم" آدمی نامہ" کی خصوصیات بیان کیجیے۔

4. ذیل کے بند کی تشریح کیجیے۔

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا	شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا	یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا

یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

5. نظم کے آخری بند میں نظیر اکبر آبادی نے کیا پیغام دیا ہے؟ بیان کیجیے۔

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. نظیر اکبر آبادی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. نظم "آدمی نامہ" کی تشریح کیجیے۔

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. کلیات نظیر اکبر آبادی	نظیر اکبر آبادی
2. نظیر اکبر آبادی	محمد حسن
3. نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری	ڈاکٹر سید طلعت حسین نقوی
4. نظیر شناسی	ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ / ڈاکٹر محمد علی اثر
5. مجلہ غالب نامہ (نظیر اکبر آبادی نمبر)	دہلی، جنوری، 2010

اکائی4: اردو نظم اور ہیئت کے تجربے

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 ہندوستانی نظم کی ہیئتیں
4.2.1 پابند نظم
4.2.2 گیت
4.2.3 دوہا
4.2.4 ثلاثی
4.2.5 ماہیا
4.2.6 چاربیت
4.2.7 ترویني / تکونی
4.3 بیرونی نظم کی ہیئتیں
4.3.1 معریٰ نظم
4.3.2 آزاد نظم
4.3.3 نثری نظم
4.3.4 سانیٹ
4.3.5 ترائیلے
4.3.6 ہائیکو

4.4 اکتسابی نتائج

4.5 کلیدی الفاظ

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

اس اکائی میں ہم آپ کو اردو نظم کی مختلف ہیئتوں سے واقف کرائیں گے۔ اردو میں زیادہ تر ہیئتیں فارسی سے لی گئی ہیں۔ کہیں کہیں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اب وہ اردو ہی کی ہیئتیں متصور کی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں اور بیرونی ممالک کی زبانوں سے بھی اردو نے نظم کی کئی ہیئتیں لی ہیں، اس اکائی میں ہم ان ہیئتوں کی وضاحت کریں گے۔ ان کی مثالیں دی جائیں گی اور اس اکائی کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ بطور نمونہ امتحانی سوالات بھی درج کیے گئے ہیں۔ نئے الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں اور مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ اکتسابی مواد کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔ توقع ہے ان سب سے استفادہ کیا جائے گا۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اردو نظم کی عام ہیئتوں پر روشنی ڈال سکیں۔
- ہندوستانی زبانوں کی ہیئتوں مثلاً گیت، دوہا، ماہیا پر گفتگو کر سکیں۔
- بیرونی زبانوں کی ہیئتوں جیسے معریٰ نظم، آزاد نظم، سانیٹ، ترائیلے اور ہائیکو تجزیہ کر سکیں۔

4.2 ہندوستانی نظم کی ہیئتیں

اردو شاعری پر فارسی شاعری کے اثرات ہیں۔ اردو نے فارسی شاعری سے کئی ہیئتوں کو من و عن لے لیا ہے۔ رباعی ' قطعہ 'مثنوی اور پابند نظم وغیرہ۔ ہمارے شاعروں نے ان ہیئتوں میں اپنے طور پر کہیں کہیں تبدیلی ضرور کرلی ہے ' جیسے قطعات میں اپنے ذوق و ذہن کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلی سے کام لیا ہے، لیکن رباعی کے چوبیس اوزان اپنی جگہ قائم ہیں۔ بعض شاعروں کی اور ایسے ویسے

شاعر کی نہیں غالب اور اقبال جیسے شاعروں کی بعض رباعیاں متنازعہ فیہ ہیں کہ ان کو رباعی کہا جائے یا نہیں۔ بہر کیف ان ہیئتوں کے بارے میں علحدہ علحدہ اختصار کے ساتھ لیکن جامع انداز میں گفتگو کی جائے گی۔ یہاں ایک بات کی صراحت ضروری ہے۔ ہمارا موضوع یہاں تکنیکی ہیئتیں ہیں، موضوعی ہیئتیں نہیں۔ قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ موضوعی ہیئتیں ہیں۔ ان کا تکنیک سے تعلق نہیں، لیکن مرثیہ روایتی طور پر مسدس کی صنف سے وابستہ ہو چکا ہے لیکن غالب، حالی اور اقبال وغیرہ نے غزل اور پابند نظم کی صورت میں مراثی کہے ہیں۔ ایک اور بات یہ کہ اردو میں کئی تکنیکی ہیئتیں ہیں، جیسے مستزاد اور ترجیع بند وغیرہ، جن کا مطالعہ آپ پہلی اکائی میں کر چکے ہیں۔ یہاں پر ہم مروجہ ہیئتوں کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

4.2.1 پابند نظم:

پابند نظم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ردیف، قافیہ اور بحر کے مقررہ اوزان کی پابندی کی جاتی ہے۔ پابند نظم میں نہ موضوعات کی قید ہوتی ہے اور نہ اشعار کی تعداد کی۔ شاعر کسی بھی موضوع پر اور جتنی چاہے تعداد میں اشعار کہہ سکتا ہے۔ بعض شاعروں نے چار چھ اشعار پر مشتمل پابند نظمیں بھی کہی ہیں۔ اردو شاعری کا بڑا حصہ پابند نظموں پر مشتمل ہے۔ ابتدا سے لے کر تا حال تقریباً تمام شاعروں نے پابند نظم نگاری کی ہے اور آج بھی آزاد اور معریٰ نظموں کے باوجود پابند نظم نگاری بھی چلن میں ہے۔ ہم یہاں جوش ملیح آبادی کی ایک پابند نظم ”بدلی کا چاند“ درج کر رہے ہیں۔

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاند ی کے ورق برسانے لگا

وہ سانولے پن پر میداں کے ، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے ، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں ، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیئے ، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا ، تو گردوں ، دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا 'تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا ' تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جھانکا گردوں کے' امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے' کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا' دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی' میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی' ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑادی' سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوش نور و ظلمت ہے' کیا قید ہے' کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

4.2.2 گیت:

گیت ہندی الاصل صنف شاعری ہے۔ اردو پر ہندی کے جو اثرات ترتیب پائے ہیں اس کا ایک نتیجہ گیت بھی ہے جس کو اردو میں بغایت مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ اردو میں گیت ہندی بحروں ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ نظم کی طرح گیت میں کسی موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ اس میں ہر نوع کے موضوع پر طبع آزمائی کی جاسکتی ہے۔ گیت میں محبت اور نغمگی کے عناصر کی آمیزش ہوتی ہے اور اس کا مزاج ان عناصر سے تشکیل پاتا ہے جن میں نسائیت ہوتی ہے۔ غنائیت' گیت کے لیے لازمی ہے اور ترنم' جھنکار اور تھاپ اس کی خصوصیات ہیں۔ اس کا اپنا ایک تہذیبی مزاج ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ پڑھنے کی نہیں سننے کی چیز ہے۔ یہی سبب ہے کہ نظموں کے مقابلہ میں گیت زیادہ گائے جاتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خان کا یہ گیت دیکھیے:

چاند ستارو جاؤ
میرا سویرا لاؤ

رات کے اس کالے آنچل سے
رتنوں کے اس شیش محل سے
ڈھونڈ کے لاؤ مت شرماؤ

جاؤ ستارو جاؤ
میرا سویرا لاو

چاند سے بھی کہہ دینا دیکھے
لیکن تم آنا سنگ لے کے
رات نگوڑی لاکھ چھپائے
آنچل دھیرے سے سرکاؤ

جاؤ ستارو جاؤ
میرا سویرا لاؤ

4.2.3 دوہا:

دوہا بھی ہندی شاعری کی ممتاز اور مقبول صنف ہے جو زمانہ قدیم سے تاحال اعتبار رکھتی ہے۔ اس کا آغاز ساتویں اور آٹھویں صدی کا زمانہ بتایا جاتا ہے۔ دوہرا اور دوپد اس کے دوسرے نام ہیں۔ دوہے کے دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں۔ اپ بھرنش میں قافیہ کا رواج دوہے سے شروع ہوا' ورنہ اس سے پہلے سنسکرت اور پراکرت میں قافیہ نہیں تھا۔ اس کے ہر مصرعے میں چوبیس ماترائیں ہوتی ہیں۔ مصرعے کے پہلے جزو میں تیرہ ماترائیں پھر وقفہ اور دوسرے جزو میں گیارہ ماترائیں۔ دوہا' دو مصرعوں کی اپنی مختصر ترین ہیئت کی وجہ سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ مختصر ہیئت کے باعث اس میں الفاظ اور ان کی نشست بر محل ہونی چاہیے۔ اسی طرح مضمون میں بھی دلکشی اور ندرت ضروری ہے ورنہ دوہے میں تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ دوہے میں لے کی بھی اہمیت ہے۔ معنوی تہہ داری اور برجستہ کلامی سے دوہے میں بانکپن پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح ایک عمر کی مشق و مزاولت کے بعد رباعی پر قدرت حاصل ہوتی ہے، اچھے اور فنی طور پر کامیاب دوہے' مشاق اور زبان و بیان اور فن پر قدرت رکھنے والے شاعر ہی کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں دوہا نگاری میں فی زمانہ جو نام ملتے ہیں ان میں سے چند ہیں: جمیل الدین عالی' ندا فاضلی' بھگوان داس اعجاز' اور پرتو روہیلہ۔ ندا فاضلی کے دو' دوہے درج ذیل ہیں:

سیدھا سادھا ڈاکیہ' جادو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے' آنسو اور مسکان

برکھا سب کو دان دے جس کی جتنی پیاس
موتی سی یہ سیپ میں' مٹی میں یہ گھاس

4.2.4 ثلاثی:

ثلاثی کو مثلث اور تثلیث بھی کہا گیا ہے۔ یہ تین مصرعوں پر مشتمل صنف سخن ہے جس کے تینوں مصرعے برابر ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی پہلا اور دوسرا، کبھی پہلا اور تیسرا اور کبھی تینوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور یہ تینوں مصرعے مل کر ایک اکائی بنتے اور ثلاثی کہلاتے ہیں۔ یہ اکائی ایک مکمل معنوی نظام کی حامل ہوتی ہے۔ اردو میں ثلاثی ایک باقاعدہ فنی ہیئت کی حیثیت سے مقبول رہی ہے۔ حمایت علی شاعر اجتبیٰ رضوی اور مشتاق جاوید وغیرہ کی ثلاثیاں پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشتاق جاوید کی یہ دو ثلاثیاں دیکھیے:

جلتا ہوا صحرا ہے	کس طرح بھلا کھلتا
اب صحن گلستاں میں	مفلس کی صداؤں سے
سبزہ ہے نہ سایہ ہے	مغرور کا دروازہ

4.2.5 ماہیا:

ماہیا، پنجابی شاعری کی صنف اور پنجابی تہذیب کا حصہ ہے۔ "ماہیے" بھی گائے جاتے ہیں۔ اس کا صحیح عمل دو اوزان پر مشتمل ہے جو یہ ہیں:

1. فعلن فعلن فعلن / فعلن فعلن فع / فعلن فعلن فعلن
2. مفعول مفاعیلن / فعل مفاعیلن / مفعول مفاعیلن

دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم ہوتا ہے۔ اگر تینوں مصرعے برابر ہو جائیں تو پھر ثلاثی ہو جائے گا۔ اردو میں ماہیوں کی روایت 1939ء سے ملتی ہے۔ ہمت رائے شرما، ساحر لدھیانوی، قمر جلال آبادی ابتدائی ماہیا نگار ہیں۔ قمر ساحری، نذیر فتح پوری، ناوک حمزہ پوری، شاہد ناز اور افضل عاقل نے ادھر خوب ماہیے لکھے ہیں۔ ذیل کے تین ماہیے ملاحظہ ہوں۔

دل لے کے دغا دیں گے
یار ہیں مطلب کے
یہ دیں گے تو کیا دیں گے

(ساحر لدھیانوی)

بارود پہ بیٹھی ہے
میرے زمانے کی
یہ فاختہ کیسی ہے

(نذیر فتح پوری)

وہ دور ہراساں ہے
آپ نہیں حضرت
ہر شخص پریشاں ہے

(قمر ساحری)

4.2.6 چار بیت:

چار بیت ایک چار سو سالہ قدیم پرفارمنگ آرٹ ہے۔ اس فن کو فنکاروں کا ایک پورا گروہ پیش کرتا ہے جس میں خاص طور پر گلوکار اور دف بجانے والے فنکار ہوتے ہیں۔ چار بیت جس میں چار "بیت" یعنی چار مصرعوں والے بند کی لمبی کڑی نظم کی شکل میں ہوتی ہے، جس کو فنکار پیش کرتے ہیں۔ یہ فن آج بھی، بھارت کے اتر پردیش کے رامپور، راجستھان کے ٹونک، مدھیہ پردیش کے بھوپال اور تلنگانہ کے حیدرآباد میں زندہ ہے۔ بھارت کی سنگیت ناٹک اکادمی نے اس فن کو بھارت کا ثقافتی اور روایتی فن قرار دیا ہے۔

اس کا ابتدائی دور سن عیسوی سات ویں صدی میں عرب کے علاقے میں رہا، اس دور میں اس کا نام "رجیز" تھا۔ لفظ چار بیت فارسی زبان سے ماخوذ ہے، جس کی معنی ہیں، چار مصرعے۔ ایک ایسی نظم جو طویل ہو اور چار بیت پر مشتمل ہو۔ اور اس نظم کو دف بجانے والے سنگت کے ساتھ، گلوکار گاتے ہیں۔ گلوکار یعنی نظم پڑھنے والے۔ دف ایک عربی ساز ہے۔ یہ فن ملک فارس سے آیا ہے۔ جو افغانستان ہوتے ہوئے بھارت آیا۔ اکثر اس فن کو فوجی گایا کرتے تھے۔ بالخصوص افغانی فوجی جو مغل فوج میں تھے اور بھارت آئے تھے۔ بھارت میں آنے کے بعد اس موسیقی کے فن میں اردو، ہندی اور برج بھاشا کی بولیاں گلوکاری میں شامل ہو گئی ہیں۔

چار بیت بھارت میں اپنے رواج میں نمایاں کمی دیکھ رہا ہے۔ اسے اردو کی کچھ تقاریب میں اس زبان کے درخشاں اور تابندہ تہذیب کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس فن کے موجودہ مرکزی علاقہ جات بھوپال، ٹونک، رامپور، امروہہ اور چاندپور ہیں۔ یہ قدیم دور میں قبائل کے پس منظر اور ان کی طاقت کو مقابلتاً پیش کرنے کے کام آتا تھا۔ اسے بھارت میں پٹھانی لوک گیت کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ موسیقی کی دنیا سے جڑے ماہرین نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ چار بیت گلوکاروں کی توانائی اور جوش و ولولہ فراہم کرتا ہے۔ اس میں راگوں اور جھوم کر کسی گلوکاری کے فن کو پروان چڑھانے سے کہیں زیادہ گلوکاروں کو اپنے فن کو شروع کرنے اور کسی اور جہت میں سامعین کو لے جانے میں معاون ہے۔ چار بیت کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

چار مصرعے ہوں بہم، ربط ہو ان چاروں میں
باہمی طنز و مزاح ہوتی رہے یاروں میں
یار نغمہ کہے اور دھوم ہو اغیاروں میں

اس قرینے کی ہو چربیت، دھکا پیل نہیں

(عبدالرحمٰن خاں منشی بھوپال)

4.2.7 ترِوینی / تکونی:

ثلاثی، ہائیکو اور ماہیا کی مانند "تِروینی" بھی تین مصرعوں پر مشتمل نظم ہے۔ مشہور فلم ڈائریکٹر اور ادیب گلزارؔ نے اس کے مؤجد ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مَیں نے شاعری میں ایک نئی فارم (Form) پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس کا نام تروینی رکھا۔ یہ ہائیکو بھی نہیں، مثلث بھی نہیں، تیسرا مصرع روشن کی طرح کھلتا ہے۔ اس کی روشنی میں پہلے شعر کا تاثر بدل جاتا ہے۔ تیسرا مصرع کومنٹ (Comment) بھی ہوسکتا ہے، اضافہ بھی۔ تروینی میں ایک شوخی اور Surprise کا رنگ ہے۔"

(سلطانہ مہر (مرتبہ) "سخنور" حصہ دوم۔ ص۔ 383 اور 384)

تین مصرعوں کی جو اصناف اردو میں رائج ہیں، ان کی بہ نسبت اردو تروینی میں بات کہنے کی گنجائش زیادہ نظر آتی ہے اور اس میں قاری کے لیے لطف اور دلچسپی کا عنصر بھی زیادہ ہے۔ اسی لیے ہندی کے صف اول کے شاعر ہرونش رائے بچن اور اردو کے بلند پایہ ادیب و شاعر احمد ندیم قاسمی نے اس صنف کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے گلزار کی کوششوں کو سراہا ہے۔ گلزار کی تروینی کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

سب پہ آتی ہے سب کی باری ہے
موت انصاف کی علامت ہے
زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی؟

کیا پتا کب کہاں سے مارے گی
بس کہ میں زندگی سے ڈرتا ہوں
موت کا کیا ہے ایک بار مارے گی

اُف! یہ بھیگا ہوا اخبار
پیپر والے کو کل سے چینج کرو
پانچ سو گائوں بہہ گئے اس سال

ترویج کا اپنا حسن اور اپنا ایک ذائقہ ہے۔ اسی لیے بچن جی اور قاسمی صاحب کے علاوہ شاعری کے بہت سے عام قارئین اور سامعین نے بھی اسے پسندیدگی کی سند عطا کی ہے۔

4.3 بیرونی نظم کی ہیئتیں

اردو نے اپنے لچکدار رویے کی بدولت ہندوستانی زبانوں ہی سے نہیں بیرونی ملک کی زبانوں سے بھی الفاظ' اصناف' اسالیب اور آداب کے تعلق سے لین دین کیا ہے جس سے اردو کے شعری سرمایہ میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ بیشتر بیرونی ہیئتوں نے اردو میں اعتبار نہیں پایا لیکن یہ کوشش محض رائیگاں بھی نہیں گئی اردو کا شعری منظرنامہ بھرپور' منور اور معطر ضرور ہوا۔ آیئے ہم اردو میں ایسی بیرونی ہیئتوں کا بھی جائزہ لیں۔

4.3.1 معریٰ نظم:

معریٰ نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں وزن بھی ہوتا ہے اور ارکان بحر کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔ البتہ اس میں قافیہ اور ردیف سے کام نہیں لیا جاتا۔ چوں کہ یہ قافیے سے عاری ہوتی ہے اس لیے ابتداً اس کو غیر مقفی کہا گیا لیکن بعد میں معریٰ نظم کی اصطلاح کو سب نے تسلیم کر لیا۔ اردو میں پہلی بار 1875ء میں لاہور میں انجمن پنجاب کے تحت ایسا مشاعرہ منعقد ہوا جس میں طرحی مصرعہ دینے کے بجائے موضوع دیا گیا اور قافیہ ردیف کی تحدید ختم کر دی گئی۔ اردو میں معریٰ شاعری کا پہلا نمونہ مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں ملتا ہے۔ بعد میں ترقی پسند شاعروں نے بھی ردیف اور قافیوں کا استعمال ترک کیا اور معریٰ نظمیں کہنے لگے۔ اور پھر تو یہ ایک مزاج' ایک رواج سا بن گیا۔ اردو میں معریٰ نظم کا سرمایہ اتنا وافر نہ سہی لیکن خاطر خواہ ضرور ہے۔ ہمارے ممتاز اور صف اول کے شاعروں نے بھی اس ہیئت کو اختیار کیا۔ اخترالایمان کی یہ نظم ''کل کی بات'' ملاحظہ ہو، جو نظم معریٰ کی ہیئت میں ہے :

ایسے بیٹھے تھے ادھر بھیا تھے دائیں جانب
ان کے نزدیک بڑی آپا شبانہ کو لیے
اپنی سسرال کے کچھ قصے' لطیفے' باتیں
یوں سناتی تھیں ہنسے پڑتے تھے سب
سامنے اماں وہیں کھولے پٹاری اپنی
منھ بھرے پان سے سمدھن کی انھی باتوں پر
جھنجھلاتی تھیں کبھی طنز سے کچھ کہتی تھیں

ہم کو گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں، نعیمہ، شہناز
وقفے وقفے سے کبھی دونوں میں چشمک ہوتی
حسب معمول سنبھالے ہوئے خانہ داری
منجھلی آپا کبھی آتی تھیں کبھی جاتی تھیں
ہم سے دور اباّ اسی کمرے کے اک کونے میں
کاغذات اپنی اراضی کے لیے بیٹھے تھے
یک بیک شور ہوا، ملک نیا، ملک بنا
اور اک آن میں محفل ہوئی درہم برہم
آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب
تقویت ذہن نے دی، ٹھہرو، نہیں خون نہیں
پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی

4.3.2 آزاد نظم:

آزاد نظم بھی مغرب سے لی گئی ہیئت ہے اور اردو میں یہ ہیئت بے حد قبولیت رکھتی ہے۔ اس میں قافیہ ردیف کی پابندی نہیں ہوتی، بحر کی بھی تحدید نہیں لیکن ایسا نہیں کہ اس میں بحر نہیں ہوتی۔ بحر کے ارکان اور اس کے اوزان یا صوتی بندشوں کی پابندی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ معریٰ نظم میں بحر کے مقررہ اوزان استعمال ہوتے ہیں یعنی اگر پہلے مصرعہ میں بحر کے چار ارکان استعمال ہوئے ہیں تو اس کی پابندی نظم کے ہر مصرعے میں ہوتی ہے جب کہ آزاد نظم میں ارکان بحر کی تعداد ہر مصرعے میں متعین نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مصرعے چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔ فرض کیجیے کسی نظم کے پہلے مصرعے کی بحر میں چار بار فاعلن کی تکرار ہوئی ہے۔ نظم آزاد میں بعد کے مصرعوں میں کہیں ایک کہیں دو، کہیں تین، کہیں چار اور کہیں چھ بار فاعلن کا استعمال ہو سکتا ہے۔ مخدوم محی الدین کی نظم ''سناٹا'' ملاحظہ ہو:

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ سنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل

نہ کسی سانس کی گرمی

نہ بدن

ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتّا کھڑکے

کوئی پگھلا ہوا موتی

کوئی آنسو

کوئی دل

کچھ بھی نہیں

کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر

کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

4.3.3 نثری نظم:

نثری نظم انگریزی کی Prose Poem کی تقلید ہے۔ نثری نظم میں ردیف، قافیہ، وزن اور بحر کسی کی قید نہیں۔ ہاں ایک آہنگ ضروری ہے جس سے نثری شاعری پر رنگ آتا ہے۔ بعض اوقات غیر ارادی طور پر مصرعے اوزان کے تحت آجاتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں۔ ہاں شعریت اور غنائیت ضروری ہے اور یہ شاعر کے شعری رویے پر منحصر ہوتی ہے۔ اردو میں نثری شاعری پر یوں تو کئی لکھنے والوں نے توجہ دی لیکن میر علی زیدی، سجاد ظہیر اور خورشید الاسلام کے نام نمایاں ہیں جن کے مجموعے علی الترتیب "پگھلا نیلم"، "کاسۂ روح" اور "جستہ جستہ" ہیں۔ علی اور خورشید الاسلام کی ایک ایک تخلیق دیکھیے:

ننگوں

اور بھوکوں کا

یہ انسانی کوڑا کرکٹ

سڑک پر

کس نے بکھیرا ہے؟

(سید علی زیدی)

اگر

انسان کی

آنکھ نہ ہوتی

تو کائنات اندھی ہوتی

(خورشید الاسلام)

4.3.4 سانیٹ:

سانیٹ مغرب میں غنائی داخلی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے۔ یہ چودہ (14) مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال کو دو بندوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے پہلے بند میں آٹھ اور دوسرے بند میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے بند میں خیال کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور دوسرے میں اس کی تکمیل کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں پہلا بند 12 مصرعوں پر اور دوسرا بند 2 مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر کل مصرعوں کی تعداد 14 سے زیادہ نہیں ہوتی۔ سانیٹ میں قافیہ کی پابندی ہے لیکن یہاں تفصیل میں گئے بغیر یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ قافیوں کی یہ ترتیب بدلتی رہتی ہے۔ سانیٹ میں بحر کی پابندی نہیں لیکن اطالوی اور انگریزی شعرا نے خصوصاً ایسی بحریں استعمال کی ہیں جو نہ طویل ہیں اور نہ مختصر۔ کیوں کہ چھوٹی بحروں میں خیال کا ارتقا دشوار ہو جاتا ہے تو طویل بحروں میں تعقید یا تکرار کے پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اردو میں عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، راشد اور میراجی وغیرہ نے اس طرف توجہ دی۔ عزیز تمنائی بھی اہم نام ہے جن کے سانیٹوں کا مجموعہ ''برگ نوخیز'' شائع ہو چکا ہے۔ ''برگ نوخیز'' میں ''ٹیگور'' کے زیر عنوان یہ سانیٹ شامل ہے:

سفید ریش مسافر نے گیت گائے تھے\
سرائے دہر کے اک پر بہار گوشے میں\
تصورات کے افسوں طراز سایے میں\
بیک نگاہ، فسانے کئی سنائے تھے\
لرزتے ہاتھ میں مضرابِ شاخ گل لے کر\
وفور شوق میں سازِ حیات چھیڑا تھا\
حریم ناز کا اک ایک راز کھولا تھا\
پروئے سلک تخیل میں تابدار گہر\
نہ جانے کونسی بستی کو چل دیا راہی\
ابھی بہاروں کے ہونٹوں پہ اس کے نغمے ہیں\
کلی کلی کے تبسم میں شوخ جلوے ہیں\
چمن چمن ہے اسی کی صدائے صبح گہی\
سرائے دہر میں ہر ایک سمت گونجیں گے\
سفید ریش مسافر کے سرمدی نغمے

4.3.5 ترائیلے:

ترائیلے فرانسیسی شاعری کی مقبول صنف ہے۔ یہ ایک طرح کا بند ہے اور اس ایک بند میں ہی نظم مکمل ہو جاتی ہے۔ ترائیلے صرف آٹھ مصرعوں پر مشتمل نظم ہوتی ہے اور اس میں صرف دو قافیے استعمال ہوتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص ترتیب سے۔ یہ ترتیب کچھ ایسی ہوتی ہے۔الف' ب' الف الف الف' ب' الف' ب۔اس ترتیب سے ہم قافیہ مصرعوں کی یہ صورت سامنے آتی ہے۔پہلا' تیسرا' چوتھا' پانچواں' ساتواں مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے اور دوسرا'چھٹا' آٹھواں مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اردو میں ترائیلے کو خاص مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔رؤف خیر کا یہ ترائیلہ ہے، جس کا عنوان " پس و پیش "ہے، ملاحظہ کیجیے :

مجھے گھر لوٹ جانا چاہیے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)
یہی نا' آب و دوانہ چاہیے تھا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہیے تھا
تھکن میں کچھ ٹھکانہ چاہیے تھا
کہیں سائے میں رک جایا کروں گا
مجھے گھر لوٹ جانا چاہیے تھا
(مگر اب لوٹ کر بھی کیا کروں گا؟)

4.3.6 ہائیکو:

ہائیکو ایک قدیم جاپانی صنف ہے لیکن یہ اردو میں انگریزی کے توسط ہی سے آئی۔ یہ صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور شرط یہ ہے کہ تینوں مصرعوں کے جملہ 17 ارکان (Syllable) ہوں اور ان کی ترتیب 5+7+5 ہو۔ بعض نے ارکان کی ترتیب 4+8+5 بھی قرار دی ہے۔ اختصار کے باوجود ہائیکو میں ایسا لفظی پیکر پیش کیا جاتا ہے کہ دیکھی ہوئی یا محسوس کی ہوئی کوئی شئے نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ جہاں تک مواد اور موضوع کا تعلق ہے ہائیکو ابتدا ہی سے فطرت' مظاہر فطرت اور مشاہدہ فطرت سے جڑی ہوئی ہے۔ اردو میں علیم صبانویدی' اظہرادیب' محمد امین' بشیر سیفی اور نصیر احمد ناصر کے ہائیکو پڑھنے کو ملتے ہیں۔ علیم صبانویدی کے دو ہائیکو پڑھیے:

روشنی میں سیاہیوں کا سفر
آسمانوں پہ لاش سورج کی
وقت کے ہاتھ میں کھلا خنجر

آنگن آنگن خلوص کے چہرے
گھر کی دہلیز تک وفا کی بات
اور بازار میں غلط چہرے

4.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اردو شعر وادب بالخصوص شاعری پر فارسی شعر وادب کے اثرات زیادہ ہیں۔
- اردو شاعری نے فارسی سے کئی ہیئتوں کو من وعن لے لیا ہے۔
- اردو کی شعری ہیئتوں میں غزل سے صرف نظر کرلیں تو پابند نظم کو اردو شاعری پر حاوی پائیں گے۔
- پابند نظم میں ردیف، قافیہ اور بحر وغیرہ کی پابندی کی جاتی ہے لیکن اس میں موضوعات اور اشعار کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔
- اردو نے دیگر زبانوں سے بھی ہیئتیں لی ہیں جیسے ہندی سے گیت اور دوہا کی ہیئت وغیرہ۔
- ماہیا پنجابی شاعری کی ہیئت اور پنجابی تہذیب کا حصہ ہے۔ اس کا صحیح عمل دو اوزان پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے گائی جانے والی ہیئت ہے۔
- اردو نے بیرونی زبانوں کی ہیئتوں کو بھی اپنایا ہے جیسے نظم معریٰ، جس کے مصرعوں میں وزن بھی ہوتا ہے اور ارکان بحر کی پابندی بھی کی جاتی ہے۔
- سانیٹ چودہ مصرعوں کی ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی خیال کا پھیلاؤ اور دوسرے بند میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے۔
- ترائیلے فرانسیسی شاعری کی مقبول صنف ہے۔ یہ آٹھ پر مصرعوں مشتمل ایک طرح کا بند ہے۔ اس میں صرف دو قافیے ایک خاص ترتیب سے ہوتے ہیں۔
- ہائیکو جاپانی صنف ہے، جو انگریزی کے توسط سے اردو میں آئی جو صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔
- نثری نظم میں ردیف، قافیہ اور بحر کسی کی قید نہیں لیکن آہنگ ضروری ہے۔ اسی طرح اس میں مصرعوں اور موضوعات کی قید نہیں لیکن شعریت یا غنائیت سے کام لینا ہوگا۔ اسی سے نثری شاعری پر نکھار آتا ہے۔

4.6 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی
من وعن	:	حرف بہ حرف، جوں کا توں
مزاولت	:	کسی کام کو ہمیشہ کرنا

رائیگاں	:	بیکار
اخذ واکتساب	:	کسی سے لینا، حاصل کرنا
تحدید	:	پابندی
رد	:	انکار
وافر	:	زیادہ
مروجہ	:	رائج شدہ
خورشید	:	سورج
ظلمت	:	تاریکی، اندھیرا
کاوش	:	کوشش
گیتی	:	دنیا
جستجو	:	تلاش
حباب	:	بلبلہ
خسیس	:	کنجوس

4.7 نمونۂ امتحانی سوالات

4.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. اردو کی ہیئتیں زیادہ تر کس زبان سے لی گئی ہیں؟
2. ترائیلے میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟
3. چاربیت کس ملک کی صنف ہے؟
4. نظم "کل کی بات" کسی ہیئت میں لکھی گئی ہے؟
5. دوہا بنیادی طور پر کس زبان کی صنف ہے؟
6. گیت کس صنف شاعری سے اردو میں آیا؟
7. آزاد نظم کی ہیئت کس ملک سے لی گئی ہے؟
8. فرانسیسی شاعری کی مقبول صنف کا نام کیا ہے؟
9. ہائیکو کس ملک کی صنف ہے؟

10. "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" کسی کی تصنیف ہے؟

4.7.2 مختصر جوابات کے حامل والے سوالات:

1. پابند نظم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ اظہار خیال کیجیے۔
2. ثلاثی کی تعریف مع مثال بیان کیجیے۔
3. ہندی اور پنجابی کی جو ہیئتیں اردو میں رائج ہیں، ان پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. نثری نظم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔
5. ہائیکو کس زبان کی ہیئت ہے؟ اس کے بارے میں لکھیے۔

4.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اردو کی مروجہ ہیئتوں کے بارے میں مضمون قلم بند کیجیے۔
2. اردو میں بیرونی ممالک کی ہیئتوں کے بارے میں لکھیے۔
3. اردو نظم اور ہیئت کے تجربے پر مفصل نوٹ لکھیے۔

4.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اردو شاعری میں نئے تجربے	علیم صبا نویدی
2. اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	عنوان چشتی
3. اصناف سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد
4. ادبی اصناف	گیان چند جین
5. جدید اردو نظم: نظریہ اور عمل	عقیل احمد صدیقی

بلاک II : اردو میں نظم جدید

اکائی 5 : اردو نظم اور انجمن پنجاب

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 اردو نظم اور اس کی روایت ما قبل انجمن پنجاب

5.3 انجمن پنجاب

5.3.1 قیام

5.3.2 اغراض و مقاصد

5.4 انجمن پنجاب کی خدمات

5.4.1 ادبی اجلاس اور لیکچرس

5.4.2 نظمیہ مشاعرے

5.5 جدید نظم کی تحریک

5.5.1 نیچرل (فطری) شاعری

5.5.2 وطنی شاعری

5.5.3 اخلاقی اور اصلاحی شاعری

5.6 جدید اردو نظم کے معمار

5.6.1 الطاف حسین حالی

5.6.2 محمد حسین آزاد

5.7 اکتسابی نتائج
5.8 کلیدی الفاظ
5.9 نمونہ امتحانی سوالات
5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

1857 کے خون آشام واقعات کے کچھ عرصے بعد برطانوی حکومت کی حکمت عملی میں تبدیلی کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ حکومتی نمائندوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستانی اشرافیہ کی طرف دستِ تعاون بڑھایا جائے اور اس مقصد کے لیے ملک میں نئی انجمنوں اور اداروں کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی۔ دراصل یہ انجمنیں حکومت اور عوام کے درمیان نفرت کو کم کرنے اور ان کی تعلیمی ترقی کے لیے بنائی جا رہی تھیں اسی قسم کی ایک انجمن لاہور میں "انجمن پنجاب" 21 جنوری 1865ء میں قائم کی گئی تھی اس انجمن کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر لائٹنر کا انتخاب ہوا، جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر میکلوڈ اس کے سرپرست اعلیٰ تھے۔ لاہور کے ذی حیثیت لوگ اور اہل علم و دانش اس انجمن کے اراکین میں شامل تھے۔ انجمن کے پہلے اجلاس میں حکومت پنجاب کے اعلیٰ سرکاری افسران، لاہور کے مقتدر خاندان اور علماء اس میں شریک رہے۔ انجمن کے قیام کے بعد علمی، ادبی، اصلاحی اور نئے سائنسی علوم پر مضامین پڑھے جانے کا آغاز ہوا۔ انجمن پنجاب کے پروگرام میں جدید علوم کے علاوہ مشرقی علوم و فنون اور ادبیات کی طرف بھی خاصی توجہ دی گئی اور یہ بات انجمن کے بنیادی لائحہ عمل کا نمایاں حصہ تھی۔

1874ء انجمن کی تاریخ کا ایک اہم سال تھا کیوں کہ ہالرائیڈ نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نئے مشاعروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں شعرا سے گزارش کی گئی کہ نے فطرت اور مناظر پر نظمیں لکھیں۔ مدارس کے نصاب میں قدیم عشقیہ شاعری کی جگہ مناظر فطرت پر نئی نظمیں لکھوا کر شامل نصاب کی گئیں۔ حالی اور آزاد نے ان مشاعروں میں یادگار نظمیں پڑھیں۔ ہندوستان بھر میں ان مشاعروں کا شہرہ رہا۔ ان مشاعروں میں جس طرز کی نظمیں پڑھی گئیں اس سے جدید نظم نگاری کو استحکام پہنچا۔ اور جدید نظموں میں فطری یا نیچرل شاعری کی ابتداء ہوئی۔ محمد حسین آزاد جنھوں ان مشاعروں سے پہلے اپنے لکچرس میں نظم نگاری کی اہمیت اور روایت پر روشنی ڈالی اور اس طرز کی نظمیں لکھ کر عملی ثبوت بھی فراہم کیا۔ اس کارواں میں جب حالی شامل ہوئے تو جدید نظم کی سمت و رفتار میں تیزی آئی۔ اس کے علاوہ پیارے لال آشوب اور مولوی کریم الدین وغیرہ کی خدمات بھی شامل تھیں۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- اردو نظم کی روایت بیان کر سکیں ۔
- جدید نظم اور انجمن پنجاب پر گفتگو کر سکیں۔
- جدید نظم کی ترقی میں انجمن پنجاب کی خدمات کو واضح کر سکیں ۔
- جدید نظم کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔
- انجمن پنجاب میں حالی اور آزاد کی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔

5.2 اردو نظم اور اس کی روایت ما قبل انجمن پنجاب

لغات کے لحاظ سے نظم کے معنٰی "موتی پرونا" کے ہیں یعنی ایک لڑی میں موتیوں کو پرونا۔ اصطلاحِ شعر میں نظم سے مراد وہ صنف سخن ہے جو غزل کے مد مقابل رکھی جائے۔ نظم کے دائرہ کار میں اُردو شاعری کی جملہ اصناف جیسے قصیدہ مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن وغیرہ آتے ہیں۔ صرف غزل کا دائرہ اس سے الگ ہوتا ہے۔ نظم اور غزل کا بنیادی فرق اس کی مخصوص ہیئت ہوتی ہے۔ غزل کے بر خلاف نظم کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی بلکہ غزل کی ہیئت میں بھی نظم کہی جاسکتی ہے۔ جسے عام طور پر غزلِ مسلسل کا نام دیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی غزلیں اسی فارم میں لکھی گئی ہیں۔ غزل کا ہر شعر معنوی لحاظ سے انفرادی حیثیت رکھتا ہے اس کے بر خلاف خیال، معنی و مفہوم کا تسلسل نظم میں شروع سے آخر تک رواں رہتا ہے۔ نظم میں، فکر و خیال اور جذبہ و واقعہ کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ نظم کی بے شمار اشکال و اقسام ہیں جو روایتی اور پابند نظم کہلاتی ہیں۔ نظموں میں بعض ہیئت اور بعض موضوع کے اعتبار سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہیئت کے سلسلہ میں بیسویں صدی کے نظم نگاروں نے مقفیٰ، پابند، معریٰ، آزاد، اور نثری ہر طرح کی ہیئت کو اختیار کیا ہے۔

اردو نظم کے ارتقاء پر نظر ڈالیں تو یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ صوفیائے کرام کی منظوم تحریریں دراصل نظم کی ابتداء ہیں۔ گجری اور دکنی دور میں بھی اس طرح کی نظمیہ شاعری ملتی ہے۔ اگر چہ ان ادوار کی نظمیہ شاعری زیادہ تر پابند یعنی بحر اور قافیہ سے مزین ہوا کرتی تھی۔ دکن کے قدیم شعراء نے نظم نگاری میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اس سلسلہ میں قلی قطب شاہ اور ان کے معاصرین کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ شمالی ہند میں ابتداء میں نظموں کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اس دور میں محمد افضل، جعفر زٹلی کے بعد حاتمؔ، آبروؔ، اور فائزؔ کی نظمیں قابل ذکر سمجھی جاتی ہیں۔ اردو شاعری کے زریں دور میں میر اور سودا کے مثنویاں اور قصیدے، پابند نظم کی مثالیں ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اُردو نظم کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کو کلیم الدین احمد جیسے نقاد نے اردو شاعری کا درخشندہ ستارہ کہا تھا۔ نظیر نے موضوعاتی نظمیں تخلیق کرتے ہوئے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔

انقلاب 1857 کی ناکامی اور انگریزی حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد ہندوستان میں سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کے اثرات دکھائی دینے لگے اور اردو شعر وادب کو نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی عہد میں انجمن پنجاب کی تحریک کے زیرِ اثر جدید نظم نگاری کی ابتداء ہوئی۔ حالی اور آزاد نے اس تحریک میں اہم رول ادا کیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ شعراء میں جدید نظم گوئی کا رجحان پیدا ہو۔ اگرچہ زیادہ تر نظمیں قدیم اصناف میں تخلیق کی گئیں۔ تاہم اس دور میں ہیئت کے تجربے محدود پیمانے پر ہوئے۔ مگر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں، اسماعیل میرٹھی، شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال وغیرہ نے اس صنف میں عمدہ تخلیقات پیش کرتے ہوئے اس صنف کو ترقی دی۔ علامہ اقبال نے نظم کو اوجِ ثریا پر پہنچایا تو اکبر الہٰ آبادی نے طنز وظرافت کی چاشنی سے اُردو نظم نگاری کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ غرض بیسویں صدی کے ابتدائی ربع صدی ہی میں جدید نظم نگاری کو اعتبار حاصل ہوا۔ اس دور میں، چکبست، شوق قدوائی، نظم طباطبائی، ظفر علی خاں، سیماب اکبر آبادی، جوش، حفیظ جالندھری وغیرہ نے نظم نگاری کو مزید بلندی ووسعت عطا کی۔

5.3 انجمن پنجاب

1857 کی ہنگامہ خیزی کے بعد ملک میں افراتفری کا ماحول پیدا ہوا۔ اس افراتفری کے بعد زندگی کو راہِ اعتدال پر لانے کے لیے انگریزی حکومت نے مختلف علاقوں اور صوبہ جات جیسے کلکتہ، بمبئی، دہلی، بنارس، لکھنو، شاہ جہاں پور، بریلی وغیرہ میں علمی اور ادبی ادارے قائم کیے۔ ایسے ہی اداروں میں ایک ادارہ انجمن اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب" لاہور میں قائم ہوا" جو بعد ازاں "انجمن پنجاب" کے نام سے مشہور ہوا۔

5.3.1 قیام:

"انجمن پنجاب کی بنیاد 21 جنوری 1865ء میں رکھی گئی۔ جس کے لیے ڈاکٹر لائٹنر (Dr. Lightner) نے اہم کردار ادا کیا۔ لاہور میں جب گورنمنٹ کالج کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کے اولین پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر مقرر ہوئے۔ انھوں نے مشرقی علوم وفنون میں دلچسپی لیتے ہوئے اس علاقے کی تعلیمی اور سماجی احیاء کا بیڑہ اٹھایا۔ لائٹنر کو معلوم تھا کہ لارڈ میکالے کی حکمت عملیاں ناکامی کا شکار ہو رہی ہیں۔ میکالے انگریزی زبان کے ذریعے علوم وفنون سیکھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا ان ناکامیوں کو کامیابیوں میں بدلنے کے لیے لائٹنر نے "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" کی بنیاد رکھی۔ پنڈت من پھول کی صدارت میں منعقدہ اجلاس میں ڈاکٹر جی۔ ڈبلو لائٹنر کو اس انجمن کا صدر منتخب کیا گیا جو ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے اور ان کی اردو نوازی کے چرچے بھی تھے۔ منشی ہرسکھ رائے کو معتمد شعبۂ فارسی اور بابو نوین چندرائے کو معتمد انگریزی منتخب کیا گیا۔ محققین کے مطابق 43 حضرات اس کے رکن کی منتخب ہوئے جن میں زیادہ تر سرکاری عہدے دار تھے۔ ان میں مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس لاہور، مولوی محمد حسین نائب سر رشتہ دار ڈائریکٹری پنجاب اور منشی گوپال داس سر رشتہ دار کمشنری لاہور کا نام شامل تھا۔

5.3.2 اغراض ومقاصد:

انجمن پنجاب کے اغراض ومقاصد میں:

1. حکومت اور عوام کے درمیان دوریوں کو کم کرنا۔
2. احیائے علوم وفنون۔
3. صنعت وتجارت کا فروغ۔
4. دیسی زبانوں کی ترقی۔
5. علوم جدید ومفیدہ کی اشاعت۔
6. سیاسی ومعاشرتی اور علمی وادبی ترقی اور مسائل کا حل۔
7. لیکچرس کا اہتمام کرنا۔
8. لائبریریوں اور مدارس کا قیام وغیرہ۔

ان مقاصد کی حصول یابی کے لیے مختلف علاقوں میں اسکولس، لائبریریوں، رسائل واخبارات کے قیام کے منصوبے بنائے گئے اور سماجی، تہذیبی، اخلاقی، انتظامی اور ادبی موضوعات پر مختلف پروگرام ترتیب دئے گئے۔ مظفر حنفی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر لائٹنر نے 20/ جنوری 1865 کو انجمن پنجاب قائم کی جس کے مقاصد میں مشرقی علم وحکمت کا احیاء، دیسی زبانوں کے ذریعے عوام کو پسندیدہ تعلیم کے لیے سہولتیں فراہم کرنا، بااثر طبقے اور حاکمانِ وقت کے درمیان روابط قائم کرنا اور سماجی، ثقافتی، ادبی وسائنسی موضوعات پر بحث مباحثوں کا بندوبست کرنا شامل تھا۔ اس انجمن نے آگے چل کر جدید علوم کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے تحت ایک پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کیا گیا۔ دیسی زبانوں میں رسالے نکلے، تراجم شائع کئے گئے۔ مصنفوں، مولفوں، مدیروں اور مترجموں کو انعامات دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ممتاز علماء وفضلاء سے عام پسند موضوعات پر لکچروں کا اہتمام کیا گیا۔"

(محمد حسین آزاد، مظفر حنفی، ص20۔ ساہتیہ اکیڈمی، دہلی)

چند شرائط کے ساتھ انجمن پنجاب کی رکنیت دی جاتی تھی۔ ابتداء میں سرکاری ملازمین کے علاوہ شہر کی ذی اثر شخصیات نے رکنیت حاصل کی تھی مگر بہت جلد ڈاکٹر لائٹنر نے عوامی سطح پر رکن سازی کا کام شروع کیا۔ جس کی بدولت اس ادارے کے اراکین کی تعداد دو سو پچاس ہوگئی تھی۔ اس انجمن کے اعزازی سرپرست پرنس آف ویلز تھے جب کہ سرپرست گورنر پنجاب کو بنایا گیا تھا۔

5.4 انجمن پنجاب کی خدمات

انجمن پنجاب کا قیام اردو زبان وادب کے لیے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی کے بعد اہمیت کا حامل رہا۔ علی گڑھ

تحریک کی طرح انجمن پنجاب کی تحریک کا بھی اردو میں مغربی اثرات کو فروغ دینے کی کوشش میں نمایاں حصہ رہا۔اس ادارے کی خدمات کو عروج تک پہنچانے میں محمد حسین آزاد کا نام اور کام سر فہرست رکھا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:

"محمد حسین آزاد کی تعیناتی نے اس انجمن پنجاب کی تحریک کو نئی توانائی دی۔انھوں نے اس حیثیت میں اتنی عمدہ خدمات سر انجام دیں کہ ڈاکٹر لائٹنر آہستہ آہستہ انتظامی امور کے پس منظر میں اوجھل ہوتے گئے۔اور ادبی پیش منظر پر مولانا محمد حسین آزاد بتدریج نمایاں ہونے لگے۔"

(اردو ادب کی تحریکیں،ڈاکٹر انور سدید،انجمن ترقی بیورو کراچی،ص353)

انجمن پنجاب کا پندرہ سالہ (1865 تا1880) دور اردو زبان و ادب کے لیے نشاۃ الثانیہ کا دور کہلایا جاسکتا ہے۔اس عہد میں اردو ادبیات کے فروغ اور ترقی کی جو کاوشیں کی گئیں وہ نا قابل فراموش ہیں۔متعدد ادبی اور علمی تراجم اردو زبان میں کروائے گئے۔اس کے علاوہ اخبارات اور رسائل بھی شائع ہوئے اور مختلف علمی اور تعلیمی ادارے قائم کیے گئے اور ان میں مختلف کتب تصنیف و تالیف کی گئیں۔طلبہ کے لیے بھی مختلف درسی کتابوں کی تدوین انجام پائی۔ان کتابوں میں درسی کتاب، قصص ہند،جوہرِ عقل، منتخبات اردو، علم حرکت کے علاوہ علم الاخلاق، علم طب، کے علاوہ تاریخ، نفسیات، اخلاقیات وغیرہ پر سیکڑوں کتب اور مضامین تحریر کروائے گئے اور کچھ مضامین سر سید کے رسالے تہذیب الاخلاق سے بھی لیے گئے۔

5.4.1 ادبی اجلاس اور لیکچرس:

انجمن پنجاب کے تحت ہفتہ واری اجلاس ہوتے جس میں لیکچرس کا اہتمام کیا جاتا۔ان لیکچرس پر بحث و مباحث بھی ہوتے۔چنانچہ ابتداء ہی میں ان اجلاسوں کی گونج حکومت کے ایوانوں میں سنائی دینے لگی۔اس انجمن کے عام جلسوں میں پیش کردہ مضامین پر بحث و مباحث کی اجازت تھی۔جب کہ انتظامی امور پر مبنی اجلاس میں صرف عہدہ دار شرکت کرتے۔اس لیے بہت جلد اہل علم اس سے وابستہ ہونے لگے۔ان پروگراموں کو مقبولیت اور اہمیت حاصل ہوتی گئی۔اس انجمن کے ابتدائی پروگراموں میں ڈاکٹر لائٹنر، محمد حسین آزاد، پنڈت من پھول، بابو نوبین چندر رائے، بابو شاما چرن، مولوی عزیزالدین اور علمدار حسین وغیرہ نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اپنے مضامین پڑھے اور بہت جلد ان مضامین کو مطبوعہ شکل میں ترسیل وابلاغ کے مراحل سے گزارا گیا۔ان لیکچرس میں سب سے زیادہ محمد حسین آزاد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔انجمن پنجاب کے مشاعروں نے جس طرح جدید نظم کی بنیادیں استوار کیں اسی طرح اردو نثر بھی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی۔

انجمن کے زیر اہتمام نثر نگاروں نے مختلف موضوعات پر اردو میں مضامین تحریر کیے۔یہ مضامین جو حکومتِ پنجاب کے سرکاری رسائل و جرائد، اتالیق پنجاب اور پنجاب میگزین میں شائع ہوئے۔آگے چل کر ان مضامین کو کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔کرنل ہالرائیڈ کی فرمائش پر مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کی کتابیں قواعد اردو، قصص ہند اور نصیحت کے کرن پھول وغیرہ تصنیف کیں۔آزاد نے بچوں کے لیے درسی کتابیں بھی مرتب فرمائیں۔انجمن سے وابستگی کے دوران مولانا حالی نے بھی اردو نثر میں ایک مذہبی رسالہ لکھا۔اور چند

مضامین بھی تحریر کیے۔ بہر حال انجمن پنجاب نے اردو شعر و ادب کو جدید تقاضوں سے لیس کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کو ترقی کی راہ پر ڈالا جس کے برگ و بار بعد کے ادوار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انجمن پنجاب کے معماروں میں محمد حسین آزاد کا کردار سب سے نمایاں رہا۔ عملی طور پر ان کی اس انجمن سے وابستگی تھی۔ لہذا انھوں نے نہ صرف نظم جدید میں اضافے کیے بلکہ نثر میں بھی کئی ایک علمی اور ادبی کتابیں اور مضامین پیش کیے۔

5.4.2 نظمیہ مشاعرے:

فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی اور لاہور میں بھی گورنمنٹ کالج قائم کیے گئے۔ دہلی کالج کی مسدودی کے بعد لاہور میں ایک کالج کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے پرنسپل ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر کو مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے کرنل ہالرائیڈ (منتظم اعلیٰ سر اشتہ تعلیمات) کے ایماء پر 21 جنوری 1865ء کو "انجمن اشاعتِ مطالب مفیدہ پنجاب" قائم کیا۔ ڈاکٹر لائٹنر کو اس انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ آگے چل کر یہ انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے مشہور ہوئی، جس کے تحت مختلف لیکچرس اور مشاعروں کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان جدید مشاعروں کے بانی محمد حسین آزادؔ تھے، لیکن یہ درست نہیں۔ ان مشاعروں کا آغاز حکومت کے ایماء اور آزادؔ (مشاعروں کے معتمد)، ڈاکٹر لائٹنر (مشرقی زبانوں کے ماہر) اور کرنل ہالرائیڈ (سر اشتہ تعلیمات پنجاب) کاوشوں سے ہوا۔

انجمن پنجاب کا اولین مشاعرہ 30 مئی 1874ء کو منعقد ہوا۔ جس کا موضوع "برسات" تھا۔ آزادؔ نے اس مشاعرے میں "شبِ قدر" کے عنوان سے اپنی نظم پیش کی۔ اس مشاعرے میں محمد حسین آزادؔ کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالیؔ اور دیگر شاعروں نے بھی شرکت کرتے ہوئے اپنی اپنی نظمیں پیش کیں۔ حالیؔ نے اپنی مشہور نظم "برکھارُت" پیش کی۔ انجمن کا دوسرا مشاعرہ 20/ جون 1874ء کو بعنوان "زمستاں" منعقد ہوا۔ جس میں محمد حسین آزاد کے علاوہ مولوی علاؤالدین محمد کاشمیری، مولوی عمو جان ولیؔ دہلوی، مولوی عطاؔاللہ، مولوی اشرف بیگ خان اشرفؔ، منشی الٰہی بخش رفیقؔ، مولوی محمد مقربؔ علی، مولوی قادر بخش اور شاہ انور حسین ہماؔ، شامل تھے۔ تیسرے مشاعرہ میں حالی نے بھی شرکت فرمائی۔ اس مشاعرے میں آزاد کے علاوہ مولوی عموؔ جان دہلوی، مرزا محمد بیگ خان فکریؔ، مرزا محمد عبداللہ بیگ مضطرؔ، مرزا محمود بیگ راحتؔ، مولوی مرزا اشرف خان اشرفؔ، شاہ انور حسینؔ ہما، مولوی عطا اللہ خان عطاؔ اور شیخ الٰہی بخش رفیق نے شرکت فرمائی۔ یہ مشاعرہ 3/ اگست 1874ء کو منعقد ہوا تھا۔

یکم ستمبر 1874 ء کو انجمن پنجاب کے چوتھے مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس مشاعرے کے روح رواں حالی اور آزاد رہے۔ اس کے علاوہ دیگر شعراء میں انور حسین ہماؔ، شیخ الٰہی بخش رفیقؔ، مصر رام داس قابلؔ، مولوی عطااللہ خان عطاؔ، منشی علاؤالدین صافیؔ، لالہ گنڈا ملؔ اور سید اصغر علی لکھنوی حقیرؔ وغیرہ شامل تھے۔ اس مشاعرے کا عنوان "حب وطن" دیا گیا تھا۔ انجمن پنجاب کا پانچواں مشاعرہ 19/ اکتوبر 1874ء کو بہ موضوع "امن" منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں کوئی گیارہ شاعروں نے شرکت کی۔ آزاد کے علاوہ منشی لچھمن داس برہمؔ، مولوی گل محمد عالیؔ، مولوی شاہ محمد صادقؔ، مفتی امام بخشؔ، مصر رام داس قابلؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، سید اصغر علی حقیرؔ لکھنوی، مولوی سلطان علاؤالدین، محمد قریش حنفیؔ قادری صافی، مولوی عطاء اللہ خان عطاؔ اور مولوی عمو جان ولیؔ دہلوی شامل رہے۔ اس مشاعرے

سے حالی غیر حاضر رہے۔

"انصاف" کے موضوع سے منعقدہ چھٹا مشاعرہ 14 / نومبر 1874ء کو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں حالیؔ اور آزاد کے علاوہؔ مولوی محمد فصیح الدین رنجؔ، مولوی محمد شریفؔ، مصر رام داس قابلؔ، منشی لکشمن داس برہمؔ، میر انور حسین ہماؔ، اصغر علی حقیرؔ لکھنوی، ملا گل محمد عالیؔ، شیخ الٰہی بخش رفیقؔ، مفتی امام بخشؔ، مولوی محمد عطآء اللہ خان اور پنڈت کرشن ؔلال نے شرکت کی۔ بتاریخ 19 / دسمبر 1874ء کو منعقدہ ساتویں مشاعرے کا موضوع "مروت" تھا۔ اس مشاعرے میں آزاد کے علاوہ تیرہ شعرا نے شرکت کی۔ آٹھواں مشاعرہ، 30 / جنوری 1875ء کو بعنوان "قناعت" منعقد ہوا۔ جس میں شعراء کی تعداد بڑھ گئی۔ یعنی اٹھارہ شاعروں نے اس میں شرکت کی تھی۔ محققین کے مطابق 31 / مارچ 1875ء کو "تہذیب" کے عنوان سے نویں مشاعرے کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ انجمن پنجاب کا دسواں اور آخری مشاعرہ 3 / جولائی 1875ء کو منعقد کیا گیا جس کا عنوان "اخلاق" تھا۔ اس مشاعرے میں آزاد نے شرافت حقیقی کے موضوع پر اپنی نظم پیش کی۔

ان مشاعروں کی وجہ سے پنجاب اور دیگر علاقوں میں ایک طرز کا نیا ماحول پیدا ہوا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ماحول میں صرف دو اشخاص (حالی اور آزاد) ایسے تھے جنہوں نے اردو زبان و ادب کی تاریخ رقم کی ہے۔ اگرچہ حالی نے صرف چار مشاعروں میں شرکت فرمائی تاہم ان کی اس شرکت اور نظموں کی پیش کش نے جدید شاعری کا اقبال بلند کیا۔ اس کے بعد حکومت پنجاب کی عدم دلچسپی کی وجہ اس طرز کے مشاعرے بند ہو گئے۔ مگر اس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ جدید نظم کی ایک تحریک چل پڑی اور آگے چل کر نظم نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔

5.5 نظم جدید کی تحریک

انجمن کے ایک ادبی اجلاس میں آزادؔ نے "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" کے موضوع پر ایک لیکچر دیتے ہوئے نظمیہ شاعری کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ اردو شاعری کی روایت، مقصدیت اور معیار میں تبدیلی پر زور دیا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کا نصب العین اگرچہ تدریسی تھا تاہم یہ اردو غزل کے روایتی طرز کے خلاف ایک شدید ردِ عمل بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مشاعروں کے اسی مقصد اعلیٰ نے اردو نظم کو فطرت نگاری (نیچرل ازم)، کے رنگ و آہنگ سے متعارف کروایا۔ اسی زمانے میں ادب کو حقیقت سے قریب کرنے والوں میں سرسید احمد خان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح جدید فکر کے حامل قلم کاروں میں حالیؔ اور آزادؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ اور نذیر احمد، شبلی نعمانی، محسن الملک وغیرہ اور خود سرسید اپنے نثری تحریروں کے ذریعہ ادب کو خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے آنے کا کام کر رہے تھے۔ آزاد اور حالی کی ہر ادبی کوشش نئی سمت و رفتار کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ انہوں نے تاریخ کے بدلتے ہوئے اقدار کا مطالعہ کیا تھا اور وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مناظمہ (نظمیہ مشاعرے) کی بنیاد ڈالی اور شعراء کو موضوعاتی نظمیں لکھنے کی طرف مائل کیا۔ قومی اور اصلاحی شاعری کا تصور علی گڑھ اور انجمن پنجاب سے مربوط ہے۔ اس لیے بعد کے

زمانے میں اسی قومی شاعری نے آزادی وطن کی تحریک کو اپنا نصب العین بنالیا۔ نیچرل شاعری سے قومی شاعری، اور قومی شاعری سے آزادی وطن کی شاعری میں آزاد اور حالی ہی نے نیا عزم و حوصلہ پیدا کیا۔ اردو شاعری کو گل و بلبل، لب ور خسار اور ہجر وصال سے نکال کر قومی مسائل کی طرف اگر راغب نہ کیا ہوتا تو اردو شاعری جنگ آزادی میں اپنا گراں قدر حصہ نہ ادانہ کر سکی ہوتی۔ اردو شاعری نے مثبت ذہن و فکر کو عوام تک پہنچایا اور اس طرح اردو ادب نئی توانائی کے ساتھ مقصدیت کی طرف مائل ہوا۔

5.5.1 فطرت نگاری (نیچرل شاعری):

فطرت سے مراد ظاہری و مادی اشیاء ہی ہیں جن کی تخلیق میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ آفاق و انفس کے تمام عناصر جیسے زمیں، آسماں، شجر، درخت، پہاڑ، سورج، چاند، بادل، ہوا، بجلی بارش، پیڑ، پودے، پھل، موسم، چرند وپرند، درند وغیرہ اس آفاق میں شامل ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف کے بعد اردو شاعری میں نظموں کے ذریعے پہلی بار فطرت نگاری یعنی نیچرل ازم کا رجحان پیدا ہوا۔ اردو میں فطری شاعری کا تصور قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ بقول حالی:

> ”نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطرت اور عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب وبندش تابہ مقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو، جس میں وہ شعر کہا گیا ہے، کیوں کہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روز مرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ بولی جاتی ہے۔ نیچر یا سکینڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روز مرہ سے بعید ہو گا اس قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔ معناً نیچر کے موافق ہونے کا مطلب کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں۔ یا ہونی چاہئے۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہو گا وہ اَن نیچر سمجھا جائے گا۔“ (مقدمہ شعر وشاعری، الطاف حسین حالی، ص102، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی)

حالی اور آزاد اور ان کے معاصرین کے یہاں بھی اسی طرز کے خیالات مترشح ہوئے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے جدید طرز فطرت پر نہ صرف نظمیں لکھیں بلکہ ان پر اپنے تنقیدی خیالات بھی پیش کیے۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری“ میں شاعری سے بحث کرتے ہوئے شاعر کے لیے مطالعہ فطرت و کائنات کو ضروری قرار دیا ہے۔ نیچرل شاعری اور فطرت نگاری کے ضمن میں ان کی آراء اہمیت رکھتی ہیں۔ لاہور کے مناظمے نے یہ واضح کر دیا کہ شاعری میں صرف فطرت انسانی کے رموز ہی نہیں بلکہ فطرت طبعی کے احوال و آثار کے مسلسل بیان سے بھی فطرت نگاری کا اظہار ہو سکتا ہے۔ حالی کی نظم ”برکھارت“ اور آزاد کی نظم ”ابر کرم“ سے یہ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

پھلوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار　　دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل　　ہے گونج رہا تمام جنگل

کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو   اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی   گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
ابر آیا ہے گھر کے آسمان پر   کلمے ہیں خوشی کے ہر زبان پر

(مجموعہ نظم حالی، ص40)

اے ابر تیری رات کی تعریف اگر کروں   لازم ہے پہلے میں رہ ظلمات، سر کروں
کیا کیا بیاں کروں میں تیری رات کا مزہ   گر رات کا مزہ ہے تو برسات کا مزہ
سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا   چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا
بجلی کبھی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے   کرتی نقاب ابر میں چشمک ہے ناز سے

(مجموعہ نظم آزاد، ص809)

فطرت نگاری کے ضمن میں کہی گئی مذکورہ بالا مثالوں میں حالی اور آزاد کی نظموں میں سادگی اور روانی ہے اور یہ نظمیں ان کے خلوص کی مظہر ہیں۔ان نظموں میں فطرت اور حقیقت کی عکاسی ملتی ہے۔ نظم "برکھارت" اور "ابر کرم" میں قدرتی مناظر کا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

بہرحال اردو میں نیچرل شاعری کی ابتداء انجمن پنجاب کے مشاعروں سے ہوتی ہے۔ جس میں عشقیہ داستان اور فرضی قصوں کے بجائے حقیقی واقعات اور فطرت کو موضوع سخن بنایا اور ذہنی، فکری اور تہذیبی بیداری پیدا کی۔ وطنی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات کو ان مشاعروں کا موضوع بنایا گیا۔

5.5.2 وطنی شاعری:

وطنی شاعری کے جذبات و احساسات قدیم شاعری میں بھی پائے جاتے ہیں تاہم اس کا سرمایہ محدود رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ وطنی شاعری کی ہمہ گیر مقبولیت علی گڑھ تحریک کے بعد انجمن پنجاب کے مشاعروں کی مرہون منت ہے۔ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے موضوعاتی نظمیں لکھیں۔ ان بزرگوں کے بعد چکبست، علامہ اقبال اور سرور جہاں آبادی وغیرہ نے حب وطن کے جذبات کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا۔جدید نظم نگاری کے تحت حب الوطنی یا وطنی شاعری حالی کے یہاں ملتی ہے۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے کے لیے لکھی گئی ان کی نظم "حب وطن" اس کی مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ان کی بیشتر نظمیں ہندوستان کی معاشرت، روایات اور اقدار پر مبنی ہیں۔حالی نے اپنے ملک عزیز سے محبت کا اظہار کیا ہے اور اسے مادر وطن قرار دیا ہے۔ حب الوطنی پر ذیل میں حالی اور آزاد کی نظم "حب وطن" سے مثالیں ملاحظہ ہوں:

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر اور ہی چیز
آن اک اک تمہاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
اے وطن اے میرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمین

(مجموعہ نظم حالی، ص50)

اے آفتاب حب وطن تو کدھر ہے آج — تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہورہا — اور انتظام دل ہے زبر زیر ہورہا
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہوگئے — کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہوگئے
جب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں — حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں
لبریز جوش حب وطن سب کے جام ہوں — سرشارِ ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

(مجموعہ نظم آزاد، ص63)

وطن سے محبت ایک فطری عمل ہے اور حالی اور آزاد کے یہاں یہ جذبہ کارفرما ہے۔ حالی، آزاد اور بعض دیگر شعرا نے اپنی نظموں کے ذریعے اپنی مٹی سے محبت اور الفت کا درس دیا ہے۔ وطنی شاعری میں وطن سے محبت کے علاوہ اہل وطن کو اتحاد و اتفاق کا درس بھی ملتا ہے۔ اس میں اصلاحی پہلو بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

5.5.3 اخلاقی اور اصلاحی شاعری:

شعر وادب کے ذریعہ حقیقی معنوں میں انسان کو انسانیت کا حامل بنانا مقصود ہے۔ چوں کہ ادب کا مقصد ہی اصلاح احوال ہوتا ہے۔ جس شاعری کی بنیاد اخلاق و اقدار پر رکھی جاتی ہے وہ آفاقیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ شاعری زماں و مکاں میں رہ کر بھی ان سے پرے رہتی ہے اور اس کا مقصد فلاحِ انسانی ہوتا ہے۔ حالی اور آزاد کے شعری رنگ آہنگ میں واعظانہ اظہار ملتا ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی شاعری میں اخلاقیات کو اہمیت دی۔ آزاد نے اخلاقی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں جن میں "معرفت الٰہی" اور اولوالعزمی کے لیے کوئی سدراہ نہیں" کے علاوہ دیگر نظموں میں بھی اخلاقی اقدار ملتے ہیں۔ اسی طرح حالی کی جملہ شاعری اخلاقی و اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے۔ ان نظموں میں حالی اور آزاد معلم اخلاق اور مصلح نظر آتے ہیں۔

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم — اور ہو کبھی صلہ کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم — دوزخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کہ بادِ بہاراں چلے چلو

(مجموعہ نظم آزاد، ص102)

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے　　علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا　　بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات　　یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا　　پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

(مجموعہ نظم حالی، ص61)

حقیقت یہی ہے کہ اخلاقی قدروں سے مراد انسان کے وہ بنیادی تجربات ہیں جو انسان کو صفات عالیہ اور انسانی قدروں جیسے محبت، خلوص، صداقت انسان دوستی، ایثار، رواداری، وفاداری غرض زندگی کے اعلیٰ صفات و خیالات سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے اثرات نے حالی اور آزاد کے علاوہ ان کے معاصرین اور متاخرین کے بھی مزاج و منہج کو بدلنے میں اہم رول ادا کیا۔

5.6 نظم جدید کے اولین معمار

اردو میں جدید نظم نگاری کی بنیادوں کو استوار کرنے میں آزاد اور حالی کی خدمات ناقابلِ فراموش رہی ہیں۔ انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام منعقدہ نظمیہ مشاعروں میں اس طرح کی نظمیہ شاعری کی بناڈالی گئی۔ محمد حسین آزاد اس انجمن کی روح رواں تھے، جنہوں نے انجمن کے تمام مشاعروں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ "شب قدر"، "صبح امید"، "خواب امن"، "داد انصاف"، "وداع انصاف"، "گنج قناعت"، "ابر کرم"، "جغرافیہ طبعی کی ایک پہیلی"، "جذب دوری،" وغیرہ جیسی اہم نظمیں تخلیق کیں۔ لاہور آنے کے بعد حالی کی بھی اس سے وابستگی ہوگئی۔ انہوں نے چار مشاعرے پڑھے جن میں برکھارُت، نشاطِ امید، مناظرہ رحم وانصاف اور حب وطن کے موضوع پر نظمیں لکھیں، انہوں نے نظم جدید کے مزاج و منہج کو بدلنے اور اردو میں نظم نگاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ حالی اور آزاد کی نظمیں مثنوی کی ہیئت میں موجود ہیں۔ حالی اور آزاد نے اردو شاعری کو عشقیہ داستانوں کے دائرۂ سے نکال کر اس کو نیچرل یا فطری شاعری کی طرف راغب کیا۔ جدید شاعری کے ارتقاء میں حالی اور آزاد کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے اس طرح کی شاعری کے موضوعاتی دائرے کو وسیع کیا۔

5.6.1 الطاف حسین حالی:

اردو کے ادبی منظرنامے پر حالی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جنہوں نے اردو شعر و ادب کے فروغ و اشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ حالی کی ادبی زندگی کی ابتدا دلی کے علمی و ادبی ماحول میں ہوئی جہاں انہوں نے قلعہ معلیٰ کی شعری و ادبی محفلوں میں شریک ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ ان کی ادبی کاوشیں غالب کی سرپرستی میں غزل سے شروع ہوئیں اور بعد ازاں شاعری کے علاوہ تنقید و تحقیق، سوانح اور مقالات وغیرہ میں بھی اپنی اہمیت درج کروائی۔ حالی غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی تخلیق کرتے رہے۔ لاہور میں جدید

نظم کی تحریک کے تحت انھوں نے برکھارت، امید، تعصب و انصاف اور حب وطن، دلکش، شیریں طرز میں بیان کی ہیں۔ حالی نے جب سرسید کی صحبت اختیار کی تو ان کی فرمائش پر ایسی نظم لکھی جو بعد میں مسدس حالی کے نام سے معروف ہوئی۔ سرسید کو اس نظم پر فخر تھا۔ غرض حالی نے شعری تخلیقات کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں بھی اضافے کیے۔ حالی کی تصنیفات و تالیفات میں میلاد نامہ (1864)، تریاق مسموم (1867)، مجالس النساء (1874)، اصول فارسی (1868)، تاریخ محمدی (1872)، رسالہ خیر المواعظ، شواہد الالہام (1872)، سوانح حکیم ناصر خسرو (1882)، طبقات الارض (1883)، حیات سعدی (1886)، مقدمہ شعر و شاعری (1893)، یادگار غالب (1897)، حیات جاوید (1901) کے علاوہ خود نوشت (نامکمل)، مضامین حالی، مقالات حالی، مکاتیب حالی، دیوان حالی، مجموعہ نظم حالی، مسدس حالی، ضمیمہ اردو کلیات حالی اور انتخاب کلام داغ (نامکمل) شامل ہیں۔

حالی لاہور آئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔ لاہور کے خوش گوار ماحول نے ان کی فکر و نظر میں نئے عہد کا شعور پیدا کیا۔ مغربی علوم و فنون اور تہذیب و ادب کے اثرات نے ان کی فکر و نظر کو وسعت بخشی۔ اسی دور میں انھوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شرکت کرتے ہوئے اپنی چار نظمیں برکھارت، امید، مناظرہ رحم و انصاف اور حب وطن پیش کیں۔ یہ ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا اور جدید نظم کی تحریک میں ان کا نام آزاد سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل رہا اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں:

> "حالی نے یہ نظمیں ایک بدلتے ہوئے ماحول کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک مخصوص اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر لکھی ہیں۔ ان نظموں میں مغرب کا گہرا اور براہ راست اثر نہیں لیکن بالواسطہ طور پر یہ مغرب کے زیرِ اثر ضرور لکھی گئی ہیں اور ان میں موضوع اور انداز بیان دونوں اعتبار سے ایک خاص جدت نظر آتی ہے۔ یہ نظمیں تعداد میں صرف چار ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک جدید رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے۔"

(ڈاکٹر عبادت بریلوی، جدید اردو شاعری، ص 141)

جدید اثرات کے تحت حالی نے جو نظمیں لکھی ہیں اس کی ابتدا لاہور کے مشاعروں سے ہوئی۔ "برکھارت" پہلی نظم ہے جو انجمن پنجاب لاہور کے مشاعرے میں پیش کی گئی۔ اردو نظم کی تاریخ میں یہ اولین تجربہ ہے جس میں حالی نے نیچر کے بیان کے توسط سے اپنے جذبات و احساسات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی یہ نظم کی صوری و معنوی اعتبار عمدہ ادبی حسن کی حامل ہے۔ اس میں گرمی کی شدت، جانداروں کا تڑپنا، کہساروں کا تپنا، باغوں کی ویرانی۔ پھر برسات کی آمد اور ان کی رونقوں وغیرہ کی منظر کشی نیچرل طرز میں کی ہے۔ نظم میں داخلی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ نظم جدید نظم کے اصولوں پر پوری اترتی ہے۔ اس میں ربط و تسلسل، وحدتِ خیال اور خارجی اور داخلی رنگ و آہنگ کے امتزاج کے ساتھ ساتھ واقعہ نگاری، منظر نگاری، اور جزئیات نگاری بھی موجود ہے۔ یہ نظم کسی حد تک مغربی اصول و نظریات سادگی، اصلیت اور جوش کی حامل ہے۔ گرمی کی شدت کا منظر نامہ ملاحظہ فرمائیں:

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار　　اور دھوپ سے تپ رہے تھے کہسار

بھوبل سے سوا تھا رنگ صحرا　　اور کھول رہا تھا آب دریا

تھی لو سی آ پڑی چمن میں　　اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے　　اور ہانپ رہے تھے چار پائے

(مجموعہ نظم حالی، ص37)

ان اشعار میں ماحول کی عمدہ عکاسی ملتی ہے۔اس نظم میں سادگی، اصلیت اور جوش کے ساتھ ساتھ تشبیہات اور صنائع و بدائع کا حسن اور خوبصورت منظر کشی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ نظم کے دوسرے حصے میں شاعر نے برسات کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے بادل، بجلی، گھٹاؤں، ہواؤں، ہریالی، موسم کی شادابی، چرند و پرند کی چہچہاہٹ اور انسان کی مسرت کو بحسن و خوبی جزئیات کے سہارے بیان کیا ہے۔اس سے نظم حالی کی فنی سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ بہر حال جزئیات، مشاہدات کی تیز گامی اور احساس کی شدت اور فن کی ندرت اس نظم کی خوبیوں میں اضافہ کا باعث ہیں۔

حالی نے انجمن پنجاب کے مشاعرے میں اپنی دوسری نظم "نشاط امید" پیش کی۔اس نظم میں مختلف تلمیحات کے ذریعے امید کو نعمت سے تعبیر کیا ہے۔شاعر امید سے مخاطبت کرتے ہوئے اس کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ناقدین نے اس نظم کو بے کیف اور بے رنگ کہا ہے۔اس کے باوجود اس نظم میں بھی حالی کا طرز اور فن پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مجموعی لحاظ سے اس نظم میں سلاست، روانی، نغمگی اور دیگر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔پوری نظم نیچرل شاعری کا مرقع معلوم ہوتی ہے جس میں ملکی تہذیب و تاریخ کے ساتھ ساتھ عرب و عجم کی تہذیب کی تلمیحات کا خوبصورت استعمال ہوا ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو　　چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو

رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو　　پانڈو کے بھی ساتھ پھری بن میں تو

تو نے سدا قیس کا بہلایا دل　　تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل

ہوگیا فرہاد کا قصہ تمام　　پر تیرے فقروں پہ رہا خوش مدام

تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس　　ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

(مجموعہ نظم حالی، ص45)

حالی کی تیسری نظم جو انجمن پنجاب کے مناظم میں پیش کی گئی تھی وہ "حب وطن" تھی۔ان دنوں لوگوں کے دلوں میں وطن سے محبت کا جذبہ کار فرما تھا قومیت اور وطنیت کی زیریں لہریں ہر ہندوستانی کے دلوں میں اٹھ رہی تھیں۔لہذا حالی نے بھی اسی سرشاری کے ساتھ

نظم لکھی۔ کچھ ناقدین اس نظم کو طوالت اور تاریخی حوالوں کی وجہ سے بے رنگ اور بے اثر قرار دیتے ہیں۔ حالی نے انجمن پنجاب کے تحت صرف چار مشاعرے پڑھے۔ چوتھا مشاعرہ ”مناظرہ رحم و انصاف“ کے موضوع پر تھا۔ یہ نظم حالی کی چنندہ اور عمدہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ جس میں قومی، اخلاقی اور اصلاحی تصورات ملتے ہیں۔ اس نظم میں رحم کی خوبیاں بیان ہوئی ہیں۔ اس کے بعد انصاف کی زبانی رحم کی خامیوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اس نظم میں تمثیل نگاری عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ فنی لحاظ سے بھی اس میں جزئیات، پیکر تراشی، مکالمہ سازی اور کردار نگاری کی صفات ملتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی نظم حالی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حالی نے آزاد کے مقابلے میں اپنی نظموں میں موضوعی دائرہ کو وسیع کیا ہے اور مغربی افکار کے حوالے سے انسان دوستی، قومی دردمندی، داخلی سوز و گداز وغیرہ کو نیچرل پوئٹری کے طرز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی روایات سے انحراف کرتے ہوئے زبان کی ظاہری آرائش کے بجائے بول چال کی زبان کو اپنایا ہے۔

5.6.2 محمد حسین آزاد:

مولانا محمد حسین آزاد 10 جون 1830ء کو دہلی میں معروف اولین شہید صحافی مولوی باقر کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا شمار استاد ذوق کے احباب میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اپنے بیٹے کو تربیت کے لیے ذوق کے سپرد کیا۔ استاد ذوق سے شعر گوئی کی باریکیوں کو سیکھا۔ آزادؔ نے عربی اور فارسی اپنے والد سے ہی سیکھی اور پھر دلی کالج میں داخلہ لیا جہاں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ ان کے ہم سبق تھے۔ جس طرح جدید نظم نگاری کی ابتدا کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر ہے اسی طرح اُردو نثر میں کئی قابل قدر اضافوں کا اعزاز بھی انہی کو حاصل ہے۔ آب حیات ان کا لازوال نثری کارنامہ ہے اس کے علاوہ سخن دان فارس، دربار اکبری، اور نیرنگ خیال ان کے نثری کارنامے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ آزاد اُردو کے بڑے نثر نگار ہیں اُن کی عبارت رنگین، پُرکار اور سجی ہوئی ہوتی ہے۔ کردار اور واقعہ کو چند لفظوں میں زندہ کر کے آنکھوں کے سامنے پیش کر دینا ان کی نثر کا کمال ہے۔ ”اُردو نثر کو بال و پر عطا کرنے والوں میں ایک بڑی شخصیت آزاد کی ہے“۔ یہ سرسید کی تحریک کا نتیجہ تھا کہ اردو نثر کو محمد حسین آزاد جیسا قابل قدر محسنِ اُردو ملا۔ جس کی نثر نگاری نے اردو کو مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ محمد حسین آزاد جدید اردو نظم کے بانی اور نیچرل شاعری کے بنیاد گزار ہیں۔ ان میں بیک وقت کئی خوبیاں جمع تھیں۔ وہ کامل ادیب، نامی گرامی نقاد، شاعر، ماہرِ تعلیم اور استاذ فارسی بھی تھے۔

آزاد جدید نظم کے اولین کارواں کے قافلہ سالار ہیں۔ ان کو یہ شعور تھا کہ مغربی علوم و فنون اور اس کی تہذیب ہمارے در پر دستک دے رہی ہے اور ملک تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے۔ حالات کی اس تبدیلی کے شعور نے ان کو جدید نظم کی طرف راغب کیا۔ اس کی ترقی و ترویج کے لیے انھوں نے انجمن پنجاب کو پلیٹ فارم بنایا اور ایک تاریخی کام انجام دیا۔ سنہ 1867ء میں انجمن پنجاب کا پہلا اجلاس ہوا اور آزاد نے اس میں ایک لیکچر بعنوان ”نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات“ دیا۔ اس کے بعد انجمن کے اجلاس ماہانہ ہونے لگے جن میں آزاد مختلف موضوعات پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان لکچروں میں انہوں نے جدید شعری نظریات پر نہ صرف اپنے خیالات پیش کیے بلکہ اردو شعرا و ادبا کو مشوروں سے نوازا۔ آزاد کا خیال تھا کہ اردو کے شعر و ادب کو انگریزی ادب سے سے اخذ و استفادہ کرنا چاہئے۔ انگریزی ادب

کی خصوصیات اور اوصاف جیسے موضوعات، تکنیک اور مبالغہ آرائی سے پرہیز وغیرہ ہیں۔ ان اوصاف نیز ادب میں سچے اور حقیقی جذبات و احساسات کی ترجمانی وغیرہ ہیں۔ آزاد نے قدیم شاعری کے عیوب اور جدید تقاضوں سے پر شاعری کے محاسن بیان کرتے رہے۔ اس طرح آزاد کے لیکچروں نے جدید نظم کی بنیاد کا کام کیا۔ انجمن پنجاب کے زیر اہتمام اردو میں نئی طرز کی نظموں کی ابتدا ہوئی۔ اردو کی جدید نظموں کی ترویج اور اشاعت میں آزاد کی نظمیں اہمیت رکھتی ہیں، جن میں شب قدر، صبح امید، گنج قناعت، دادِ انصاف، وداع انصاف، خوابِ امن، مبارک باد جشن جوبلی، اُلوالعزمی کے لیے کوئی سدراہ نہیں، سلام علیک، معرفت الٰہی، محنت کرو، نوطرز مرصع وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آزاد کی نظمیہ شاعری کے مطالعہ سے پہلے ان کے نظم گوئی پر تصورات کا جائزہ ان کی نظم کی افہام و تفہیم میں معاون ہو گا۔ آزاد شاعری میں ذوق کے شاگرد تھے۔ لہٰذا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ ایک نئے ادبی شعور کے ساتھ کیا اور انھیں اردو شاعری کی روایت اور موضوعات محدود نظر آئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اے گلشن فصاحت کے باغبانوں۔۔۔ فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فر فر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔'۔۔۔ تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔۔۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن ان ہی پر قناعت ناجائز۔ کیوں کہ اب زمانہ کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یوروپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے "ہار" طُرّے ہاتھوں میں لیے کھڑی ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔"

(اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانات کا حصہ، ڈاکٹر منظر اعظمی، ص146)

آزاد نے جدید نظم کے ضمن میں جہاں تنقیدی افکار پیش کیے ہیں وہیں انھوں نے کچھ نظمیں بھی تخلیق کی ہیں جو ان تصورات کی نمائندگی کرتی ہیں، جو جدید نظمیہ تاریخ میں اہمیت رکھتی ہیں۔ کیوں کہ یہ جدید نظمیں اردو میں جدید نظم گوئی کے نقشِ اولیں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے ناقدین انہیں جدید نظم نگاری کا بنیاد گزار قرار دیتے ہیں۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:

"آزادؔ کا رتبہ اردو شاعری میں وہی ہے جو اسکاٹ کا انگریزی شاعری میں ہے۔ کسی نئے خیال کے پیدا کرنے والے اور کسی نئی تحریک کے بانی کو دنیا جس وقعت کی نظروں سے دیکھ سکتی ہے۔ آزادؔ بھی اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔ انھوں نے ہی قدیم شاعری کی اصلاح کا سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور انھوں نے ہی جدید تصور کو سینچا۔ آزاد ہی کی بدولت لوگ نیچرل شاعری کے مفہوم سے آشنا ہوئے... جہاں کی ہر چیز اپنی دلکشی اور رعنائی کے لئے صرف دستِ قدرت کی مرہون ہے۔ اس میں صبح اور شام کے سمے، پرندوں کی چہک، پھولوں کی مہک، آبشاروں کا

شور، سبزہ زاروں کی دلکشی اور کہساروں کی بے ترتیبی غرض حسن فطرت کی بوقلمونیوں کا پورا نقشہ موجود ہے۔"

(جدید اردو شاعری، عبد القادر سروری، مطبوعہ کھنہ لیتھو پریس دہلی، 1945، ص 101)

آزاد کی نظمیں نیچرل شاعری یا فطرت نگاری کے نام سے جانی جاتی ہیں اور انجمن پنجاب کی تحریک کو نیچرل شاعری کی تحریک سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ آزاد، حالی اور دیگر شاعروں نے نظمیہ مشاعروں میں مناظر فطرت پیش کیے ۔اس میں انگریزی شاعری کی تقلید ملتی ہے۔ آزاد کے یہاں منظر نگاری میں فطری حسن اور سادگی کا جمال ملتا ہے۔اور جہاں منظری نگاری کا حسن اور سادہ روی نظر آتی ہے وہاں انگریزی شاعری کی پیروی کا احساس ہوتا ہے۔ آزاد کی مثنوی "ابر کرم" سے فطرت نگاری کی یہ مثال ملاحظہ کیجئے:

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں　　اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں

وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے　　وہ کیاریاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے

آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا　　اور روئے سبزہ زار کا دھوکر سنوارنا

گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے　　اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

(مجموعہ نظم آزاد، ص38)

آزاد کے یہاں منظر نگاری کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے قاری کی نگاہوں میں منظر کی متحرک تصویریں بن جاتی ہیں۔ آزاد کی نظم کے مطالعہ سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ وہ خارجی پہلو پر زور دیتے ہیں وہ مناظر فطرت کی مصوری جذباتی طرز پر نہیں کرتے جیسا کہ انگریزی نظم نگاروں کا شعار رہا ہے۔ان کی خارجی منظر کشی ان کے احساس جمال اور شعور حسن کی غمازی کرتی ہے۔ مناظر فطرت یا نیچرل ازم کے علاوہ موضوعاتی سطح پر ان کے یہاں اخلاقی موضوعات پر بھی نظمیں ملتی ہیں جن میں "معرفت الٰہی" اور "اولوالعزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں" شامل ہیں۔ان نظموں میں وہ ایک معلم اخلاق نظر آتے ہیں۔ اخلاقی نظم میں فطرت نگاری کا بیان ملاحظہ ہو:

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن　　دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن

نہریں ادھر ادھر ہیں امیدوں کی موجزن　　اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن

کبک دری کی طرح خراماں چلے چلو

(مجموعہ نظم آزاد، ص101)

آزاد نے وطن کی محبت پر مبنی شاعری بھی کی۔ اس نظم میں ایرانیوں اور انگریزوں کی حب الوطنی کی توصیف بیان کرتے ہوئے برادران وطن کو محبت کا پیغام دیتے ہیں۔ یہ نظم موضوع کے لحاظ سے عمدہ ہے مگر اس میں شعری حسن اور معنویت کا فقدان نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اس پر نثر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ آزاد کی نظمیہ شاعری ربط و تنظیم اور ارتقاء سے عاری ہیں۔ وہ اس لیے کہ بحیثیت نثار ان کا مقام بہت بلند ہے اس لیے وہ صاحب طرز انشاء پرداز کہلائے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود جدید نظم کے فروغ وارتقاء میں ان کا کردار اہم ہے وہ اس

لیے کہ عملی اور علمی لحاظ سے نظم کی ترقی میں ان کی کاوشیں لائق صد تحسین معلوم ہوتی ہیں۔

5.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- لاہور میں "انجمن پنجاب" 21 جنوری 1865ء میں قائم کی گئی تھی اس انجمن کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر لائٹنر کا انتخاب ہوا، جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر میکلوڈ اس کے سرپرست اعلیٰ تھے۔ لاہور کے ذی حیثیت اور اہل علم و دانش لوگ اور محمد حسین آزاد اس انجمن کے اراکین میں شامل تھے۔
- انجمن کے پہلے اجلاس میں حکومت پنجاب کے اعلیٰ سرکاری افسران، لاہور کے مقتدر خاندان اور علماء اس میں شریک رہے۔ انجمن کے قیام کے بعد علمی، ادبی، اصلاحی اور نئے سائنسی علوم پر مضامین پڑھے جانے کا آغاز ہوا۔ اور بہت جلد اس انجمن کا شہرہ پنجاب اور ہندوستان کے دیگر علاقوں تک پھیل گیا۔
- 1874 انجمن کی تاریخ کا ایک اہم سال رہا۔ ہالرائیڈ نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نئے مشاعروں کا ایک سلسلہ شروع کروایا جن میں شعرا سے گزارش کی گئی کہ فطرت اور مناظر پر نظمیں لکھیں۔ مدارس کے نصاب میں قدیم عشقیہ شاعری کی جگہ مناظر فطرت پر نئی نظمیں لکھوا کر شامل نصاب کیا گیا۔
- حالی اور آزاد نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں یادگار نظمیں پڑھیں۔ ہندوستان بھر میں ان مشاعروں کا شہرہ رہا جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ان مشاعروں میں جس طرز کی نظمیں پڑھی گئیں اس سے جدید نظم نگاری کو استحکام پہنچا اور اردو میں فطری یا نیچرل شاعری کی ابتداء ہوئی۔ محمد حسین آزاد اس رجحان کے بنیاد گزار ٹھہرے جنہوں نے اس طرز کی نظموں سے پہلے اپنے لیکچرس میں اس کی اہمیت اور روایت پر روشنی ڈالی اور اس طرح کی نظمیں لکھ کر عملی ثبوت بھی فراہم کیا۔ اس کارواں میں حالی کی شمولیت نے تحریک کو استحکام پہنچایا۔
- اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ شعرا میں نظم گوئی کا رجحان پیدا ہو۔ اگرچہ زیادہ تر نظمیں مثنوی کی ہیئت تخلیق کی گئیں۔ تاہم اس دور میں ہیئت کے تجربے محدود پیمانے پر ہوئے۔ مگر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں اسماعیل میرٹھی، شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبال وغیرہ نے اس صنف میں عمدہ تخلیقات پیش کرتے ہوئے اس صنف کو ترقی دی۔
- مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی جدید نظمیں صوری و معنوی خصوصیات کی حامل ہیں۔ ان میں ربط و تسلسل، وحدتِ خیال اور خارجی اور داخلی رنگ و آہنگ کے امتزاج کے ساتھ ساتھ واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری بھی موجود ہے۔ یہ نظمیں کسی حد تک مغربی اصول و نظریات سادگی، اصلیت اور جوش کی حامل ہیں۔
- جدید نظم میں جو فطرت نگاری کا تصور قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ آزاد اور حالی اور ان کے معاصرین نے فطرت کے حسن کو شعری لبادہ پہنایا۔ لاہور کے مناظمے نے یہ واضح کر دیا کہ شاعری میں صرف فطرت انسانی کے رموز ہی نہیں بلکہ فطرت طبعی کے

احوال و آثار کے مسلسل بیان سے بھی حاصل فطرت نگاری کا اظہار ہو سکتا ہے۔

- جدید نظمیہ شاعری وطن سے محبت، معاشرت، روایات اور اخلاقی اقدار پر مبنی ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری عمل ہے اور حالی اور آزاد کے یہاں یہ جذبہ کار فرما ہے۔ حالی اور آزاد نے وطنی شاعری میں وطن سے محبت کے علاوہ اہل وطن کو اتحاد و اتفاق کا درس بھی دیا ہے اور اخلاقی اقدار اور اصلاح کی بات بھی کی ہے۔ حالی اور آزاد نے اردو کی روایتی نظموں سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے اسے جدید رنگ و آہنگ عطا کیا۔

5.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
اشراف	:	شریف کی جمع (اچھے لوگ)
نشاۃ الثانیہ	:	نئی زندگی، یورپ کا وہ دور جس میں علوم و فنون و ادب کو فروغ ملا، احیائے علوم کا دور
خون آشام	:	بے درد (مجازاً ظالم)
نظم جدید	:	شاعری کی وہ قسم جس میں موضوع یا ہیئت کی کوئی قید نہ ہو
نیچرل شاعری	:	قدرتی مناظر پر کی گئی شاعری
فطرت نگاری	:	حقیقت نگاری کا وہ انداز فرانسیسی، ادیب زولا اور موپاساں وغیرہ نے ختیار کیا
علوم جدید	:	وہ علوم جو زمانہ حال میں ایجاد ہوئے
پند و نصائح	:	نصیحت و نیک صلاح
ہیئت	:	شکل
محاکات	:	شاعری کے بیان میں کسی واقعے، منظر یا امر کی تصویر کشی کرنا
آفاقیت	:	عالم گیر اور ہمہ گیر ہونے کی صورت حال
اشجار	:	شجر کی جمع، بہت سے درخت

5.9 نمونہ امتحانی سوالات

5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. انجمن پنجاب کی بنیاد کب رکھی گئی؟
2. انجمن پنجاب کے سرپرست اعلیٰ کون تھے؟
3. ڈاکٹر لائٹنر کون تھے؟

4. انجمن پنجاب کے اجلاس میں آزاد نے کونسی نظم پڑھی؟

5. انجمن پنجاب کے چوتھے مشاعرے کا کیا عنوان تھا؟

6. انجمن پنجاب کے چوتھا مشاعرہ کب منعقد ہوا؟

7. فطری شاعری کسے کہتے ہیں؟

8. نظم "شب قدر" کس نے تحریر کی؟

9. انجمن پنجاب کے علمی رسالے کا نام بتائیے۔

10. کرنل ہالرائیڈ کے کہنے پر انجمن پنجاب کے تحت محمد حسین آزاد کی تدوین کردہ کتابوں کے نام بتائیے۔

5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. انجمن پنجاب کے قیام پر نوٹ لکھیے۔

2. نظم جدید کی تحریک پر اظہار خیال کیجیے۔

3. حالی کی ادبی خدمات پر اختصاریہ لکھیے۔

4. آزاد کی جدید نظم گوئی کے خصوصیات بیان کیجیے۔

5. اردو میں نیچرل شاعری کا جائزہ لیجیے۔

5.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. انجمن پنجاب کی ادبی خدمات کا احاطہ کیجیے۔

2. انجمن پنجاب کے حوالے سے آزاد اور حالی کی جدید نظم نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

3. نظم جدید کی تحریک پر روشنی ڈالیے۔

5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. محمد حسین آزاد (ہندوستانی ادب کے معمار)	مظفر حنفی
2. حالی (ہندوستانی ادب کے معمار)	مالک رام
3. جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری
4. اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانات کا حصہ	منظر اعظمی (ڈاکٹر)
5. انجمن پنجاب: تاریخ و خدمات	صفیہ بانو (ڈاکٹر)

اکائی 6 : حالی کی نظم نگاری: مناجات بیوہ

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 مولانا الطاف حسین حالیؔ کے سوانحی حالات

6.3 حالیؔ کی شعر گوئی سے دلچسپی

6.4 حالیؔ کی نظم نگاری

6.4.1 حالیؔ کی نظم نگاری کی خصوصیات

6.4.2 حالیؔ کی نظموں کی لفظیات

6.4.3 حالیؔ کی نظموں میں ارتقائی عمل

6.4.4 حالیؔ کی نظموں کے موضوعات

6.4.5 حالیؔ کی نظموں میں قدیم اور جدید کا امتزاج

6.5 نظم "مناجات بیوہ" کا متن

6.6 نظم "مناجات بیوہ" کا تجزیہ

6.7 اکتسابی نتائج

6.8 کلیدی الفاظ

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

الطاف حسین حالیؔ اردو شاعری کے اہم ستون ہیں۔ اردو میں نظم نگاری کو فروغ دینے والے شاعروں میں حالی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ مولانا حالی نے اپنی تمام تر زندگی اردو شعر و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی وہ ایک بہترین نثر نگار، منفرد لب و لہجے کے شاعر، اردو کے پہلے نقاد، سوانح نگار اور تبصرہ نگار تھے۔ اردو تنقید کی تاریخ میں "مقدمہ شعر و شاعری" کو بوطیقا کی طرح اہمیت حاصل ہے۔ حالیؔ کی تصانیف "حیاتِ جاوید"، "یادگارِ غالب" اور "حیات سعدی" اردو کی اولین سوانحی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ مولانا حالیؔ نے سرسید کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں تبصرے لکھ کر نثر کی خدمت کی ہے۔ قومی اور نیچرل شاعر کی حیثیت سے مولانا حالیؔ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں نظیرؔ اکبر آبادی کی نظم نگاری کا تسلسل اور وسعت دکھائی دیتی ہے۔ حالیؔ کی شاعری کے موضوعات جداگانہ ہیں۔ انہوں نے غزل گوئی بھی کی ہے اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی نام کمایا ہے لیکن اردو میں جدید نظم گوئی کا آغاز حالی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں فکر و فلسفہ کی گہرائی نہیں بلکہ جذبات و احساسات کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا الطاف حسین حالیؔ کے سوانحی حالات سے آگاہ ہو سکیں۔
- حالیؔ کے ادبی کارناموں کے بارے میں جان سکیں۔
- حالیؔ کی نظم نگاری سے آشنائی حاصل کر سکیں۔
- "مناجات بیوہ" کے متن کی قرأت کر سکیں۔
- نظم "مناجات بیوہ" کے موضوع سے واقف ہو سکیں۔
- "مناجات بیوہ" کا تجزیہ کر سکیں۔

6.2 مولانا الطاف حسین حالیؔ کے سوانحی حالات

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کا خاندان ہرات سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے جد اعلیٰ خواجہ ملک علی خاندان غلامان کے دور میں ہرات سے ہندوستان پہنچے۔ خواجہ ملک علی ایک عالم و فاضل انسان تھے ان کی پندرہویں پشت میں خواجہ ایزد بخش پیدا ہوئے جنھوں نے آبائی جاگیر پر زندگی بسر کی۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ آن ہی کے صاحبزادے تھے، وہ پانی پت کے ایک گاؤں سونی پت میں 1837ء میں پیدا ہوئے۔ خواجہ ایزد بخش نے اپنے بیٹے کی تعلیم کا معقول انتظام کیا۔ پانچ سال کی عمر میں مولانا حالیؔ کی مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ ابتدائی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس کے بعد عربی، فارسی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی طرف توجہ دی۔ وہ نو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ مولانا

حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پرورش کی۔ معاشی حالات کی خرابی کی وجہ سے خواجہ الطاف حسین حالیؔ اسکول کی باضابطہ تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ کم عمری میں شادی کرنے کا رواج اس زمانے میں عام تھا۔ مولانا حالی علم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن خاندان کے بزرگوں نے 17 برس کی عمر میں مولانا حالی کی شادی کردی جس کے لیے حالی تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ایک دن چپکے سے رات کے وقت گھر سے نکلے اور پانی پت سے 55 میل کا فاصلہ طے کرکے پیدل 1854ء میں دہلی پہنچے۔ جہاں انہیں تعلیم جاری رکھنے اور شعری ذوق کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ جامع مسجد کے قریب مدرسہ میں شریک ہوگئے۔ وہ جس وقت دہلی پہنچے۔ اس وقت دلی کے شاعرانہ ماحول میں شیفتہؔ اور غالبؔ کی شاعری کی دھوم تھی۔ حالی نے ابتدا میں مصطفی خاں شیفتہ اور بعد میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا ایک سال بعد گھر والوں کے اصرار پر دہلی چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور 1856ء میں شہر حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی سی تنخواہ پر ملازم ہوگئے۔ چار سال لاہور میں قیام کیا پھر دہلی آئے۔ اینگلو عربک اسکول کے استاد مقرر ہوئے۔ سر سید کے مشورے پر 1879ء میں " مسدس حالی " لکھی۔ علی گڑھ کالج کی امداد کے لیے خوب کام کیا۔ نثر اور شاعری سے دلچسپی نے حالی سے وہ کام لیا جس کی مثال اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔ سر سید کی سفارش پر 1887ء میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ یہاں کی حکومت نے انھیں پچھتر روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور 1891ء میں یہ وظیفہ سو روپے کردیا گیا۔ 1905ء میں حیدرآباد کے آصف سادس نواب میر محبوب علی خاں کی سلور جوبلی کے موقع پر وہ موجود تھے۔ یہاں سے پانی پت گئے پانی پت میں ہی 1914ء میں انتقال کیا۔

6.3 حالیؔ کی شعر گوئی سے دلچسپی

مولانا حالی کا بچپن پریشان حالی میں گزرا چنانچہ ان کی باضابطہ تعلیم نہ ہوسکی' لیکن شادی کے بعد دہلی پہنچے۔ کئی ملازمتیں کیں 'نواب مصطفی خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے تو ان کے شعری ذوق کو جلا ملی۔ وہیں نواب مصطفی خاں شیفتہ سے کلام پر مشورہ کرنے لگے۔ شیفتہ کے وزن پر اپنا تخلص خستہ رکھا لیکن غالب کے تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد اپنا تخلص حالیؔ اختیار کیا۔ حالیؔ کی ابتدائی شاعری روایتی انداز کی رہی ابتدا میں غزل ہی کہتے رہے۔ جب سر سید احمد خان سے ملاقات ہوئی تو حالیؔ کے شعری رویے میں تبدیلی آئی۔ اب انھوں نے روایتی غزل گوئی کے بجائے نظم نگاری کی طرف توجہ کی۔ سر سید ہی کے مشورے پر 1879ء میں انھوں نے " مسدس " لکھی۔ مسدس میں حالی کی شعر گوئی میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انجمن پنجاب سے وابستہ ہوئے تو کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے نظموں اور قومی و وطنی شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ انجمن پنجاب کے نظمیہ مشاعروں میں حالیؔ نے نئے انداز کی نظمیں پیش کیں۔ اس سے پہلے وہ منفرد لیکن روایتی طرز میں غزل کہتے تھے۔ ان نظموں نے توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

6.4 حالیؔ کی نظم نگاری

حالیؔ نے جدید انداز کی مثنویاں لکھنے کے علاوہ حقیقت پسند نظم نگاری اور نیچرل شاعری کی روایت کا آغاز کیا۔ ان کی حقیقت پسند نظم نگاری کا سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب کہ انھوں نے سر سید احمد خاں کے خیالات سے وابستگی اختیار کی اور ان سے استفادہ کے نتیجہ

میں " مسدس حالیؔ " کی تخلیق کی جو اردو کی سب سے پہلی طویل نظم کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا حالیؔ نے طویل نظم نگاری کے ساتھ ساتھ اردو نظم کو نیچرل شاعری سے بھی روشناس کیا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعہ موضوعاتی نظمیں لکھ کر مولانا حالیؔ نے نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔ آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد نے بھی اس دور میں موضوعاتی نظمیں لکھیں جس کے نتیجے میں فطری اور مناظر قدرت کے موضوعات کو اردو شاعری میں وقعت حاصل ہوگئی۔ مولانا حالیؔ نے حقیقت پسندی اور فطرت پرستی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں وطنی اور قومی تصورات کو بھی شامل کرنا شروع کیا۔ مولانا حالیؔ کی وجہ سے ہی اردو نظم کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ انہوں نے ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات، قومی اور وطنی مسائل کو بھی نظم نگاری کا موضوع بنایا۔ ان کی نظمیں " انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی" سے خود پتہ چلتا ہے کہ مولانا حالیؔ کی شاعری کا موضوعاتی دائرہ وسیع ہے۔ سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں ان کی نظموں کے اصل مخاطب ہندوستانی مسلمان ہیں جن کی حالیؔ کے خیال میں اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی قوم خصوصاً مسلمانوں میں ایسی خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہیں جو ان کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی زوال کا سبب ہیں۔ حالیؔ ان خامیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان اوصاف کے علاوہ مولانا حالیؔ نے اپنی نظموں میں ہئیت کی تبدیلی پر بھی توجہ دی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں غزل اور مثنوی کی ہئیت کے علاوہ مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کی ہئیت میں نظمیں لکھنے کا انداز بھی دکھائی دیتا ہے۔ نظم نگاری کے لیے حالیؔ کا یہ پہلا تجربہ نہیں تھا بلکہ ان سے قبل نظیر اکبر آبادی نے اس طرح کے تجربے کیے تھے۔ حالی کے موضوعات اپنے پیش روشاعروں سے الگ اور نئے تھے۔ ان کی نظمیں سادہ اور پرکار ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور احساس کو عام فہم انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے سادہ اور زود رس ہیں۔ ان کی نظموں میں ضرب الامثال کا بڑا خزانہ ہے۔ ان کی نظموں کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ طنز سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مزاح کا بھی ہلکا رنگ ہے جو ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں کھل کر سامنے آتا ہے۔

6.4.1 حالیؔ کی نظم نگاری کی خصوصیات:

حالیؔ نے اپنے دور میں دو مختلف کیفیتوں کو محسوس کیا۔ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کے حالات نے حالیؔ کی شاعری میں بہت بڑا تغیر پیدا کیا۔ بلاشبہ اردو میں قومی اور وطنی شاعری کی روایت کا آغاز حالیؔ کی نظم گوئی سے ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا شعری کارنامہ ہے کہ انہوں نے " مسدس حالی، لکھ کر قومی شعور بیدار کیا۔ پھر اس کے بعد ان کی مثنوی " حب وطن " کی وجہ سے اردو شاعری میں وطنی نظموں کا آغاز ہوا۔ مثنوی کی صنف کو حالیؔ نے حالات حاضرہ سے وابستہ کیا اور شخصی مرثیے کے ذریعہ اردو مرثیہ نگاری میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کیا۔ حالیؔ کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیات ان کے الفاظ کی بندش، خیالات کی پیش کشی، اظہار کی تازگی اور زبان کا برجستہ اور برمحل استعمال ہے۔ اس قسم کا حقیقت پسندانہ انداز نظمیہ شاعری میں سب سے پہلے مولانا حالیؔ نے شروع کیا۔ ورنہ مولانا حالیؔ سے قبل تک ہی نہیں بلکہ حالیؔ کے بعد بھی اردو شاعری مبالغہ اور غیر حقیقی واقعات سے معمور تھی۔ حالیؔ نے اردو شاعری کو حقیقت پسندی سے وابستہ کرتے ہوئے نظم کو زندگی کے حقائق کے اظہار کا سلیقہ دیا گیا۔ چنانچہ حالیؔ کے دور سے ہی نظمیہ شاعری کی اس روایت کا آغاز ہوا جسے حقیقت پسندی اور مسائلی شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ حالیؔ نے نظم کی شاعری کو گلے شکوے سے پاک کرکے فطری جذبات اور احساسات کی پیش کشی کے لیے سازگار

ماحول پیدا کیا۔ اس لیے نظمیہ شاعری میں حالیؔ کی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

6.4.2 حالیؔ کی نظموں کی لفظیات:

اگر چہ حالیؔ نے اپنی ابتدائی غزلوں میں روایتی لفظیات کی پیروی کی تھی اور مرزا غالب کی طرح پیچیدہ زبان اور لفظیات استعمال کرتے رہے لیکن سرسید سے وابستگی کے بعد ان کی شاعری میں ایک بہت بڑا تغیر رونما ہوا اور انہوں نے سادہ الفاظ کو شاعری میں جگہ دینے کی کامیاب کوشش کی۔ حالیؔ کے دور میں عربی اور فارسی کی لفظیات کا چلن عام تھا۔ سنسکرت، ہندی اور بھاشا کے الفاظ اگر کوئی اپنے کلام میں استعمال کرتا تو اسے بے ادبی تصور کیا جاتا تھا۔ حالیؔ نے اپنی نظموں میں لاتعداد بھاشا، ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کر کے اردو میں نہ صرف نئی لفظیات کا اضافہ کیا بلکہ آنے والی نسلوں کو دوسری زبانوں سے استفادے کے اصول بھی سکھائے۔ سرسید کی رفاقت میں حالیؔ کے خیالات میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ انہوں نے اردو زبان میں نہ صرف سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ شامل کیے بلکہ جہاں ممکن ہو سکے وہاں انگریزی الفاظ کے استعمال پر بھی خصوصی توجہ دی۔ تاہم انہوں نے شاعری میں انگریزی الفاظ استعمال نہیں کیے۔ ان کی نثر میں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔

انہوں نے حیات جاوید میں بے شمار انگریزی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ البتہ ان کی نظموں میں ہندی کے سادہ اور عام فہم الفاظ کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ مولانا حالی کی اس روش پر لکھنو والوں نے اعتراض بھی کیا لیکن مولانا حالی نے اس اعتراض کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

6.4.3 حالیؔ کی نظموں میں ارتقائی عمل :

کسی ایک خیال کو پیش نظر رکھ کر اس کے تحت مختلف بند تحریر کرنا جس میں خیال کا ربط و تسلسل برقرار رہے تو ایسی شعری تخلیق کو نظم کہتے ہیں۔ حالیؔ سے قبل دکنی دور کی مثنویوں میں خیال کے تسلسل کی وجہ سے نظموں کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی لیکن حالیؔ کی شعر گوئی کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو ارتقائی صورت سے ہمکنار کر دیا۔ ان کی نظموں میں نہ صرف تازگی کا عمل دکھائی دیتا ہے بلکہ نظم کی تحریر میں وہ ارتقائی عمل کے وسیلے کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ ارتقائی عمل سے مراد نظم کا ایسا انداز ہے جس میں پہلے تمہید باندھی جاتی ہے پھر اس کے بعد موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے نقطہ عروج پر پہنچا دیا جاتا ہے اور آخر میں نظم کے انجام کی صورت نکل آتی ہے۔ اس تمام کیفیت کو نظم کا ارتقائی عمل کہا جاتا ہے۔ اردو میں نظم نگاری میں اس قسم کے ارتقائی عمل کو استعمال کرنے والے شاعروں میں مولانا حالیؔ اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تمام نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ارتقائی عمل، تمہید، موضوع کا احاطہ، نقطہ عروج اور انجام سے وابستہ دکھائی دیتا ہے جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ مولانا حالیؔ اپنی نظموں کے دوران ارتقائی عمل کو بروئے کار لاتے ہیں۔

6.4.4 حالیؔ کی نظموں کے موضوعات:

مولانا حالیؔ کو اردو کا نیچرل شاعر مان کر عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ حالی نے صرف فطرت پرستی پر نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن فی الواقع یہ بات درست نہیں ہے۔ حالیؔ کی شاعری کے مختلف موضوعات ہیں۔ انہوں نے قومی، ملی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی موضوعات کو ہی اپنی شاعری کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ سماجی ناانصافی، نابرابری اور عورت کے حقوق کی پامالی، اخلاقی گراوٹ، قوم کی تعلیمی پسماندگی پر بھی

نظمیں تحریر کیں۔ حالیؔ ایک ایسے نظم گو شاعر ہیں جنھوں نے نظم کے موضوعات کو وسیع کیا اور اپنی نظموں کو اپنے دور کے سماج کا عکاس بنا دیا۔ یہ کیفیت سب سے پہلے حالیؔ کی نظموں میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنی مثنویوں، نظموں، شخصی مرثیوں اور شہر آشوب کے ذریعہ قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے وطنی، ملی، سماجی اور معاشرتی مناظر کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔

6.4.5 حالیؔ کی نظموں میں قدیم اور جدید کا امتزاج:

اگرچہ حالیؔ پابند نظم کے شاعر ہیں اور ان کے موضوعات بھی محدود ہیں مگر ان میں تازگی ہے، وقت کی پکار ہے۔ عصری تقاضے اور ضروریات ہیں۔ ان کی نظموں میں اکثر جگہوں پر خطیبانہ رنگ جھلک کر سامنے آجاتا ہے۔ حالی کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے نظم کو بیانیہ شاعری سے قریب کر کے قدیم اور جدید کے امتزاج کی کامیاب کوشش کی۔ مرثیے کی صنف واقعات کربلا کی حد تک محدود تھی اس قدیم انداز کو جدید انداز سے ہم آہنگ کرتے ہوئے حالیؔ نے مرثیہ کی صنف کو شخصی مرثیوں کی جہت عطا کی۔ اگرچہ اردو شاعری میں مومنؔ اور غالبؔ سے شخصی مرثیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو مثنوی کے موضوعات بھی اب تک بندھے ٹکے تھے۔ حالی نے مثنوی کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کروایا۔ اس کے بعد مثنوی جیسی روایتی صنف حالی کے کلام میں داخل ہو کر ایک زندہ صنف کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مولانا حالی نے نعتیہ کے علاوہ دوسرے دو ایک قصیدے بھی لکھے۔ فطری طور پر انہیں قصیدے سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ مقدمہ میں تو انہوں نے قصیدے کی مذمت کی ہے۔ اسلوب سخن میں بھی حالی نے غیر شعوری طور پر بڑی تبدیلیاں لائی ہیں۔ انہوں نے زبان کو سلاست اور سادگی عطا کی۔ صنعتوں کے استعمال اور تکلفات سے زبان کو آزاد کیا۔ ہندی اور انگریزی کے وہ الفاظ جو بول چال میں شامل ہیں، بے محابہ استعمال کیے۔ حالی کی شاعری میں یہ موضوعاتی اور لسانی تبدیلیاں منصوبہ بند طریقے سے در آتی ہیں۔

6.5 "مناجات بیوہ" کا متن

---

(1)

اے سب سے اول اور آخر — جہاں تہاں، حاضر اور ناظر
اے سب داناؤں سے دانا — سارے تواناؤں سے توانا
اے بالا، ہر بالاتر سے — چاند سے سورج سے امبر سے
اے سمجھے بوجھے بن سوجھے — جانے پہچانے بن بوجھے
سب سے انوکھے سب سے نرالے — آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے
اے اندھوں کی آنکھ کے تارے — اے لنگڑے لولوں کے سہارے

ناتیوں سے چھوٹوں کے ناتی
ساتھیوں سے بچھڑوں کے ساتھی

ناؤ جہاں کی کھینے والے
دکھ میں تسلی دینے والے

جب اب تب تجھ سا نہیں کوئی
تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی

جوت ہے تیری جل اور تھل میں
باس ہے تیری پھول اور پھل میں

ہر دل میں ہے تیرا بسیرا
تو پاس اور گھر دور ہے تیرا

راہ تری دشوار اور سکڑی
نام ترا رہ گیر کی لکڑی

تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا
تو ہے سہارا غمگینوں کا

تو ہے اکیلوں کا رکھوالا
تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا

لاگو اچھے اور برے کا
خواہاں کھوٹے اور کھرے کا

بید نراسے بیماروں کا
گاہک مندے بازاروں کا

سوچ میں دل بہلانے والے
بپتا میں یاد آنے والے

(2)

اے بے وارث گھروں کے وارث
بے بازو بے پروں کے وارث

بے آسوں کی آس ہے تو ہی
جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی

بس والے ہیں یا بے بس ہیں
تو نہیں جن کا وہ بے کس ہیں

ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا
دسرایت کی وہاں نہیں پروا

دل میں ہے جن کے تیری بڑائی
گنتے ہیں وہ پربت کو رائی

بیکس کا غم خوار ہے تو ہی
بری بنی کا یار ہے تو ہی

دکھیا دکھی یتیم اور بیوہ
تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا

تو ہی ڈبوئے،تو ہی ترائے
تو ہی یہ بیڑے پار لنگھائے

تو ہی مرض دے تو ہی دوا دے
تو ہی دوا دارو میں شفا دے

تو ہی پلائے زہر کے پیالے — تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے — تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے — مارے مار کے پھر چمکارے
پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے — مار میں بھی اک تیری مزا ہے

(3)

اے رحمت اور ہیبت والے — شفقت اور دباغت والے
اے اٹکل اور دھیان سے باہر — جان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا — بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا
ایک کو تو نے شاد کیا ہے — ایک کے دل کو داغ دیا ہے
اس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا — اس سے نہ تو بیزار کچھ ایسا
ہر دم تیری آن نئی ہے — جب دیکھو تب شان نئی ہے
یہاں پچھوا ہے وہاں پروا ہے — گھر گھر تیرا حکم نیا ہے
پھول کہیں کملائے ہوئے ہیں — اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں
کھیتی ایک کی ہے لہراتی — ایک کا ہر دم خون سکھاتی
ایک پڑے ہیں دھن کو ڈبوئے — ایک ہیں گھوڑے بیچ کے سوئے
ایک نے جب سے ہوش سنبھالا — رنج سے اس کو پڑا نہ پالا
ایک نے اس جنجال میں آ کر — چین نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر
مینہ کہیں دولت کا ہے برستا — ہے کوئی پانی تک کو ترستا
ایک کو مرنے تک نہیں دیتے — ایک اکتا گیا لیتے لیتے
حال غرض دنیا کا یہی ہے — غم پہلے اور بعد خوشی ہے
رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا — تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا

یہاں نہیں بنتی رنج سہے بن   رنج نہیں سب ایک سے لیکن
ایک سے یہاں رنج ایک ہے بالا   ایک سے ہے درد ایک نرالا
گھاؤ ہے گو ناسور کی صورت   پر اسے کیا ناسور سے نسبت
تپ وہی دق کی شکل ہے لیکن   دق نہیں رہتی جان لیے بن
دق ہو وہ یا ناسور ہو کچھ ہو   دے نہ جو اب امید کسی کو
روز کا غم کیوں کر سہے کوئی   آس نہ جب باقی رہے کوئی
تو ہی کر انصاف اے مرے مولا   کون ہے جو بے آس ہے جیتا
گو کہ بہت بندے ہیں پر ارماں   کم ہیں مگر مایوس ہیں جو یاں
خواہ دکھی ہے خواہ سکھی ہے   جو ہے اک امید اس کو بندھی ہے
کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سوکھی   آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی
گھاٹا جن کی اساڑھی میں ہے   ساونی کی امید نہیں ہے
ڈوب چکی ہے ان کی اگیتی   دیتی ہے ڈھارس ان کو پچھیتی
ایک ہے اس امید پہ جیتا   اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا
ایک کو جو اولاد ملی ہے   اس کو امنگ اب شادیوں کی ہے
رنج ہے یا قسمت میں خوشی ہے   کچھ ہے مگر اک آس بندھی ہے
غم نہیں ان کو گو غمگیں ہیں   جو دل ناامید نہیں ہیں
کال میں کچھ سختی نہیں ایسی   کال میں ہے جب آس سمیں کی
سہل ہے موجوں سے چھٹکارا   جب کہ نظر آتا ہے کنارا
پر نہیں اٹھ سکتی وہ مصیبت   آئے گی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہو اس رہ گیر کا کیا دل؟   مر کے کٹے گی جس کی منزل
ان اجڑوں کو کل پڑے کیوں کر   گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر
ان بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا؟   جن کو نہ ملنے دے گا زمانہ

اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی
آئیں بہت دنیا میں بہاریں عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی
آس ہی کا یہاں نام ہے دنیا جب نہ رہی یہی تو رہا کیا؟
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ
رونا ان بن باسیوں کا ہے دیس نکالا جن کو ملا ہے
حکم سے تیرے پر نہیں چارہ کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
زور ہے کیا پتے کا ہوا پر چاہے جدھر لے جائے اڑا کر
تنکا اک اور سات سمندر جائے کہاں موجوں سے نکل کر
قسمت ہی میں جب تھی جدائی پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی؟
آج کی بگڑی ہو تو بنے بھی ازل کی بگڑی خاک بنے گی
تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا بندے کا یاں بس نہیں چلتا
مارے اور نہ دے تو رونے تھپکے اور نہ دے تو سونے
ٹھہرے بن آتی ہے نہ بھاگے تیری زبردستی کے آگے
تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاہیں بند ہیں چاروں کھونٹ کی راہیں
تو مارے اور خواہ نوازے پڑی ہوئی ہوں میں تیرے دروازے
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں
ماں ہی سدا بچہ کو مارے اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

(4)

اے مرے زور اور قدرت والے   حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری   دروازے کی تیری بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن   جان اپنی ہے آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری   میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں   دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے   منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
دکھ دل کا کچھ کہہ نہیں سکتی   اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتی
تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا   تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے   لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی دکھ ساتھ نہ آیا   غم کے سوا کچھ ہات نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے   ایک ہنسی نے گل ہی کھلائے
کیسا تھا یہ بیاہ نناواں   جوں ہی پڑا اس کا پرچھاواں
چین سے رہنے دیا نہ جی کو   کر دیا ملیامیٹ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک   اور روؤں تو روؤں کہاں تک
ہنس ہنس دل بہلاؤں کیوں کر   اوسوں پیاس بجھاؤں کیوں کر
ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا   ایک نہ ہنستا بھلا نہ روتا
لیٹے گر سونے کے بہانے   پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے
جاگیے تو بھی بن نہیں پڑتی   جاگنے کی آخر کوئی حد بھی
اب کل ہم کو پڑے گی مر کر   گور ہے سونی سیج سے بہتر
بات سے نفرت کام سے وحشت   ٹوٹی آس اور بجھی طبیعت
آبادی جنگل کا نمونہ   دنیا سونی اور گھر سونا
دن ہے بھیانک اور رات ڈرانی   یوں گزری ساری یہ جوانی

بہنیں اور بہنیلیاں میری　　ساتھ کی جو تھیں کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے　　خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ　　جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ
کوئی نہیں دل کا بہلاوا　　آ نہیں چکتا میرا بلاوا
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا　　کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
تھک گئی دکھ سہتے سہتے　　تھم گئے آنسو بہتے بہتے
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر　　گھل گئی جان اندر ہی اندر
دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے　　جان کو پھونکا دل کی لگی نے
دبی تھی بھوبھل میں چنگاری　　لی نہ کسی نے خبر ہماری
قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی　　شہر میں وہ دھوئیں ساہوں کی
تہواروں کا آئے دن آنا　　اور سب کا تہوار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں　　وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں　　وہ ارمان بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں　　خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں
چاؤ کے اور خوشیوں کے سمے سب　　آتے ہیں خوش کل جان کو ہو جب
رنج میں ہیں سامان خوشی کے　　اور جلانے والے جی کے
گھر برکھا اور پیا بدیسی　　آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
دن یہ جوانی کے کٹے ایسے　　باغ میں پنچھی قید ہو جیسے
رت گئی ساری سر ٹکراتے　　اڑ نہ سکے پر ہوتے ساتے
کسی نے ہوگی کچھ کل پائی　　مجھے تو شادی راس نہ آئی
آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ　　پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ
رہ گیا دے کر چاند دکھائی　　چاند ہوا پر عید نہ آئی

رُت بدلی پر ہوئی نہ برکھا   بادل گرجا اور نہ برسا
پھل کی خاطر برچھی کھائی   پھل نہ ملا اور جان گنوائی
ریت میں ذرے دیکھ چمکتے   دوڑ پڑی میں جھیل سمجھ کے
چاروں کھونٹ نظر دوڑائی   پر پانی کی بوند نہ پائی

(5)

اے دین اور دنیا کےمالک   راجا اور پرجا کے مالک
بے پر اور پردار کے والی   اے سارے سنسار کے والی
پورب، پچھم، دکھن، اتر   بخشش تیری عام ہے گھر گھر
پیاؤ لگی ہے سب کے لیے یہاں   خواہ ہوں ہندو، خواہ مسلماں
ہو نہ اگر قسمت نے کمی کی   کی نہیں بندی تونے کسی کی
چیونٹا کیڑا، مچھر، بھنگا   کچھوا، مینڈک، سیپ اور گھونگا
سارے پنچھی اور پکھیرو   مور، پپیہا، سارس پیرو
بھیڑ اور بکری، شیر اور چیتے   تیرے جلاے ہیں سب جیتے
کھلا ہے سب پر در رحمت کا   رس رہا ہے مینھ نعمت کا
خاک سے تو نے بیج اگائے   پھر پودے پروان چڑھائے
سیپ کو بخشی تونے دولت   اور بخشا مکھی کو امرت
لکڑی میں پھل تونے لگائے   او رکوڑی پر پھول کھلائے
ہیرا بخشا کان کو تونے   مشک دیا حیوان کو تونے
جگنو کو بجلی کی چمک دی   ذرے کو کندن کی دمک دی
دین سے تیرے اے مرے مولیٰ   سب ہیں نہال ادنیٰ او راعلیٰ
عام ہے سب پر تیری رحمت   ہیں محروم مگر بدقسمت

پیڑ ہوں چھوٹے یا کہ بڑے یہاں
فیض ہوا کا سب پہ ہے یکساں
جلتے ہیں جو ہیں جلنے والے
پھلتے ہیں جو ہیں پھلنے والے
جب اپنی ہی زمیں ہو کلر
پھر الزام نہیں کچھ مینہ پر
سب کو ترے انعام تھے شامل
میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
گر کچھ آتا بانٹ میں میری
سب کچھ تھا سرکار میں تیری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں
نون کو ترسی میں سانبھر میں
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی
سدا برت سے چلی ہوں بھوکی
پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں
آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
ہونے سے میرے فائدہ کیا تھا؟
کس لیے پیدا مجھ کو کیا تھا
آن کے آخر میں نے لیا کیا
مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا
نین دیے اور کچھ نہ دکھایا
دانت دیئے اور کچھ نہ چکھایا
جندڑی دی اور خوشی نہ بخشی
دل بخشا، دل لگی نہ بخشی
رہی اکیلی، بھری سبھا میں
پیاسی رہی، بھری گنگا میں
چین سے جاگی، اور نہ سوئی
میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی
آ کے خوشی سی چیز نہ پائی
جیسی آئی ویسی نہ آئی
کھایا تو کچھ مزا نہ آیا
سوئی تو کچھ چین نہ پایا
پھول ہمیشہ آنکھ میں کھٹکے
او ر پھل سدا گلے میں اٹکے
ہو نہ سکی کچھ دل سے عبادت
او ر نہ جمی کاموں پہ طبیعت
کام سنوارا کوئی نہ یہاں کا
اور نہ کیا دھندا کوئی وہاں کا
کام آیا یہاں کوئی نہ میرے
او ر نہ میں کام آئی کسی کے
قسمت نے جب سے منھ موڑا
آدمیوں کا ہوگیا توڑا
باپ اور بھائی، چچا، بھتیجے
سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے

پر نہیں پائی ایک بھی ایسا — جس کو ہو میری جان کی پروا
ناتیوں میں شفقت نہیں پاتی — اپنوں میں اپنایت نہیں پاتی
گھر ہے یہ اک حیرت کا نمونا — سوگھر والے اور گھر سونا
جس نے خدا کا خوف کیا کچھ — آکے کبھی یہاں پوچھ لیا کچھ
سویہ خوشی کا دل کی ہے سودا — زور کسی پر اب نہیں اپنا
اس میں شکایت کیا ہے برائی — اپنی ہی قسمت کی ہے برائی
چین گر اپنی بانٹ میں آتا — کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے — کیوں ہوتے اوروں کے حوالے
آٹھ پہر کیوں دکھ یہ اٹھاتے — جیتے ہی جی کیوں ہم مرجاتے
دکھ میں نہیں یہاں کوئی کسی کا — باپ نہ ماں، بھائی نہ بھتیجا
سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی — سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی

(6)

تیرے سوا اے رحم کے بانی — کون سنے یہ رام کہانی
ایک کہانی ہو تو کہوں میں — ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
حال نہ ہو دشمن کا ایسا — میرا نازک حال ہے جیسا
کوئی نہیں لاگو، اب میرا — باپ نہ بھائی، ساس نہ سسرا
آنکھ میں ایک اک کی ہوں کھٹکتی — پر اپنے بس مر نہیں سکتی
ماں اور باپ، عزیز اور پیارے — بے کل ہیں جینے سے ہمارے
روکے پلک نم کر نہیں سکتی — ہنس کے غلط غم کر نہیں سکتی
رویئے تو سب روتے ہیں گھر کے — رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسئے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو — کیوں کہ الٰہی کاٹیے غم کو

گر سسرال میں جاتی ہوں میں　نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جس وقت ہوں آتی　رو رو کر ہوں سب کو رلاتی
جب سے یہ دن قسمت نے دکھائے　تکتے ہیں جو ہیں اپنے پرائے
میرا سدا ہنسنا اور رونا　بیٹھنا، اٹھنا، جاگنا، سونا
سوچ میں میرے سارا گھر ہے　میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی　پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی
جانتی ہوں، نازک ہے زمانا　بات ہے اک یہاں عیب لگانا
موتی کی سی آب ہے عزت　جاکے نہیں آتی پھر حرمت
مہندی میں نے لگانی چھوڑی　پٹی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی　عطر نہیں میں بھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی　بال نہیں برسوں گندھواتی
دودو چاند نہیں سردھوتی　اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی
کان میں پتے،ہاتھ میں کنگن　پہن چکی سب، جب تھی سہاگن
پہنچیوں کاارمان نہیں اب　چوڑیوں کا کچھ دھیان نہیں اب
اڑگئیں سب دل کی وہ ترنگیں　چاؤ رہے باقی، نہ امنگیں
آپ کو یہاں تک میں نے مٹایا　پر دنیا کو صبر نہ آیا
وہم نے ہے ایک ایک کو گھیرا　جب دیکھو تب ذکر ہے میرا
کھینچ چکا ہے میرا مقدر　داغ بدی کا میری جبین پر
مل جاؤں گر خاک میں بھی میں　بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں
سچ اگلے لوگوں نے کہا ہے　بد اچھا بدنام برا ہے
جینے سے گھبراگئی ہوں میں　اس دم سے تنگ آگئی ہوں میں
یوں نہ بری اس جان پہ بنتی　ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی

رہتے ہم انجان بلا سے   دنیا مجھ سے، میں دنیا سے
اے بے آسروں کے رکھویا   اے ڈوبے بیڑوں کے کھویا
کیجیو میری کشتیبانی   آ پہنچا ہے ڈباؤ پانی
اب تیرے گی، ترائی تیری   ڈوبی ناؤ، دھائی تیری

(7)

اے امبر کے چمکتے تارو   اے گھر کے در، اور دیوارو
اے جانی پہچانی راتو   تنہائی کی ڈرانی راتو
اے نیک اور بد کے دربانو   دیکھتی آنکھو! سنتے کانو
ایک دن اس گندی دنیا سے   جانا ہے مالک کے آگے
بوجھ ہیں وہاں سب تلنے والے   پترے سب کے ہیں کھلنے والے
جب وہاں پوچھ ہو میری تیری   تم سب دیجو، گواہی میری
میں نیکی کا دم نہیں بھرتی   پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی
کیوں کہ خطا سے بچ سکتا ہے   جس نے کچا دودھ پیا ہے
خواہ ولی ہو، خواہ رشی ہو   اس سے رہائی نہیں کسی کو
گنوں اگر میں اپنی خطائیں   ہے یہ یقیں، گنتی میں نہ آئیں
پر، یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی   منہ پہ یہ آئے بن نہیں رہتی
خواہ بری تھی، خواہ بھلی میں   بات سے اپنی نہیں ٹلی میں
پڑی تھی جس بے دید کے پالے   ہوئی تھی جس بیری کے حوالے
نام پہ دھونی اس کے رٹا کر   آن کو رکھا جان گنوا کر
ساتھ نہ قوم اور دیس کا چھوڑا   اور نہ خدا کے عہد کو توڑا
آئے اگر دنیا کو نہ باور   اب مجھے کچھ دنیا کا نہیں ڈر

میرا نگہبان، اور رکھوالا سب سے بڑا ہے جاننے والا

6.6 نظم "مناجات بیوہ" کا تجزیہ

مولانا الطاف حسین حالیؔ انیسویں صدی کے اواخر کی اصلاحی تحریکوں سے متاثر تھے اس لیے انھوں نے بڑے مصلح کے طور پر سماجی بے انصافی جس کا شکار خاص طور سے مسلمان بھی تھے، اس کے لیے آواز اٹھائی۔ حالی نے عورتوں سے ہمدردی کے لیے نظمیں لکھیں۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کو تہذیب و تعلیم کا گہوارہ بنانے کے لیے عورتوں کو ان کے جائز حقوق دینے پر اصرار کیا۔ انھوں نے عورت کی بے بسی، مظلومیت اور حقوق کی پامالی کے لیے آواز اٹھائی اور طبقہ نسواں کے ناگفتہ بہ حالات کا ذکر اپنی نظم "مناجات بیوہ" میں کر کے ہمدردی کے جذبات کو ابھارا ہے اور بیوہ کی حالت زار بیان کی ہے۔ یہ نظم مولانا حالیؔ نے 1884ء میں "ھادم اللذات" نام سے شائع کی تھی جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ 1888ء میں اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کر کے اس کو "مناجات بیوہ" کے نام سے شائع کیا۔ اس اکائی کی نظم مذکورہ بالا نسخہ سے نقل کی گئی ہے جو بارہ بند پر مشتمل ہے۔ اس اکائی میں اس نظم کے ابتدائی سات بندوں کا متن شامل ہیں۔

اس نظم میں حالیؔ نے ہندوستانی عورت کی بیوگی کی دل خراش تصویر کشی کی ہے۔ نظم کا ہر لفظ درد اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نظم میں بیوہ عورت کی زندگی کے درد و کرب اور محرومی کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ حالی نے جوان بیوہ کی مصیبتوں، کلفتوں اور جذبات و احساسات کو محسوس کیا ہے۔ یہ نظم "مناجات بیوہ" مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

نظم کے پہلے حصے میں جیسا کہ نام ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں بیوہ کی مناجات کو بیان کیا گیا ہے اور وہ بیوہ عورت پروردگار کی بارگاہ میں اپنی التجا پیش کرتی ہے اور ابتدائی اشعار میں وہ اللہ کی تعریف کرتے ہوئے خدا کی ذات کو مخاطب کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اے اول و آخر اور اے ہر جگہ حاضر و ناظر رہنے والے خدا اور اے سب سے زیادہ جاننے والی ذات جو سب سے زیادہ توانا اور طاقتور ہے۔ اے وہ ذات جو ہر چیز سے برتر و بلند تر ہے۔

وہ خدا آسمان و سورج سے بھی کہیں زیادہ بڑی ذات ہے۔ وہ ذات ایسی ہے جو بغیر بتائے ہوئے بھی ہماری کیفیتوں سے آگاہ ہے اور کسی چیز کو پہچاننے کے لیے اسے کسی اشارے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ خدا کی ذات ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ جو دکھائی نہیں دیتی مگر دلوں کو روشن کرتی ہے۔ وہ خدا وہی ہے جو اندھوں کو نور عطا کرتا ہے اور لنگڑے لولوں کا سہارا ہوتا ہے۔ ناتے ناتیوں کو سہارا دینے والی ذات اور بچھڑے ہوئے لوگوں کا ساتھ دینے والی ذات ہے وہ۔

اے دنیا جہان کی ناؤ چلانے والے اور دکھ درد میں انسان کو تسلی دینے والے خدا۔ تیرے جیسا اس جہان میں کوئی نہیں ہے سب کا وجود تو تجھ سے ہی ہے لیکن تجھ جیسا کوئی نہیں ہے۔ ہوا پانی، جل تھل اور پھل و پھول میں تیری عظمت کے نشان پائے جاتے ہیں اور ہر دل میں تیرا بسیرا ہے۔ تو دور ہو کر بھی پاس رہتا ہے۔

بے شک تجھ تک پہنچنے کا راستہ بہت تنگ و تاریک ہے لیکن تیرا نام راہ گیر کی لکڑی کی طرح ہے اگر کوئی اس لکڑی کا سہارا پا لے تو تم تک پہنچ سکتا ہے۔ اے اللہ تیری ذات مسکینوں کا ٹھکانا اور غمزدہ لوگوں کا سہارا ہے۔ تو بے سہارا لوگوں کا رکھوالا ہے اور تو ہی اندھیرے گھروں کا اجالا ہے۔ اچھے برے کام کرنے والے سب تیری ہی ذات کے زیر سایہ ہیں اور کھرے کھوٹے کی پہچان بھی تیری ہی ذات سے ہوتی ہے۔ تیری ذات بیماروں کی مدد کرنے والی ہے اور مندے بازاروں کو عروج بخشنے والی ہے۔ تیری ذات کے خیال سے انسان کا دل بہل جاتا ہے اور مصیبت و پریشانی میں تیری ذات ہی کی یاد آتی ہے اور سکون عطا کرتی ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں حالیؔ بیوہ کی زبانی خدا کی کی ذات مزید بڑائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں اے بے وارث گھروں کے وارث اور بے سہاروں کے وارث تو ہی بے آسوں کی آس اور سوتے جاگتے ان کے پاس ہوتا ہے۔ چاہے بے بس انسان ہو یا طاقت والا انسان ہو جس کا تو نہیں بلاشبہ وہی بے کس و بے بس ہے۔ تو جس کا ساتھی ہو جائے تو پھر اس کو کسی دوسرے کے ہونے کی پرواہ نہیں ہوتی۔ جس کے دل میں تیری عظمت و بڑائی ہو پھر اس کے سامنے اونچے پہاڑ کی کوئی اوقات نہیں ہوتی۔ تو ہی بیکسوں کا غمخوار اور ہر بنی نوع انسان کا یار و مددگار ہے۔

اے اللہ! ہر غم کے مارے اور دکھیا، یتیم اور بیوہ سبھی کی نیا پار لگانے والا تو ہی ہے۔ تو ہی مرض دیتا اور تو ہی دوا بھی دیتا ہے اور تو ہی وہ ہے جس نے دوا میں شفا قرار دی ہے۔ اگر کوئی زہر کے پیالے پی لے تو تیری ہی وہ ذات ہی جو زہر کو بھی امرت میں بدل دیتا ہے۔ اے اللہ تیری ذات دلوں میں آگ لگانے والی اور دلوں میں موجود بے چینیوں کو ختم کرنے والی ہے۔ جب کوئی مصیبت میں ہوتا ہے تو تیری ذات ہی ہمیں سہارا دیتی ہے اور تیرے پیار اور مار کا اپنا الگ مزہ ہوتا ہے۔

نظم کے تیسرے حصے میں حالیؔ مزید خدا کی صفات بیان کرتے ہوئے اسے مخاطب کرتے ہیں اور بیوہ کی زبانی اس طرح کہتے ہیں کہ اے رحمت و ہیبت والی ذات اور اے شفیق و مہربان اور رعب والے پروردگار۔ اے وہ ذات جو دھیان میں نہیں سما سکتی اور عقل جس کو پا نہیں سکتی جس کے حکموں میں راز پوشیدہ ہوتے ہیں جس سے اے اللہ تو ہی باخبر ہے۔

اے ہر ایک کو شاد کرنے والی ذات! کسی کے حصے میں خوشیاں ہوتی ہیں تو کسی کے حصے میں غم آتا ہے اے اللہ تو ہر بندے کو چاہتا ہے مگر کسی سے بیزار نہیں ہے۔ ہر لمحہ تیری شان نرالی ہوتی ہے جب بھی دیکھو تو ایک نئی شان نظر آتی ہے۔ اے اللہ ہر جگہ اور ہر گھر میں تیرا حکم جاری و ساری ہے اور ہر گھر میں نیا حکم جاری ہوتا ہے۔ تیرے ہی حکم سے کہیں پھول کھلتا ہے تو کہیں مرجھا جاتے ہیں اور تیرے ہی حکم سے کھیتی لہراتی ہے اور کہیں کھیتی سوکھ جاتی ہے۔

اس دنیا میں ایک طرف وہ لوگ نظر آتے ہیں جو اپنی دولت کو ڈبو کر بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک طرف وہ لوگ نظر آتے ہیں جن کو کسی طرح کی کوئی پراہ نہیں ہے۔ ایک طرف وہ ہے جس نے ہوش سنبھالا ہے تو کسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوا ہے اور دوسری طرف ایسے بھی ہیں جن کی پوری زندگی مصیبت و پریشان میں گزری اور ایک لمحہ بھی چین و سکون نہ پایا۔ کہیں دولت ہی دولت ہے تو کہیں لوگ پانی تک کے لیے ترستے نظر آتے ہیں۔ کوئی مرنا چاہتا تو لوگ مرنے نہیں دیتے اور کوئی لیٹے لیٹے ہی تھک جاتا ہے۔ غرض پوری دنیا اسی طرح کے

حالات سے دوچار ہے اور غم و خوشی زندگی کا حصہ ہے کبھی پہلے غم اور کبھی خوشی پہلے ملتی ہے۔

بہر حال اس دنیا کا کیا گلا و شکوہ کیا جائے یہاں کا تحفہ یہی ہے کہ دکھ سہے بنا گزارا ممکن نہیں اور سب کے دکھ ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ ان کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔ دنیا میں ملنے والی تکلیفیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور یہاں ملنے والا ہر درد بھی نرالا ہوتا ہے۔ دنیا میں ملنے والا زخم اگرچہ ناسور کی طرح ہی ہوتا ہے، لیکن انھیں ناسور سے کیا نسبت دی جائے جس طرح تیز بخار بھی دق کی ایک صورت ہے جو ایک جان لیوا مرض ہے۔ بہر حال دق ہو یا ناسور یہ دونوں مرض انسان کو کوئی امید نہیں دلاتے بلکہ جان لیوا ہوتے ہیں لہذا کوئی انسان روزانہ کا غم کیونکر برداشت کرے جب کہ کوئی امید باقی نہ ہو اس لیے انسان مایوسی کا شکار ہونے لگتا ہے۔

اے خدا تو انصاف کر کہ کوئی بھی ناامید ہو کر نہیں جی سکتا اگرچہ اس دنیا میں بہت سے ایسے ہیں جو ارمانوں کو اپنے دل میں لیے ہوئے مصروف عمل ہیں لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو مایوسی کا شکار ہیں البتہ ان کی تعداد کم ہے۔ اے خدا! چاہے وہ دکھی ہو یا سکھی ہو سب کی امیدیں تجھ سے بندھی ہوئی ہیں۔ جن کی کھیتیاں ویران ہو چکی ہیں وہ بھی خدا کی ذات سے بارش کے امیدوار ہیں۔ موسم کی گھٹائیں اساڑھ کے مہینے میں داخل ہو چکی ہیں جب کہ کچھ لوگوں کو ساون کے برسنے کی امید نہیں ہے اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی بوئی ہوئی فصل وقت سے پہلے ہی ڈوب چکی ہے لیکن بعد میں رہ جانے والی فصل ان کی ڈھارس بنی ہوئی ہے۔

کوئی اس امید میں جی رہا ہے کہ اب کی بار اس کے یہاں بیٹی یا بیٹے کی پیدائش ہو گی تو دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جن کے یہاں اولاد ہو چکی ہے اور وہ اس کی خوشیوں کے ارمان دل میں لیے ہوئے مصروف عمل ہیں۔ قسمت میں رنج ہو یا خوشی جو کچھ بھی ہو مگر سبھی کی ایک امید ہوتی ہے۔ جن کے پاس بظاہر غم نہیں ہوتا پھر بھی وہ کہیں نہ کہیں غمزدہ ہوتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے دل ناامید نہیں ہوتے اور کچھ لوگوں کی قسمت میں زیادہ سختیاں نہیں ہوتیں جب کہ کچھ سنے جانے کی امید میں جیتے ہیں۔ لہذا جب ڈوبتے ہوئے انسان کو سمندر کا کنارہ دکھائی دینے لگے تو سمندر کی موجوں سے چھٹکارا پانا زیادہ آسان ہو جاتا ہے یعنی امید کی کرن دکھائی دینے لگتی ہے۔

اب یہاں سے شاعر بیوہ کے دل کی کلفت اور درد کے احساس کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ مصیبت کیسے ختم ہو سکتی ہے جس کے بعد کوئی راحت یا سکھ نہ دکھائی دے۔ ایسے مسافر کا دل کیسے خوش ہو سکتا ہے جس کی منزل ہی اسے گردن کٹوانے کے بعد میسر ہو۔ اور ان بچھڑوں کا ٹھکانہ کیا ہے جن کو زمانہ ملنے نہیں دے گا؟ میرے اوپر تقدیر کی صورت میں جو پریشانی مسلط ہوئی ہے یہ ایسی بلا ہے جو ٹالتے نہیں ٹل سکتی۔ دنیا میں بہت بہاریں آئیں اور بہت سی باغوں میں جھولے پڑے اور بہت سی چاندنی راتیں آئیں اور بہت سی برساتیں کھل کر برسیں پھر بھی دل کی جو کلی مرجھا گئی تھی وہ نہ کھلے گی۔ یہ دنیا ایک امید کا نام ہے اور اگر یہ امید ہی باقی نہ رہے تو پھر کیا باقی رہے گا؟ میرا غم بھی کچھ ایسے ہی پردیسی کی طرح ہے جس کو کچھ بھی ملنے کی امید باقی نہیں رہتی۔ مجھے ان لوگوں پر رونا آتا ہے جن کو ان کے دیس سے نکال دیا گیا ہو لیکن اے خدا چوں کہ ہر چیز تیرے حکم کے مطابق چلتی ہے لہذا کڑوی میٹھی ہر چیز مجھے گوارا ہے۔ بہر حال پتے کا ہوا پر کیا زور ہوتا ہے بلکہ پتے کو ہوا جدھر چاہے لے جائے اور اسی طرح ایک تنکا سات سمندر کی زور آور موجوں سے نہیں نکل سکتا اسی طرح جب قسمت میں جدائی لکھ دی گئی ہو تو یہ مصیبت کسی صورت ٹل نہیں سکتی ہے۔ کوئی مشکل آج کی ہوتی تو بن سکتی تھی مگر جس

کی ہمیشہ سے بگڑی ہوئی ہو تو اس کی کبھی کسی صورت نہیں بن سکتی۔ اے اللہ! تو جو چاہتا ہے وہ نہیں ٹل سکتا اور ایسے میں انسان کا بس نہیں چل سکتا۔ تو اپنے بندوں کو تکلیف بھی دیتا ہے ساتھ ہی اس کا سہارا بن کر اس کو رونے بھی نہیں دیتا۔

اے اللہ تو ہی ہے جو مشکلات میں گھرے ہوئے کو تھپک کر سلا دیتا ہے تیری ذات کے آگے کسی کا زور نہیں چل سکتا ہے۔ اگر کوئی تجھ سے بھاگنا چاہے تو بھاگ بھی نہیں سکتا کیوں کہ چاروں طرف سے راستے بند ہیں۔ اے اللہ تو چاہے مارے یا نوازے میں تیرے ہی دروازے پر پڑی ہوئی ہوں اور تیرے سوا کس سے اپنی درد و تکلیف بیان کر سکتی ہوں؟ بالکل اسی ماں کی طرح جو اپنے بچے کو مارتی بھی ہے پھر بھی بچہ ماں ماں ہی پکارتا ہے۔

نظم کے چوتھے حصے میں حالیؔ بیوہ کی مزید التجا اور دکھ درد کو خدا کی بارگاہ میں بیان کرتے ہوئے بیوہ کی زبانی کہتے ہیں کہ اے قدرت وطاقت رکھنے والے اور اے حکمت و حکومت کے مالک خدایا میں ایک دکھیاری تیری لونڈی ہوں جو تیری بھکارن بن کر تیرے دروازے پر بیٹھی ہوں۔ میں اپنی جان کی دشمن بنی ہوئی موت کی خواہش مند ہوں، میری زندگی اجیرن بن چکی ہے۔ اپنے پرائے سب لوگوں نے مجھے دھتکار دیا ہے حتیٰ کہ میں اپنے میکے اور سسرال والوں کے لیے بوجھ سی بن چکی ہوں۔ میں نے بہت اذیتیں سہی اور اب اس دنیا سے بیزار ہو چکی ہوں۔ میرے دل میں جتنے داغ ہیں اتنے میرے منہ میں الفاظ نہیں لہٰذا اپنے دکھوں کو بیان نہیں کر سکتی البتہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ تو میرے دل کے راز اور تمام حقیقتوں سے واقف ہے۔ شادی کے بعد ابھی دم بھی نہ لینے پائی تھی کہ لینے کے دینے پڑ گئے اور خوشی کے موقع پر دکھ نے ساتھ نہ دیا اور غم کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ایک خوشی بھی آئی تو اس نے ایسا غم دیا اور ایک ہنسی نے ایسا گل کھلایا۔ نہ جانے یہ کیسی شادی تھی کہ جس کی پرچھائیں پڑتے ہی اس نے چین نہ لینے دیا اور سبھی خوشیوں کو ملیامٹ کر دیا۔ میرا دل اتنا تنگ ہے کہ یہاں رو نہیں سکتی اور اگر روؤں بھی تو کہاں تک روؤں اور ہنس ہنس کر دل کیسے بہلاؤں اور کس طرح پیاس بجھاؤں بھلا ایک اکیلے انسان کا جینا بھی کوئی جینا ہوتا ہے۔ ایک شخص بھلا اکیلے کیسے ہنس سکتا ہے اور کیسے رو سکتا ہے۔ اگر لیٹنے جاتی ہوں تو نہ سرہانے کل نظر آتا ہے اور نہ پائنتی کل دکھتا ہے۔ جاگنے پر بھی کوئی راستہ نظر نہیں آتا بالآخر جاگنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے لہٰذا اب مجھے مر کر ہی چین آئے گا۔ زندگی سے بیزاری کا عالم یہ ہو چکا ہے کہ باتوں سے نفرت ہونے لگی ہے اور کام سے وحشت ہوتی ہے اور بجھی بجھی سی طبیعت رہتی ہے۔ اتنی آبادی کے بعد بھی یہ دنیا مجھے سونی اور جنگل کا نمونہ لگتی ہے۔ میری پوری جوانی ایسی گزری جس میں دن بھیانک اور رات ڈراؤنی ہوتی تھی۔

میرے ساتھ کھیلنے والی میری بہنیں اور سہیلیاں بھی مجھ سے جی کھول کے نہ مل سکیں اور جب بھی وہ آئیں تو یہاں سے رو دھو کے گئیں۔ میرے پاس اب دل بہلانے کا کوئی سامان باقی نہ رہا لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی میرا ابلاوا نہیں آتا۔ میری یہ حالت آٹھوں پہر ایسی ہی رہتی ہے۔ دکھ سہتے سہتے میں تھک چکی ہوں اور اتنا رونے کے بعد میرے آنسو بھی تھم گئے ہیں۔ میں اندر ہی اندر گھلتی اور گھٹتی جا رہی ہوں۔ میری خاموشی کا خیال کسی کو نہ آیا کہ میں کس حال میں اپنی جان دیتی جا رہی ہوں اور میرے اندر دبی چنگاری کس طرح اندر سلگ رہی ہے حتیٰ کسی نے میری خبر بھی نہ لی بلکہ لوگ شادی بیاہ کی خوشیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ آئے دن نئے نئے تہواروں خوشی، چیت، پھاگن کی ہواؤں کا چلنا اور ساون کی گھٹاؤں کا چھانا، گرمیوں کی چاندنی راتیں یہ سب میں نے کیسے کاٹی ہیں لیکن یہ باتیں میں کس سے کہوں؟ چاہتوں

اور خوشیوں کے سبھی لمحات اس وقت آتے ہیں جب انسان دل و جان سے خوش ہو۔ یہ تمام لمحات ایک طرف سے دکھوں میں خوشی کا سامان بن کر اترتے ہیں تو ساتھ ہی دل جلانے اور تکلیف کی وجہ بھی بنتے ہیں۔ اگر گھر میں بارش ہو رہی ہو اور آپ کا محبوب پردیسی ہو تو ایسی برسات زندگی میں ہرگز نہیں آنی چاہیے۔ میری جوانی کے دن ایسے کٹے جیسے کوئی پنچھی باغ میں قید ہو اور اس کی ساری زندگی پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکراتے گزر گئی ہو اور وہ پر ہوتے ہوئے بھی اڑ نہ سکا ہو۔ بہر حال لوگوں کو اس سے خوشیاں ضرور میسر ہوتی ہیں لیکن مجھے میری شادی راس نہیں آئی۔ میں نے ایک امید باندھی تھی لیکن مجھے اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ گویا چند لمحوں کی بہار تو میری زندگی میں آئی مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے پھول تو کھلا مگر پھل نہ لگا اور چاند تو دکھائی دیا مگر اس چاند پہ میں ہرگز عید نہ منا پائی۔ میں اس پھل کی خاطر برچھی تو کھائی مگر پھل نہ ملا اور جان بھی دے ڈالی اور ریت میں چمکتے ہوئے ذرات کو دیکھ کر میں جھیل سمجھ کر اس کی طرف دوڑی پھر قریب جا کر میں نے ہر طرف نظر دوڑائی تو مجھے پانی کی ایک بوند بھی نہ دکھائی دی۔

حالیؔ اس نظم کے پانچویں بند میں بیوہ کی روداد اس طرح رقم کرتے ہیں۔ اے دین و دنیا اور حاکم و رعایا کے مالک تو ہی طاقت ور اور کمزوروں کا سرپرست ہے اور تو ہی پوری دنیا کا والی و حاکم ہے۔ دنیا کے کونے کونے تیری بخشش عام ہے۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان سب تیرے چشمہ فیض سے سیر اب ہو رہے ہیں۔ بس وہی لوگ تیری رحمت سے مایوس ہیں جن کی قسمت میں نہیں لکھا ہے ورنہ تو نے اپنے فیض کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے۔ سارے چرند و پرند، شیر و بکری کو تو ہی رزق عطا کرنے والا ہے۔ تیری رحمت کا در سب پر کھلا ہے۔ ہر طرف نعمت کا مینھ برس رہا ہے۔ اے اللہ تو نے ہی خاک سے بیج اور پھر اس سے پودے بنائے۔ سیپ میں گہر اور شہد کی مکھی کو امرت بخشا۔ شاخوں میں پھل اور پھول تو نے ہی پیدا کیے۔ کان میں ہیرا، حیوانوں میں مشک کا پیدا کرنے والا تو ہی ہے۔ جگنو کو روشنی اور ذروں کو کندن کی چمک عطا کی۔

اے میرے مولا تیرے کرمِ فیض سے ہر چھوٹا، بڑا، اعلیٰ و ادنیٰ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر وہ بد قسمت کیا کرے جس کی خود کی زمین بنجر ہے تو مینھ کو الزام کیونکر دوں۔ سب خاص و عام کو تیرا انعام مل رہا ہے مگر میں تیرے انعام کے قابل ہی نہیں تھی۔ تیری سرکار میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اگر میری جھولی میں بھی کچھ آ جاتا تو تو تیری رحمت میں کچھ کمی نہ ہو جاتی۔ میں تیری حکومت میں بھوکے پیٹ سو رہی ہوں۔ اگر تیری نعمتوں سے مجھ کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو مجھے اس دنیا میں بھیجا ہی کیوں؟

اعضا و جوارح تو بخشا لیکن اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکی۔ گنگا بہتی رہی اور میں پیاسی رہی۔ چین و سکون سب چھن گیا۔ اس لائق بھی نہیں ہوں کہ کسی کے کام آ جاؤں۔ میری تقدیر نے کیا ساتھ چھوڑا، سب اپنے بیگانے ہو گئے۔ تیرے کرم سے پورا خاندان ہے، ماں، باپ، بھائی، بہن سب موجود ہیں لیکن کسی کو میری پرواہ نہیں ہے۔ عزیز و اقارب سب نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ سونے گھر میں رہنے پر مجبور ہوں۔ جس کے دل میں تیرا خوف باقی ہے کبھی کبھار احوال پرسی کر لیتے ہیں۔ کسی پر اپنا اختیار باقی نہ رہا۔ تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ اگر مجھے بھی چین و سکون میسر ہوتا تو کسی کے در پر کیوں پڑی رہتی۔ زمانے کے دکھ نہ سہنے پڑتے، تو خوب جانتا ہے کہ مصیبت میں ماں، باپ، بھائی، بہن سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی فقیر نے سچ ہی کہا تھا، خوشحالی میں ہر کوئی اپنا دوست ہوتا ہے۔

چھٹے بند میں بیوہ اللہ سے فریاد کرتی ہے کہ تیرے سوا میری رام کہانی کون سن سکتا ہے۔اپنی مصیبتوں کا دکھڑا کس سے بیان کروں۔اللہ نہ کرے کسی دشمن کا ایسا حال ہو،خاندان کے کسی فرد کا سہارا نہ رہا۔سب کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی ہوں،اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو مر جاتی کیوں کہ سب میرے جینے سے پریشان ہیں۔جب میں روتی ہوں تو پورا گھر روتا ہے اور لوگوں کے ڈر سے ہنس بھی نہیں سکتی۔میرا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔سسرال میں جاتی ہوں تو سب مجھے منحوس کہتے ہیں اور میکے میں میرے رونے سے سب پریشان ہوتے ہیں۔اپنی مرضی سے کہیں جا بھی نہیں سکتی اور نہ اچھا کھا اور پہن سکتی ہوں۔بناؤ سنگھار کرنا چھوڑ دیا ہے۔عطر، آنکھوں میں سرمہ،بالوں میں کنگھی چوٹی،کانوں میں بندے،ہاتھوں میں چوڑیاں پہننا چھوڑ دیا ہے۔کیوں کہ ایک بیوہ کے لیے یہ چیزیں زیب نہیں دیتی۔اپنی ہستی کو مٹالیا ہے باوجود اس کے ہر طرف میرے ہی بد قسمتی اور منحوسیت کے چرچے ہو رہے ہیں۔اگلے لوگوں نے سچ ہی کہا ہے"بد اچھا،بدنام برا"۔دنیا کے طعنوں سے گھبرا کے دل چاہتا ہے کہ مر جاؤں۔اے کاش میری ماں نے مجھے پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔دینا کی پریشانیوں سے آزاد ہوتی۔اے مصیبت زدوں کی پناہ گاہ،اے ڈوبتی کشتی کو ساحل تک پہنچانے والے،میری بھی کشتی طوفان میں ہے، کسی بھی وقت غرقِ آب ہو سکتی، تیرے سوا کوئی بھی میری کشتی کو پار نہیں لگا سکتا۔

آگے کے بند میں بیوہ آسمان کے تاروں،در و دیوار،مانوس اور ڈراونی راتوں،فرشتوں اور جسم کے ایک ایک عضو کو مخاطب کرکے کہتی ہے کہ سب کو ایک دن اس دنیا سے جانا ہے اور رب کو منھ دکھانا ہے۔اس کے سامنے سب کے نامہ اعمال پیش کیے جائیں گے لہٰذا اس دن سے ڈرو اور جب میرے حق میں گواہی دینے کا وقت آئے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دینا۔میں اپنی پارسائی کا قصیدہ نہیں پڑھ رہی ہوں کیوں کہ ہر انسان سے کچھ نہ کچھ خطا کا امکان ہے چاہے وہ ولی ہو یا رشی منی۔میں اپنی خطائیں شمار کرنے لگوں تو گن نہیں سکتی۔پھر بھی خدا سے کہوں گی کہ اپنی بات سے پلٹی نہیں،جس کے حوالے قسمت نے کر دیا تھا آخر تک اس کا ساتھ دیا۔قوم و ملت اور دیس سے منھ نہیں موڑا اور خدا سے کیے عہد و پیمان کو درکنار نہیں کیا۔اس کے باوجود دنیا والوں کو یقین نہیں ہے تو مجھے اس کا کوئی ڈر نہیں ہے۔میرا نگہبان اور رکھوالا اللہ ہے جو سب سے بڑا اور جاننے والا ہے۔

آٹھویں بند میں بیوہ اللہ سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ ہم سب کے ایمان کا محافظ تو ہی ہے اور دلوں کے بھید سے تو ہی واقف ہے۔مجھے دنیا والوں سے کوئی سروکار نہیں ہے میں تجھ سے انصاف کی طلبگار ہوں۔میں نادان تھی جو دنیا والوں کے بہکاوے میں آگئی۔اگر میں تیرے حکم پر عمل کرتی تو آج چین و سکون سے زندگی بسر کر رہی ہوتی۔

حالیؔ اس بند میں بیوہ کی زبانی غلط رسم و رواج میں جکڑا ہوا قوم کا چہرہ پیش کر رہے ہیں کہ اللہ نے کب ایک بیوہ کو نکاحِ ثانی کرنے سے روکا ہے۔اس کا بھی پورا حق ہے کہ وہ متاعِ دنیا سے فائدہ اٹھائے لیکن دنیا والے ایک بیوہ کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔وہ سماج میں کھل کر سانس نہیں لے سکتی۔سماج کے غلط رسم و رواج اسے گھٹ گھٹ کے جینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔وہ پوری زندگی اپنی عفت و پاکدامنی ثابت کرنے میں گزار دیتی ہے۔قوم کے اس غلط رسم و رواج میں وہ اس قدر جکڑ چکی ہوتی ہے کہ اس سے فرار ناممکن ہو جاتا ہے۔کسی راجکماری نے سچ ہی کہا تھا"لاچاری و مجبوری پہاڑ سے زیادہ سنگین ہوتی ہے۔"

اس کے بعد شاعر بیوہ کی زبانی خطا کے احساس اور خودی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ چوں کہ میں بھی پانی اور مٹی سے تخلیق کی گئی ہوں اس لیے برائی سے پاک بھی نہیں ہوں پھر بھی حتی المقدور میں نے اپنے اعضاءوجوارح کو برائی کرنے سے بچایا اور کسی غلط کام کرنے کی طرف قدم نہیں اٹھایا۔ خود پر مکمل قابو رکھتے ہوئے میں نے اپنی بیوگی کے دن گزارے ہیں۔ مگر ایک چیز جس پہ قابو پانا مشکل تھا وہ میرا دل ہے اور اے خدا تو میرے دل کے پوشیدہ راز سے بھی آگاہ ہے۔ میری حالت ایسی تھی جیسے ریت پر تڑپتی ہوئی مچھلی ہو جس کی نہ جان ہی نکلتی تھی اور نہ اس کے سر سے دھوپ ہی ٹلتی تھی۔ میں نے بڑی بے چینی اور کرب میں یہ لمحات گزارے ہیں پھر بھی میں نے دل کی کوئی بات نہ مانی اور خود کو برائی سے دور رکھا۔

اے خدا تیری ذات ہر چیز سے واقف ہے۔ بہر حال میں اپنے لیے تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اس دنیا میں صرف میں ہی اکیلی دکھی عورت نہیں ہوں بلکہ مجھ جیسی لاکھوں عورتیں ہیں جو اس دکھ درد سے دوچار ہیں۔ جن کی شادی ہوتے ہی سہاگ اجڑ گیا اور شادی کے باوجود بھی کنواری بیٹھی رہیں اور جو بلکتی ہوئی آئیں لیکن سسکتی ہوئی گئیں۔ ان تمام دکھ درد کے باوجود اب بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کی تکلیف پہ غور کر کے اس کا مداوا کرے۔ جن کے دلوں میں ایسی چوٹ نہ لگی ہو وہ ان کے دکھ درد کو کیسے سمجھ سکتا ہے؟ یہ دنیا ایک ریت کی دیوار کی مانند ہے جس کا اصل سکون سہاگ کے ساتھ ہے گویا اس کا تعلق ایک ناؤ جیسا ہے۔ دنیا کا یہی طریقہ برسوں سے چلا آرہا ہے کہ یہاں کسی کی جیت ہوتی ہے تو کسی کی ہار ہوتی ہے۔

اس نظم کے آخر میں شاعر بیوہ کی زبانی خدا کی ذات اور اس کے رحم و کرم پر بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے اللہ تیری ذات ہی وہ ایک ذات ہے جس کے سوا کوئی نہ باقی رہا ہے اور نہ باقی رہے گا۔ بس اے خدا میں صرف تیری ہی محبت چاہتی ہوں اس کے علاوہ مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔ مجھے بس ایک ایسا گھونٹ پلا دے کہ میں تیرے علاوہ سب کچھ بھلا بیٹھوں اور تیرے سوا میرے اس دل میں کوئی دوسرا یاد کرنے سے بھی نہ آئے۔ اے اللہ میرے دل میں بس اپنی ذات کی لگن جگا دے اور میرے سارے غموں کو اپنی ذات میں کھپا دے۔

6.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا حالیؔ اردو کے ایک بہترین ادیب تھے ساتھ ہی کامیاب نظم نگار بھی تھے۔
- حالیؔ نے نظم نگاری کی روایات کو جدید تقاضوں سے وابستہ کیا۔ وہ اردو کے پہلے جدید نظم نگار شاعر قرار دیے جاتے ہیں۔
- حالیؔ نے مصطفیٰ علی خان شیفتہؔ اور مرزا غالبؔ سے شعری تربیت حاصل کی۔
- پانی پت میں پیدا ہوئے لیکن دلی میں علمی و ادبی ذوق کو جلا ملی۔
- حالیؔ نے شاعری میں "مسدس حالی" اور نثر میں "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر اردو ادب میں اہم اضافے کیے۔
- وہ ایک ہمہ جہت نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند شاعر بھی ہیں۔

- حالیؔ نے غزل کے علاوہ جدید مثنوی، شخصی مرثیے، موضوعاتی نظمیں، پیامی شاعری اور نیچرل شاعری کے ذریعہ اردو شاعری میں ایک اہم مقام بنایا۔
- حالیؔ سادہ زبان استعمال کرنے کے حامی تھے چنانچہ ان کی تمام تر شاعری میں عربی اور فارسی کے الفاظ کم ہیں۔
- مولانا الطاف حسین حالیؔ نے عورتوں سے ہمدردی کے لیے نظمیں لکھیں۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کو تہذیب و تعلیم کا گہوارہ بنانے کے لیے عورتوں کو ان کے جائز حقوق دینے پر اصرار کیا۔
- انھوں نے عورت کی بے بسی، مظلومیت اور حقوق کی پامالی کے لیے آواز اٹھائی اور طبقہ نسواں کے ناگفتہ بہ حالات کا ذکر اپنی نظم "مناجات بیوہ" میں کر کے ہمدردی کے جذبات کو ابھارا ہے اور بیوہ کی حالت زار بیان کی ہے۔
- یہ نظم مولانا حالیؔ نے 1884ء میں "ھادم اللذات" نام سے شائع کی تھی جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ 1888ء میں اس میں کچھ ترمیم و تنسیخ کر کے اس کو "مناجات بیوہ" کے نام سے شائع کیا۔
- اس نظم میں حالیؔ نے ہندوستانی عورت کی بیوگی کی دل خراش تصویر کشی کی ہے۔ نظم کا ہر لفظ درد اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس نظم میں بیوہ عورت کی زندگی کے درد و کرب اور محرومی کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ حالی نے جوان بیوہ کی مصیبتوں، کلفتوں اور جذبات و احساسات کو محسوس کیا ہے۔ یہ نظم "مناجات بیوہ" مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔
- جیسا کہ نام ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں بیوہ کی مناجات کو بیان کیا گیا ہے اور وہ بیوہ عورت پروردگار کی بارگاہ میں اپنی التجا پیش کرتی ہے۔

6.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
اکتساب	:	ذاتی محنت سے حاصل کرنا
تقلید	:	کسی کے قدم بہ قدم چلنا
ہیئت	:	بناوٹ، شکل
امرت	:	آب حیات، آب بقا
بھید	:	راز
دھتکار	:	لعنت ملامت، ڈانٹ ڈپٹ
بھوبھل	:	ایسی راکھ جو کچھ گرم ہو اور جس میں ابھی کچھ انگارے یا شعلے دبے ہوئے ہوں
خستہ حال	:	بدحال، مفلس

برکھا	:	برسات
بدیس	:	پردیس
ساون	:	ہندی کیلنڈر کے پانچویں مہینے کا نام
ٹھکانا	:	پناہ گاہ، منزل، مقام
چمکارنا	:	دلار کرنا، پیار کرنا
اٹکل	:	قیاس، قرینہ
بن باس	:	جلاوطنی، دیس نکالا
کھونٹ	:	سمت، طرف
ملیامیٹ کر دینا	:	تباہ وبرباد کر دینا
چیت	:	ہندی کیلنڈر کا پہلا مہینہ
پھاگن	:	ہندی کا آخری مہینہ

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

6.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. حالی کی جائے پیدائش بتائیے؟
2. کس کے مشورے پر حالیؔ نے قومی اور وطنی شاعری شروع کی؟
3. حیات جاوید کا موضوع کیا ہے؟
4. حالیؔ کے والد کا نام بتائیے؟
5. "مناجات بیوہ" کا موضوع کیا ہے؟
6. "یادگار غالب" کس کی تصنیف ہے؟
7. "مقدمہ شعر وشاعری" پہلی مرتبہ کس سن میں شائع ہوئی؟
8. حالیؔ کی تاریخ وفات کیا ہے؟
9. صالحہ عابد حسین کی حالیؔ پر لکھی ہوئی کتاب کا نام کیا ہے؟
10. "حالی بہ حیثیت شاعر" کے مصنف کا نام بتائیے۔

6.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. حالیؔ کی نظموں کی لفظیات کا جائزہ لیجیے۔

2. حالیؔ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ بیان کیجیے۔

3. حالی کی شاعری میں حقیقت پسندی کا جائزہ لیجیے۔

4. "مناجات بیوہ" کی روشنی میں حالی کی زبان و بیان کی خوبیوں کو اختصار کے ساتھ لکھیے۔

5. درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

اے بے وارث گھروں کے وارث	بے بازو بے پروں کے وارث
بے آسوں کی آس ہے تو ہی	جاگتے سوتے پاس ہے تو ہی
بس والے ہیں یا بے بس ہیں	تو نہیں جن کا وہ بے کس ہیں
ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا	دسرایت کی وہاں نہیں پروا
دل میں ہے جن کے تیری بڑائی	گنتے ہیں وہ پربت کو رائی
بیکس کا غم خوار ہے تو ہی	بری بنی کا یار ہے تو ہی
دکھیا دکھی یتیم اور بیوہ	تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا
تو ہی ڈبوئے، تو ہی ترائے	تو ہی یہ بیڑے پار لنگھائے

6.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا حالیؔ کے سوانحی حالات بیان کیجیے۔

2. اردو نظم نگاری میں حالیؔ کا مقام و مرتبہ متعین کیجیے۔

3. "مناجات بیوہ" کا خلاصہ لکھیے۔

6.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. حالی اور نیا تنقیدی شعور — اختر انصاری

2. تذکرہ حالیؔ — محمد اسمٰعیل پانی پت

3. مولانا حالیؔ — انوار الحسن

4. ارمغانِ حالیؔ — حمید احمد خاں

5. حالی بہ حیثیت شاعر — شجاعت علی سندیلوی

6. تحقیقی مطالعہ حالی — ظہیر احمد صدیقی

اکائی 7: اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری: برق کلیسا

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 اکبر الہ آبادی کے حالات زندگی

7.3 اکبر الہ آبادی کی ادبی خدمات

7.4 اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری

7.5 نظم "برق کلیسا" کا متن

7.6 نظم "برق کلیسا" کا تنقیدی تجزیہ

7.7 اکتسابی نتائج

7.8 کلیدی الفاظ

7.9 نمونہ امتحانی سوالات

7.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

لسان العصر اکبر الہ آبادی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ اپنے وقت کے مقبول ترین شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو، سروجنی نائیڈو اور مدن موہن مالویہ وغیرہ جیسی شخصیات سے ملنا جلنا تھا۔ وہ علامہ اقبال، سر سید، حالی اور خواجہ حسن نظامی کے معاصرین

میں تھے۔ بلکہ نظریاتی طور پر اقبال اور حالی کے کافی حد تک قریب بھی تھے۔ اس لیے کہ دونوں کا مقصد سماجی و معاشرتی اصلاح اور بیداری تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اظہار و اسلوب کے طریقے مختلف تھے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری کا آغاز سنجیدہ شاعری سے کیا تھا اور بہت سی غزلیں اس وقت کے عام روش کے مطابق کہیں بھی تھیں جو نہایت مقبول بھی ہوئیں لیکن پھر وہ جلد ہی سنجیدہ شاعری سے کنارہ کش ہو گئے اور طنز و ظرافت کو اپنا شعار بنا لیا۔ اکبر کے زمانے میں ہی ان کا خاص طرز اسلوب اس قدر مقبول ہو گیا تھا کہ اسے ''اکبری رنگ'' کہا جانے لگا تھا۔ اردو نظم کے فروغ میں اکبر الہ آبادی کی نظمیہ شاعری کا اہم حصہ ہے۔ اس اکائی میں ہم اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری اور ان کی نظم "برق کلیسا" کا مطالعہ کریں گے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اکبر الہ آبادی کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- اکبر الہ آبادی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔
- اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- نظم "برق کلیسا" کے متن کی قرات کر سکیں۔
- نظم " برق کلیسا" کا تجزیہ کر سکیں۔

7.2 اکبر الہ آبادی کے حالات زندگی

اکبر الہ آبادی کا سلسلہ نسب چھپن واسطوں سے امام رضا سے پھر آگے جا کر یہ سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہ سے مل جاتا ہے۔ آپ کا خاندان 623 ہجری میں ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ معزز خاندان تھا۔ جاگیریں اور عہدے بھی ان کو دیے گئے تھے۔ دادا کا نام فضل محمد تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے، سید وارث علی، سید واصل علی اور تفضل حسین۔ تفضل حسین کے دو بیٹے تھے۔ سید اکبر حسین اور اکبر حسن، ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام سیدہ تھا۔ سید اکبر حسین ادبی دنیا میں اکبر الہ آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش 1846 میں بمقام ''بارہ'' میں ہوئی۔ بارہ صوبئہ اتر پردیش کے ضلع الہ آباد کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جہاں اکبر کے چچا سید وارث علی تحصیل دار تھے، تفضل حسین بھی انھیں کے ساتھ رہتے تھے۔ اکبر کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد خاندان کے لوگ داؤد نگر (بہار) چلے گئے۔ یہاں اکبر کے دادا رہتے تھے۔ یہیں پر اکبر کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ عربی، فارسی، اردو اور ریاضی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ والد صاحب

ریاضی کے ماہر تھے لہٰذا انھوں نے اس کی تعلیم خود ہی دی۔ گھر پر مذہبی ماحول تھا والد کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا کچھ عرصے تک وہ نائب تحصیلدار بھی رہے لیکن پھر اس سے دست بردار ہو گئے اور اپنی باقی زندگی مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں گزار دی۔ والدہ نجیب الطرفین زمیندار گھرانے کی نیک سیرت خاتون تھیں۔ اکبر کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتی رہیں۔ اکبر کے ابتدائی چند سال داؤد نگر اور سورام میں گزرے۔ پھر 1856 میں ان کے والدین الہٰ آباد میں منتقل ہو گئے اور مستقل طور پر یہیں رہنے لگے۔ اس وقت تک ہندوستانی سماج میں انگریزی تعلیم کی اہمیت محسوس کی جانے لگی تھی۔ اگرچہ سماج کا ایک بڑا طبقہ اس سے متنفر تھا اور وہ مشن اسکول کی تعلیم کو اپنی تہذیب کے خلاف سمجھتا تھا۔ چوں کہ اکبر کے خاندان میں کئی لوگ حکومت کے عہدوں پر فائز تھے اس لیے انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا اور اکبر کو 1856 میں جمنا مشن اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ابھی ان کی تعلیم کے ایک سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کا ہنگامہ برپا ہو گیا اور ان کی درسی تعلیم بند ہو گئی۔ اس جنگ کے بعد انگریز مکمل طور پر ملک پر قابض ہو گئے۔ چوں کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور 1857 کی جنگ میں بھی مسلمان پیش پیش تھے اس لیے جنگ ختم ہونے کے بعد ان کے عتاب کا شکار بھی سب سے زیادہ مسلمان بنائے گئے۔ ان کی جائدادیں قرق کر لی گئیں۔ عہدوں سے برطرف کر دیا گیا اور طرح طرح کی ظلم و زیادتی کو مہینوں تک جاری رکھا گیا۔ اکبر کے والد کو بھی ایک گاؤں سے تیس ہزار روپئے کی ماہانہ آمدنی تھی وہ بند کر دی گئی۔ گویا والدین مالی طور پر تنگ دست ہو گئے جس کی وجہ سے اکبر اپنی درسی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ البتہ ذاتی مطالعہ کا شوق عمر کے آخری حصے تک رہا۔ انگریزی، عربی، فارسی، ریاضیات، دینیات اور شعر و ادب کا مطالعہ پابندی کے ساتھ کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے ان کا شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد میں ہونے لگا۔

گھر کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اکبر نے کئی چھوٹی چھوٹی عارضی ملازمتیں کیں۔ ریلوے میں کلرک کی حیثیت سے کام کیا، 1867 میں وکالت کا امتحان دیا اور ایک انگریز رونسن کے ماتحت وکالت کرنے لگے، 1873 میں دوبارہ امتحان دیا اول درجہ میں کامیابی حاصل کر کے ہائی کورٹ کے وکیل بن گئے۔ 26 نومبر 1880 کو منصفی کا عہدہ سنبھالا۔ مئی 1881 میں بحیثیت منصف مستقل تقرری بجنور میں ہوئی، 1882 میں سرسید احمد خان اور سمیع اللہ خان کی مشترکہ سفارش سے ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ 1888 میں ان کا تبادلہ غازی پور ہو گیا جہاں وہ سب جج کے عہدے پر فائز رہے، 1892 میں ان کا تقرر آگرہ میں ہوا جہاں وہ جج کے علاوہ انچارج ڈسٹرکٹ سیسن جج بھی رہے۔ اسی طرح بہ حیثیت منصف انھوں نے کانپور، جھانسی، جونپور، گونڈہ، بنارس اور مرزاپور وغیرہ اضلاع میں بحسن و خوبی خدمت انجام دی۔ آخر میں وہ مستقل طور پر الہٰ آباد آ گئے یہاں وہ جج خفیفہ اور پھر سیشن جج کے عظیم عہدے پر فائز رہے۔ 1898 میں انگریز گورنمنٹ نے جوڈیشیل خدمات کے صلے میں خان بہادر کا خطاب دیا۔ 1905 میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

اکبر کے سوانح حیات کا ایک ناقص پہلو ان کی ازدواجی زندگی ہے۔ جس سے نفسیاتی طور پر وہ تاحیات پریشان رہے۔ عام رواج کے

مطابق ان کی شادی محض چودہ سال میں ایک زمیندار گھرانے کی بیٹی خدیجہ خاتون سے کر دی گئی۔ اکبر کو خدیجہ بالکل پسند نہ آئیں اس لیے کہ ایک تو وہ معمولی شکل وصورت کی تھیں دوسرے یہ کہ دیہاتن تھیں۔ اکبر نے ایک اور شادی فاطمہ صغریٰ سے کرلی۔ اب دونوں بیویوں کے درمیان تنازع کے سے حالات رہنے لگے جس کی وجہ سے اکبر نے پہلی بیوی کو گھر سے الگ کر دیا۔ پہلی بیوی یعنی خدیجہ خاتون سے دو بچے تھے عابد حسین اور نذیر حسین۔ ماں ان دونوں بچوں کے ساتھ الگ گھر میں رہتی تھیں۔ اکبر نے ان دونوں بیٹوں کی تعلیم وتربیت سے کوئی دلچسپی نہیں لی بس اخراجات کی تکمیل کے لیے کچھ روپے ماہانہ بھیج دیا کرتے تھے۔ عابد حسین ذہنی مریض ہوگئے تھے ان پر اچانک جنون طاری ہو جاتا تھا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر جاتے تھے۔ ان کا باضابطہ علاج بھی نہیں ہو سکا۔ دونوں بیٹوں کو عشرت منزل میں آنے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ الغرض خدیجہ خاتون نے نہایت کسمپرسی کی حالت میں اپنی زندگی گزار کر 29 اکتوبر 1920 میں انتقال کر گئیں۔

فاطمہ صغریٰ سے تین اولاد ہوئیں۔ سب سے بڑے بیٹے عشرت حسین تھے۔ اکبر نے ان کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی۔ لندن بھیج کر تعلیم دلائی۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اپنے گھر کا نام عشرت منزل انھیں کے نام پر رکھا۔ اکبر کے ایک بیٹی تھی جو کم عمری میں ہی انتقال کر گئی تھی۔ 1913 میں ان کا سب سے چھوٹا اور چہیتا بیٹا ہاشم محض تیرہ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا۔ 1910 میں ان کی چہیتی بیوی یعنی عشرت کی والدہ انتقال کر گئیں۔ اب ان کی زندگی کا آخری سہارا سید عشرت حسین بچے تھے۔ یہ والد کے ساتھ آخری وقت تک رہے۔ اکبر کی بھی طبیعت مسلسل خراب رہنے لگی۔ طرح طرح کے امراض لاحق ہوگئے۔ وقت نزاع خواجہ حسن نظامی اور عشرت حسین ان کے پاس موجود تھے۔ بیہوشی کی سی حالت تھی۔ آخر قوم کا یہ ہمدرد شاعر 1921 میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

7.3 اکبر الہ آبادی کی ادبی خدمات

اکبر نے وحید الدین وحید کی شاگردی اختیار کی تھی۔ وحید کے استاذ بشیر تھے اور بشیر، خواجہ حیدر علی آتش کے تلامذہ میں آتے تھے۔ گویا اکبر کا سلسلہ تلمذ خواجہ حیدر علی آتش سے ملتا تھا۔ اکبر الہ آبادی نے گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ بہت کم عمری میں ہی فن پر پختگی حاصل کرلی تھی۔ طالب الہٰ آبادی اپنی کتاب "اکبر الہ آبادی" میں لکھتے ہیں کہ "سترہ سال کی عمر سے ایسا کہنے لگے تھے جسے خود انھوں نے اپنے کلیات میں جگہ دی"۔ ان کا کلام "کلیات اکبر" کے نام سے شائع ہوا۔ جس کے کل چار حصے ہیں۔ تین حصے تو ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئے اور بار بار شائع ہوتے رہے۔ شمس الرحمان فاروقی کے مطابق "اپریل 1936 تک کلیات حصہ اول کے گیارہ ایڈیشن نکل چکے تھے" اس سے ان کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چوتھا حصہ ان کے انتقال کے بعد 1948 میں شائع ہوا۔ اسی سال ایک اور مجموعہ "گاندھی نامہ" کے نام سے محمد نعیم الرحمٰن نے شائع کرایا۔ اس مجموعے میں 198 قطعات ہیں۔ جو سات مختلف

عنوانات کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ جن کے اشعار کی مجموعی تعداد 371 ہے۔ یہ دراصل مہاتما گاندھی پر کہے گئے متفرق اشعار کا مجموعہ ہے۔ جسے خود اکبر الہ آبادی نے ترتیب دیا تھا۔ یہ نام بھی انہیں کا تجویز کیا ہوا ہے۔ سرورق پر یہ شعر درج ہے۔

انقلاب آیا ،نئی دنیا ،نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا،اب دور گاندھی نامہ ہے

شاعری کے علاوہ نثر میں بھی ان کا معتد بہ حصہ موجود ہے۔ جن میں اچھی خاصی تعداد مکاتیب اور مضامین کی ہے۔ نثر میں ان کی پہلی کتاب "فیوچر آف اسلام" ہے۔ یہ در اصل انگریز مصنف ولفرڈ اسکاون بلنٹ کی انگریزی کتاب "فیوچر آف اسلام" کا اردو ترجمہ ہے۔ اکبر کے خطوط کا پہلا مجموعہ "مکتوبات اکبر" کے نام سے شائع ہوا۔ اسے مرزا سلطان احمد نے مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع کرایا تھا۔ اس میں جو خطوط چھپے ہیں وہ 1905 سے 1921 کے درمیان مرزا سلطان احمد کو لکھے گئے تھے۔ "مکاتیب اکبر" کے نام سے دو مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ سے 1922 میں شائع ہوا۔ اس میں خطوط کی مجموعی تعداد 253 ہے جو مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کو لکھے گئے ہیں۔ یہ سارے خطوط اکبر نے 1909 سے 1921 کے درمیان لکھے تھے۔ "مکاتیب اکبر" کا دوسرا حصہ مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی سے 1923 میں شائع کرایا۔ اس میں جو خطوط شامل ہیں وہ 1913 سے 1921 کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے ایک مجموعہ "خطوط مشاہیر" کے نام سے بھی شائع کرایا ہے لیکن اس میں اکبر الہ آبادی کے علاوہ مولا شبلی نعمانی اور مولانا محمد علی جوہر کے بھی خطوط شامل ہیں۔ "رقعات اکبر" کے نام سے بھی دو مجموعے ہیں جسے ساحل احمد اور محمد نصیر ہمایوں نے ترتیب دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط کی بڑی تعداد ایسی ہے جو اب تک شائع نہیں ہوئے اور اس کا اعتراف خواجہ حسن نظامی، سلطان احمد اور عزیز لکھنوی جیسے سبھی مرتبین مکاتیب نے اپنے اپنے دیباچوں اور مقدموں میں کیا ہے۔ مکتوبات کے علاوہ ان کی نثر کے نمونے مضامین کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔ جو لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کی ادارت میں نکلنے والے اخبار "اودھ پنچ" میں تواتر کے ساتھ چھپتے تھے۔

7.4 اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری

اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ ان کے کلیات کے پہلے حصے میں غزلیہ شاعری کی تعداد نظمیہ شاعری سے کہیں زیادہ ہے۔ نظم کی طرف وہ بہت بعد میں آئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں سترہ سال کی عمر سے لے کر ستائیس سال تک کا کلام شامل ہے۔ اس میں زیادہ تر عشقیہ غزلیں ہیں جس میں وہ حسن و عشق اور ہجر و وصال کی گفتگو کرتے ہیں۔ دوسرے دور کی شاعری میں ان کا تخیل اور وجدان وسیع ہونے لگتا ہے اور وہ خارجی مضامین اور محبوب کی سراپا نگاری سے کسی حد تک

دامن بچانے لگتے ہیں۔ تیسرے دور میں اخلاقی مضامین، قومی مسائل، دنیا کی بے ثباتی، تصوف، سیاست، وغیرہ مضامین جگہ پاتے ہیں۔ اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ موضوعاتی اعتبار سے ان کا کلام دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک وہ جس میں عاشقانہ رنگ غالب ہے دوسرا وہ حصہ جس میں مقصدی شاعری حاوی ہے۔ یہاں سے وہ غزل سے نظم کا رخ کرتے ہیں۔ وہ قطعہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ، مسمط، مسدس، وغیرہ نظمیہ اصناف کے ذریعہ تصوف، مذہب، اخلاق، سیاست اور تہذیب و تمدن کی باتیں کرتے ہیں۔

اکبر کی طبیعت فطری طور پر ظرافت کے لیے موزوں تھی۔ پھر یہ کہ وہ انگریز گورنمنٹ کے ملازم تھے اور ان کی نظموں کے زیادہ تر موضوعات بالواسطہ یابلاواسطہ حکومت اور مغربی تہذیب و ثقافت سے منسلک ہوتے تھے اس لیے انھوں نے شعوری طور پر طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کو اختیار کیا۔ پھر انھوں نے فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ یہی ان کی وجہ امتیاز بن گئی۔ ان کے عہد تک طنز و مزاح کے فن نے پختگی حاصل کر لی تھی لیکن اکبر نے اس میں نئے امکانات کے مزید راستے کھول دئے۔ انھوں نے اردو شاعری میں مزاحیہ اسلوب کو ایک وقار بخشا اور یہی خصوصیت ان کو اپنے معاصرین اور متقدمین شعرا سے الگ کرتی ہے۔ اکبر سے پہلے جعفر زٹلی اور مرزا محمد رفیع سودا اس فن میں شہرت حاصل کر چکے تھے، لیکن اس کی نوعیت قدرے مختلف تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سودا نے بعض لازوال مزاحیہ نظمیں اردو ادب کو دی ہیں، لیکن فنی ٹریٹمنٹ میں اکبر پیچھے ہیں۔ اگر موضوعاتی سطح پر بھی دیکھیں تو ان کے یہاں معاشی اور معاشرتی زوال کے علاوہ دوسرے سماجی عناصر بہت کم دکھائی دیں گے۔ جعفر زٹلی کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے وہ سماجی انحطاط کو اپنے طنز کا نشانہ تو بناتا ہے، لیکن وہ کسی فکری رجحان سے عاری ہوتا ہے۔ عیب کی نمائش تو ہوتی ہے مگر اصلاحی پہلو نظر نہیں آتا ہے۔ ظرافت میں اس قدر تلخی اور کڑواہٹ ہوتی ہے کہ وہ ہزلیات کے زمرے میں چلی جاتی ہے۔ جبکہ اکبر معاشرے کے نقاد ہیں ان کی نظموں کا تخاطب فرد نہیں قوم ہے۔ ان کے سامنے ایک پوری تہذیب دم توڑ رہی ہوتی ہے۔ سیاسی انحطاط نہیں اختتام ہے۔ یہاں ہندوستانیوں کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو جبری طور پر ملک پر مسلط ہے۔ نئی روشنی اور نئے تفکرات ہیں جس سے فکری تصادم بھی ہے اور بے بسی میں خاموشی بھی ہے۔ وہ ایسے سماج کی آئینہ داری کرتے ہیں اور انھیں ذلت و رسوائی سے بچنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی احمد محفوظ کے مرتب کردہ "کلیات اکبر" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "جعفر زٹلی کسی منظم تبدیلی اور تہذیبی و سیاسی شکست کے خلاف احتجاج نہیں کر رہے تھے۔ وہ صرف زمانے کے اونچ نیچ کی پروردہ بد حالی پر نالاں تھے۔ اکبر ایک پورے دور کی موت، ایک پوری تہذیب کی شکست، اور ایک پورے معاشرے کے زوال کے مرثیہ خواں تھے۔"

اکبر الہ آبادی پر لکھنے والے تقریباً سبھی محققین و مصنفین نے یہ قیاس لگایا ہے کہ ان کی پہلی باقاعدہ نظم "نامہ بنام اودھ پنچ" ہے۔

اکبر نے دراصل یہ نظم 1877 میں "اودھ پنچ" کے لیے لکھی تھی۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے اور کلیات اکبر کے پہلے حصے میں شامل ہے۔ اس طرح کی اور بھی کئی نظمیں ہیں جن کے عنوانات انھوں نے خود قائم کیے تھے۔ جیسے کہ جلوہ دربار دہلی، دربار 1911، کرزن سبھا، ووٹ بازی اور تعلیم نسواں وغیرہ۔ اسی طرح پونے تین سو کے قریب ایسی نظمیں ہیں جن پر عنوانات نہیں دیے گئے ہیں۔ خود اکبر نے مختلف خطوط کے ذریعہ اپنی نظموں کی تعداد تین ہزار کے قریب بتائی ہے جس کا تذکرہ محمد نصیر ہمایوں کے مرتب کردہ "رقعات اکبر" کے صفحہ 38 اور 64 پر ہے۔ جب کہ اکبر کی شائع شدہ نظموں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ دیگر نظمیں صرف ان کی بیاضوں میں ہی رہ گئیں وہ مختلف وجوہات کی بنا پر منظر عام پر نہیں آسکیں۔ اکبر کا زمانہ 1857 کے بعد کا زمانہ ہے جو سیاسی و تہذیبی طور پر انتشار کا زمانہ تھا۔ ہندوستانی ذہن اس حد تک مسخر ہو چکے تھے کہ لوگ مغرب کی ہر سازش کو اپنا مفاد سمجھتے تھے۔ انگریزی طرز معاشرت ترقی کی علامت سمجھی جانے لگی تھی۔ ایمان وعقائد کی پابندی قدامت پرستی سمجھی جانے لگی تھی۔ سیاست کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہی وہ منفی رجحانات تھے جن کے خلاف اکبر نے اپنی نظموں کے ذریعہ صدائے احتجاج بلند کی۔ ان کی نظمیہ شاعری تخریبی قوتوں کے خلاف ایک مستحکم آواز تھی جو مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کلیم الدین احمد ان کے کلام کا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "اکبر نے جو کچھ کیا وہ ناسمجھی اور ہٹ دھرمی کی بنا پر نہیں کیا۔ وہ ترقی کے خلاف نہ تھے۔ ترقی کی طرف قدم اٹھے اور ضرور اٹھے لیکن ذرا سوچ سمجھ کر۔ نئ چیزیں اچھی ہیں ، پرانی چیزیں بری ہیں، یہی نقطہ نظر عام ہو چلا تھا۔ وہ اس بے عقلی کے مخالف ہیں۔"
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، دی آزاد پریس، پٹنہ، 1966، ص 85)

اکبر نے عموماً نظم کی مروجہ ہیئت میں ہی اپنے خیالات کو پیش کیا ہے لیکن ان کے کلیات میں چند نظمیں ایسی بھی مل جاتی ہیں جن میں ردیف و قافیہ کا التزام نہیں رکھا گیا صرف بحر کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ اس طرح کی غیر مقفیٰ نظموں کو بعد میں معریٰ نظم کہا جانے لگا۔ ایسا نہیں ہے کہ اکبر معریٰ نظم کے بنیاد گزار ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس وقت بغیر قافیہ کے نظمیں کہنا بدعت تصور کیا جاتا تھا۔ تاریخی اعتبار سے معریٰ نظموں کے اولین لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی کا نام بھی شامل ہے۔ اس طرح کی دو نظموں کے چند اشعار یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

اجسام کے فنون کا کرتے ہیں خود عمل — اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس

ہوتا ہوں معترض تو کہتے ہیں واہ واہ — میں نے تو کردیا تیرا رتبہ بلند تر

اسی طرح ایک دوسری نظم ہے۔

چلا جاتا تھا ایک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلاقصد ضرر اسکو ہٹایا میں نے انگلی سے
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہات ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا

موضوعاتی لحاظ سے بھی یہ نظمیں اکبر کی عام روش سے بالکل الگ ہیں۔اسی طرح ان کی چند اور نظمیں بھی ہیں جو نیچر اور فطرت سے متعلق ہیں۔ جیسے کہ کوہ لب ساحل سے جو گزری ایک موج، دریا کی روانی اور دو تیتریاں ہوا میں اڑتی ہوئیں وغیرہ۔اکبر کی ایسی نظمیں "انجمن پنجاب" کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔ لیکن ظاہر ہے اس طرح کی نظموں سے ان کی شناخت نہیں بن سکتی وہ اصلاً مزاحیہ شاعر ہیں۔ادب میں ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ شمس الرحمان فاروقی کے اس قول سے لگا جا سکتا ہے جو انھوں نے احمد محفوظ کے مرتب کردہ "کلیات اکبر" کے دیباچے میں ہے کہ "اکبر کی عظمت کا اعتراف طنزیہ شاعری کی عظمت کا اعتراف ہے"۔

7.5 نظم "برق کلیسا" کا متن

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدر رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل جھپکے
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
آتش حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطف تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حسن بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ترکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیور کو چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے انسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامان اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

دشمن صبر کی نظروں میں لگاوٹ آئی
کامیابی کی دل زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحت روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح

شجر طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالد جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے رہیں سبحان اللہ

جوہر تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نور ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحث بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موج کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیر مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم
تو نکالو دل نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

7.6 نظم "برق کلیسا" کا تنقیدی تجزیہ

یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے اور "کلیات اکبر" کے پہلے حصہ میں شامل ہے۔ اکبر نے یہ نظم 1907 میں لکھی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریز مکمل طور پر قابض تھے۔ انگریز جب محض تاجر کی حیثیت سے یہاں رہتے تھے تو اس وقت ہندوستانی ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن جب وہ حکمراں بن گئے اور مغلیہ سلطنت پورے طور پر ختم ہوگئی تو خود ہندوستانی ان کو برتر سمجھنے لگے اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اگر یہ مہذب نہ ہوتے تو ہمارے حکمراں کیوں کر بن جاتے۔ اس فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کی جانے

لگی۔ خصوصاً نوجوان نسل خود کو ترقی یافتہ انگریز قوم کے مثل دکھانے کے لیے اپنی قومی وضع قطع کو ترک کرنے لگی۔ مغربی علوم وفنون کو اہمیت دی جانے لگی اور اسلامی علوم وروایات سے روگردانی کی جانے لگی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عہدے اور معیشت کے ذرائع انگریزی تعلیم سے منسلک کر دیے گئے تھے اور مشرقی ادبیات اور علوم وفنون کو بے مصرف بنا دیا گیا تھا۔ تعلیمی نظام میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ تہذیبی وفکری تبدیلی بھی آئی۔ ہندوستانی سماج میں ایک طبقہ وہ تھا جو مغربیت زدہ تھا وہ اپنی ہر دیرینہ روایات سے دست بردار ہونا چاہتا تھا دوسرا طبقہ وہ تھا جو مغربی تعلیم سے استفادہ کا تو قائل تھا لیکن وہ اپنی قومی اور مذہبی شعار سے کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ انگریز حکمرانوں کی ہمسری اپنی تشخص اور عزت نفس کے ساتھ چاہتا تھا۔ الغرض یہ کہ بیسویں صدی کا ہندوستان تہذیبی اور فکری لحاظ سے عجیب کشمکش سے دوچار تھا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی نظموں خصوصاً "برق کلیسا" کے ذریعہ یہ ذہن سازی کی مغربی قوم کی ظاہری چمک دمک سے مبہوت ہو کر اپنی تہذیب اور تاریخ تاریخ سے شرمندہ نہ ہوں بلکہ اپنے مقابل کے سامنے اس کی حقیقی تصویر پیش کریں تا کہ تمہارے اندر خود اعتمادی اور خود شناسی کا جذبہ برقرار رہے۔

پوری نظم دو کرداروں کے ذریعہ بیانیہ پیرایہ میں پیش کی گئی ہے۔ یہ ایک طرح سے مکالماتی نظم ہے لیکن اس مکالمے کو صرف ایک لڑکا اور لڑکی کے مکالمے نہ سمجھے جائیں بلکہ اس نظم میں مس یعنی انگریز خاتون مغربی ذہن وفکر کی نمائندہ ہے اور لڑکا ہندوستان کے ان نوجوانوں کی نمائندگی کر رہا ہے جو بظاہر تو مسلمان ہیں لیکن اب ان کے اندر سے اسلام کی روحانیت اور طرز فکر واحساس ختم ہو چکا ہے۔ اسی طرح نظم کا عنوان "برق کلیسا" کا لغوی معنیٰ عیسائی عبادت خانہ کی بجلی کے ہوتے ہیں جبکہ علامتی معنیٰ مغربی تہذیب کی چمک دمک ہے اور نظم کی صحیح تفہیم کے لیے یہی معنیٰ مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔

نظم کے ابتدائی سات اشعار انگریز دوشیزہ کے حسن وجمال کی تعریف میں ہیں۔ جو غلو آمیز ہیں۔ یہ ایک طرح سے روداد ہے جسے کردار واحد متکلم ایک منظر کے طور پر بیان کر رہا ہے۔

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار — ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے — دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل جھپکے
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں — سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
آتش حسن سے تقوے کو جلانے والی — بجلیاں لطف تبسم سے گرانے والی

اکبر الہ آبادی نے الفاظ کے بہترین انتخاب اور تشبیہ استعارے کے ذریعہ لڑکی کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے ایک سحر آمیز جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ خاص طور پر تراکیب، تشبیہات اور عایت لفظی نے اشعار کو مترنم بنا دیا ہے اور اس میں روانی سی کیفیت پیدا ہو گئی

ہے۔ جیسے کہ گرم تقریر کی مناسبت سے سننے کو شعلہ لپکے، دلکش آواز کی مناسبت سے بلبل جھپکے، دلکشی چال کو ستاروں کے رکنے اور آتش حسن کے مناسبت سے تقوے کو جلانے وغیرہ ایسی لفظیات ہیں جو مس کے حسن کو پرکشش بنا دیتی ہیں۔

نظم کا واحد متکلم راوی جو مسلمان ہے مس کے حسن وجمال کی تعریف کے بعد اپنے عشق کا اظہار کرتا ہے لیکن مس جو عیسائی ہے اس کی محبت کو محض اس لیے قبول نہیں کرتی ہے کہ عاشق کی مذہبی تاریخ جنگوں سے بھری ہوئی ہے۔

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے انسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

اس طرح کے اور بھی دو، تین اشعار ہیں جس سے وہ مسلمانوں کے ماضی کو یاد دلاتے ہوئے کہتی ہے کہ تمہارا تعلق ایک خونریز قوم سے ہے ہمیں تم سے کوئی انسیت نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ دراصل مغرب کا مسلمانوں کو دیکھنے کا متعصبانہ رویہ ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جنگ وجدال صرف ایک قوم سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام اقوام ماضی وحال میں خونریزیاں مچاتی رہی ہیں۔ مس کی یہ تمام باتیں کسی خاص قوم کی جنگ کے محرکات اور پس منظر سے صرف نظر کرنے اور صرف ایک پہلو کو دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ اُس وقت بلکہ موجودہ دور میں بھی دیگر اقوام کی یہ منصوبہ بند کوشش رہی ہے کہ مسلمان اپنے ماضی سے منحرف ہو جائیں۔ مغربی قومیں اس وقت تک کسی کو کشادہ ذہن کا حامل نہیں تصور کرتی ہیں جب تک کہ وہ اُن کا فکری طور پر ہم خیال نہ ہو جائے۔ انھوں نے اپنے اس منصوبے میں کافی حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی ہے۔ نئی نسل اپنے مذہبی شعار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ فکر وعمل کے اعتبار سے اس کی اپنی کوئی شناخت باقی نہیں رہ گئی ہے اس کی سوچ وفکر اسی نہج پر پروان چڑھ رہی ہیں جیسا مغربی اقوام چاہتی ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی مسلمانوں کی حالت زار یہی ہے کہ وہ علم وعمل سے عاری ہونے کی وجہ سے اپنا دفاع کرنے سے بھی قاصر ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسروں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور ان کے ماتحت رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھنے لگے ہیں۔ راوی واحد متکلم ایسے ہی فکری زوال کے شکار نوجوانوں کا نمائندہ ہے، جو اپنی تاریخ کے واقعات کی حقانیت سے ناواقف ہیں اور اس پر انہیں کوئی ملال بھی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ مس کو کوئی دفاعی جواب دینے کی کوشش تک نہیں کرتا ہے بلکہ برملا یہ اعتراف کر لیتا ہے کہ:

عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحت روح — اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح
شجر طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں — گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں
ہم میں باقی نہیں اب خالد جاں باز کا رنگ — دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ
جوہر تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار — نور ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اسی طرح آخر تک کے پورے مکالمے میں نئی نسلوں پر طنز کے تیر چھوڑے گئے ہیں اور یہ احساس دلایا گیا ہے کہ کوئی بھی قوم اپنے اسلاف کے ورثے کو ترک کر کے معزز نہیں کہلا سکتی ہے۔ قوموں کی عزت و عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے کردار کو اپنی زندگی کا حصہ بنا کر ترقی کرے۔ اپنے ماضی سے کٹ کر انفرادی ترقی تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے قوموں کی شناخت نہیں قائم ہو سکتی ہے۔ مذکورہ اشعار کو پُر اثر بنانے کے لیے اسلامی تلمیحات اور تہذیبی عناصر کا سہارا لیا گیا ہے۔ جیسے کہ پہلے شعر میں " آدم و نوح" دوسرے میں " شجر طور" تیسرے میں " براق" اسی طرح "نعرہ تکبیر، سبحان اللہ، مجاہد، نور ایمان اور موج کوثر وغیرہ اسلامی روایات کی ایسی اصطلاحات ہیں جس سے کوئی نہ کوئی واقعہ یا عقیدہ وابستہ ہے۔ نوح سے حضرت نوح علیہ السلام کے اس معجزے کی طرف اشارہ ہے جہاں عتاب الٰہی سے پوری قوم سیلاب میں غرق آب ہو گئی تھی اور ان میں صرف وہی لوگ محفوظ رہے تھے جو کشتی نوح میں سوار ہو گئے تھے۔ اسی طرح "طور" وہ پہاڑی ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تجلیات الٰہی کا دیدار کیا تھا۔ براق سے شب معراج کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ کوثر، اسلامی روایات کے مطابق جنت میں بہنے والے نہر کو کہتے ہیں۔ اسی طرح نعرہ تکبیر، نور ایمان اور مجاہد جیسے الفاظ مذہبی عقیدے اور ایمان کی طاقت کے اظہاریہ ہیں۔

اکبر نے بہت خوبصورتی کے ساتھ ان تلمیحات کا ذکر کر کے قوم کے اس ذہنی رویے پر طنز کیا ہے جو اپنی مذہبی راوایات کو مغرب کے سامنے بے وقعت سمجھتے ہیں اور نئی تہذیب کو اختیار کرنے پر اس قدر آمادہ ہیں کہ اپنی تہذیبی قدروں اور تاریخ کو ترک کرنے پر ہیں۔ یہی انگریز حکومت کی کوشش بھی تھی ہندوستانی نام اور شکل سے تو ہندوستانی دکھائی دے لیکن فکری طور پر وہ انگریزوں کا ہم خیال ہو۔ اسی کوشش کے پیش نظر انھوں نے انگریزی تعلیم کو ہندوستانیوں کے لیے عام کیا اور کلکتہ، دلی، مدراس پھر پورے ملک میں کالج اور مشنری اسکول قائم کئے۔ چوں کہ یہ اس وقت کی معاشی ضرورت تھی ہی اسی لیے کئی ہندوستانی مصلحین قوم نے انگریز حکومت کے اس اقدام کی تائید بھی کی لیکن ان میں کچھ اکبر الہٰ آبادی جیسے قوم کے خیر خواہ بھی تھے جو ہر حال میں مشرقی تہذیب کی بقااور حفاظت چاہتے تھے ۔وہ انگریزی تعلیم کے تو قائل تھے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی نوجوان ذہنی، فکری اور طبعی طور پر ہندوستانی ہی رہیں۔ نظم کے مذکورہ حصے میں اکبر الہ آبادی کی اسی فکر کی عکاسی ہو رہی ہے۔ مرکزی کردار اس انگریز لڑکی کی منت سماجت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اب ہم میں ماضی کے مسلمانوں کی طرح ہمت و شجاعت باقی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اب ہمارے ایمان کا نور تمہارے شیشے کی طرح شفاف چہرے پر نثار ہو چکا ہے۔ اب ہمارے اندر "نیک و بد" کے درمیان فرق کرنے کی حِس بھی ختم ہو چکی ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت اور ظلم کے دفاع کے لیے جو تلوار اٹھایا کرتے تھے وہ اب "ترے ابرو پہ نثار" ہو چکے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اب ہم ایمان کے اساسی عنصر " وحدانیت" کو بھی ترک کر چکے ہیں اس میں شراکت کے قائل ہو گئے ہیں۔ اب صرف نام مسلمانوں جیسا رہ گیا ہے ورنہ مسلمانوں جیسی کوئی خصوصیت ہم میں باقی نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں سننے کے بعد جب اس انگریز مِس کو پورا یقین ہو جاتا ہے کہ میر اشیدائی فکری اور عملی

طور پر اسلامی شعائر سے منحرف ہو چکا ہے تو فوراً ہنس کر اس کے مدعا کو قبول کر لیتی ہے اور اس قبول نامے کے ساتھ ہی نظم کا اختتام ہو جاتا ہے۔

میرے اسلام کو ایک قصہ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نظم تین مراحل سے گزر کر اختتام تک پہنچتی ہے۔ پہلے حصے میں انگریز خاتون کے حسن و جمال کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں مسلمانوں سے نفرت کی وجہ بتائی گئی ہے اور تیسرے حصے میں مذہب سے دوری کے عام رجحانات کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا نظم میں ایک ایسے واقعہ کو پیش کیا گیا ہے جس میں تواتر کے ساتھ تمہید، عروج اور انجام ہے۔ ایک پوری کہانی ہے جو اس وقت کے تہذیبی و معاشرتی کشمکش کو بیان کر رہی ہے۔

7.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اکبر الہ آبادی 1846 میں بمقام بارہ پیدا ہوئے۔ مالی دشواریوں کی وجہ سے ان کی باقاعدہ تعلیم نہیں ہو سکی لیکن ذاتی مطالعہ کے ذریعہ اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور ریاضی میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لی تھی، وہ اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں منصفی کے عہدے پر فائز رہے، 1921 میں الہ آباد میں انتقال کر گئے۔
- اکبر الہ آبادی کی شاعری "کلیات اکبر" کے نام شائع ہوئی ہے۔ جس کے کل چار حصے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ "گاندھی نامہ" بھی ہے۔ اس کے علاوہ "رقعات اکبر، مکاتیب اکبر اور مکتوبات اکبر ان کے خطوط کے مجموعہ ہیں۔
- طنز و ظرافت ان کا خاص میدان تھا، ان کی زیادہ تر نظمیں قطعہ، رباعی اور مثنوی کی شکل میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں مسدس، مسمط، مستزاد، مرثیہ اور قصیدہ بھی ہے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ایک غیر مردف نظم بھی ہے جس میں صرف بحر کا التزام رکھا گیا ہے۔
- نظم "برق کلیسا" کے متن کا مطالعہ کیا۔
- نظم "برق کلیسا مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ یہ نظم کلیات اکبر کے پہلے حصے میں شامل ہے۔ اس نظم کے ذریعہ دو تہذیبوں اور نظریات کے درمیان کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر اس کے تین حصے ہیں تمہید، عروج اور اختتام۔

7.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
غلو	:	حد سے زیادہ مبالغہ کرنا،
مسخر	:	تسخیر کیا ہوا، تابع کیا ہوا
شجاعت	:	بہادر، دلیر
درخشاں	:	چمکتا ہوا، روشن
پیر مغاں	:	آتش پرستوں کا پیشوا
مکاتیب	:	خطوط، مکتوب کی جمع
تلمذ	:	شاگرد ہونا
منحرف	:	پھرا ہوا
جاذبیت	:	کشش، جذب کرنے کی صلاحیت
تشخص	:	امتیاز، ممتاز ہونا

7.9 نمونہ امتحانی سوالات

7.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. اکبر الہ آبادی کب پیدا ہوئے؟
2. اکبر کس رسالے میں مضامین لکھتے تھے؟
3. اکبر کے گھر کا نام "عشرت منزل" کس کے نام پر رکھا گیا ہے؟
4. نظم "برق کلیسا" ان کے کلیات کے کس حصہ میں شامل ہے؟
5. اکبر الہ آبادی کی تخلیق "نامہ بنام اودھ پنچ" کس صنف میں ہے؟
6. نظم "برق کلیسا" کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟
7. مولانا عبد الماجد دریابادی نے اکبر الہ آبادی کے خطوط کو کس نام سے مرتب کیا ہے؟
8. کس نے کہا تھا کہ "اکبر کی عظمت کا اعتراف طنزیہ شاعری کی عظمت کا اعتراف ہے"؟

9. طنزو مزاح کس شاعر کی امتیازی خصوصیت ہے؟

10. اکبر الہ آبادی کا انتقال کب ہوا؟

7.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔
2. اکبر الہ آبادی کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
3. اکبر الہ آبادی کی پیشہ ورانہ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. اکبر الہ آبادی کی کسی ایک نظم پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
5. اکبر الہ آبادی کی مزاحیہ شاعری کے محرکات و پس منظر کو بیان کیجیے۔

7.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. نظم "برق کلیسا" کا تجزیاتی محاسبہ کیجیے۔
2. اکبر الہ آبادی کے حالات زندگی پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
3. اکبر الہ آبادی کی نظموں کی خصوصیات بیان کیجیے۔

7.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. حیات اکبر	عشرت حسین
2. بزم اکبر	مولوی قمر الدین احمد بدایونی
3. اکبر الہ آبادی	طالب الہ آبادی
4. ذکر و فکر اکبر الہ آبادی	عبد الماجد دریا آبادی
5. اکبر الہ آبادی اپنے کلام کی روشنی میں	پنڈت پدم کانت مالویہ

اکائی 8: اقبال کی نظم نگاری: ساقی نامہ

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 حیات و کارنامے

8.3 نظم نگاری

8.4 فلسفہ

8.5 شاعری کی خصوصیات

8.6 نظم "ساقی نامہ" کا متن

8.7 نظم "ساقی نامہ" کا تجزیہ

8.8 اکتسابی نتائج

8.9 کلیدی الفاظ

8.10 نمونہ امتحانی سوالات

8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

آپ نے ڈاکٹر اقبال کا نام ضرور سنا ہوگا بلکہ آپ کو ان کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور یاد ہوگا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اردو اور فارسی کے عظیم شاعر تھے۔ وہ اردو کے چار بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ شاعر ہی نہیں مفکر بھی تھے۔ اس اکائی میں ہم ڈاکٹر سر محمد اقبال کے حالات زندگی، کارنامے اور ان کی نظم نگاری کی خصوصیات کے ساتھ ان کی منتخب نظم کا تجزیہ پیش کریں گے اور ان کے فلسفے کے بارے میں واقفیت بھی حاصل کریں گے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- علامہ اقبال کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں سے واقف ہو سکیں۔
- اقبال کی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں جان سکیں۔
- علامہ اقبال کی نظم نگاری اور ان کے فلسفوں سے آگاہ سکیں۔
- نظم "ساقی نامہ" کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم "ساقی نامہ" کا تجزیہ پیش کر سکیں۔

8.2 حیات و کارنامے

ڈاکٹر اقبال کا تعلق کشمیری خاندان سے تھا جو سترھویں صدی عیسوی میں مشرف با اسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا۔ اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے معزز تھا۔ ڈاکٹر اقبالؔ کے جد اعلیٰ بابا صالح تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کی اولاد 1857ء کے ہنگاموں کے بعد سیال کوٹ میں مقیم ہوئی۔ پہلے پہل علامہ اقبالؔ کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ ان کا نام شیخ رفیق تھا۔ ان کے دو صاحبزادے تھے ایک شیخ نور محمد' دوسرے شیخ غلام قادر۔ شیخ نور محمد کی شادی امام بی بی سے ہوئی۔ شیخ نور محمد کے یہاں دو لڑکے ہوئے شیخ عطا محمد اور شیخ محمد اقبال۔ ان کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں۔ اقبال 9 نومبر 1877ء بروز جمعہ' سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتبہ عمر شاہ' محلہ شوالہ' سیال کوٹ کی مسجد میں ابو عبداللہ مولانا غلام حسن کے مکتب میں حاصل کی۔ بعد میں مولانا میر حسن کی خواہش پر ان کے مکتب واقع کوچہ میر حسام الدین میں اردو عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی قرآن مجید کا درس لیا۔ اقبال کی شعری شخصیت کی تشکیل میں سید میر حسن کا فیضان شامل ہے۔ 1883ء میں سکاچ مشن اسکول سیال کوٹ میں داخلہ لیا۔ 1888ء میں پرائمری کا امتحان اور 1891ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ شعر بھی موزوں کرنے لگے تھے۔ 1893 میں میٹرک درجہ اول میں پاس کیا اسی تاریخ کو یعنی 3 مئی کو ان کی شادی گجرات (پنجاب) کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی۔ اقبال نے اسکاچ مشن کالج میں داخلہ لیا اور استاد داغؔ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس طرح تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور شاعری بھی... ادبی رسائل میں کلام شائع ہونے لگا۔ 1895ء میں انٹر میڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔

1897ء میں بی۔ اے سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے دیے گئے۔ اس زمانے میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اقبال کو پروفیسر آرنلڈ سے شاگردی کا موقع ملا۔ اقبال نے ایم۔ اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا اور 1899ء میں ایم۔ اے تیسرے درجے میں پاس کیا۔ اورینٹل کالج کے میکوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں ریسرچ اسکالر کو ریڈر کہا جاتا تھا۔ چھ ماہ بعد انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے

گورنمنٹ کالج میں کام کیا۔1904ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت ختم ہوگئی لیکن اس مدت میں مزید توسیع کی گئی اور فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ یورپ جانے تک اسی منصب پر فائز رہے۔ 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا۔ 1907ء میں میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے انگریزی میں مقالہ "Development of Meta Physics in Persia" (ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا) کے موضوع پر داخل کیا جس پر انھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی۔ 1908ء میں لنکنز ان سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال ان کا مقالہ انگریزی میں شائع ہوا۔ 1910ء میں ان کا نکاح سردار بیگم سے ہوا۔ 1913ء میں مختار بیگم سے نکاح ہوا۔ 1923ء میں انھیں سر کا خطاب ملا۔ 1931ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ لندن سے اٹلی، روم، وینس، مصر، اسکندریہ، قاہرہ، فلسطین ہوتے ہوئے واپس بمبئی آئے۔ انھوں نے قصر وینس میں مسولینی سے ملاقات کی۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔ لندن سے پیرس، اسپین، میڈرڈ گئے اور براہ وینس ہندوستان واپس ہوئے۔ 1933ء میں افغانستان گئے۔

اقبالؔ کو کم عمری ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ انھوں نے داغؔ سے اصلاح لی تھی لیکن ان کی شاعری کا رنگ داغؔ سے یکسر مختلف تھا۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک خاص فلسفہ دیا اور فلسفیانہ گہرائیوں سے روشناس کروایا۔

اردو میں ان کی شاعری کے چار مجموعے، بانگ درا، بال جبرئیل، ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز شائع ہوچکے ہیں۔ فارسی میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اسرار خودی، رموزِ بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ قابل ذکر ہیں۔ اقبال کا انتقال 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں ہوا۔ مزارِ اقبال حضوری باغ کے قریب، شاہی مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے سایہ میں واقع ہے۔ اقبالؔ کو پہلی بیوی کریم بی بی سے آفتاب اقبال اور معراج بیگم پیدا ہوئے۔ سردار بیگم سے جاوید اقبال اور منیرہ بانو پیدا ہوئے۔

اقبالؔ جن دنوں بی۔اے میں پڑھتے تھے انھوں نے انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں نظم "فلاحِ قوم" سنائی۔ عبدالکریم الجیلی کی کتاب "نظریۂ توحید مطلق" پر انگریزی میں ایک مضمون "انڈین انٹی کیوری" کے 29ویں شمارے (ستمبر 1900) میں شائع ہوا۔ 1901ء میں وہ انجمن کشمیری مسلمان کے سکریٹری بنائے گئے۔ 23 فروری کو انجمن حمایت اسلام کے سترھویں جلسے میں صدر جلسہ میاں نظام الدین نے انھیں "ملک الشعرا" کا خطاب دیا۔ اکتوبر 1904ء میں پہلی اردو تصنیف "علم الاقتصاد" لاہور سے شائع ہوئی۔ معاشیات کے موضوع پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ 1910ء میں انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ 1911ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔ 1918ء میں اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔ 1920ء میں مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر۔اے۔ نکلسن نے کیا۔ جنوری 1923ء میں سر کا خطاب ملا۔ پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ جون 1927ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور 1930 تک اس سے وابستہ رہے۔ 1929ء میں 5 جنوری سے 8 جنوری تک "خطبات مدراس" دیے۔ 19 جنوری کو میر عثمان علی خاں سے ملاقات کی۔ مئی 1930ء میں "خطبات مدراس" (انگریزی) شائع ہوئے۔ نومبر 1931ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ فلسطین میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ وہاں

عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ چار نائب صدور میں سے ایک اقبالؔ منتخب ہوئے۔ بیت المقدس بھی گئے۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ دارالعلوم کمیٹی روم میں ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبالؔ نے تقریر کی۔ واپسی پر لاہور میں شاندار استقبال کیا گیا۔ 1934ء میں انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ 1936ء میں محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم 'نغمۂ سرمدی'' پڑھی یہ آخری شرکت تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری 1929)ء)' پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری(1933)ء' ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری(1936)ء الہ آباد یونیورسٹی کی اعزاز ڈگری برائے ڈی لٹ(1937)ء اور عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری(1938)ء میں عطا کی۔

8.3 نظم نگاری

اقبالؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن اقبالؔ کی نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور ان کی شہرت بحیثیت نظم گو شاعر ہے۔ اقبالؔ نے ہیئت کو کبھی اہمیت نہیں دی ان کی غزلوں میں تسلسل اور نظموں میں رنگِ تغزل ملتا ہے۔ اقبالؔ کے پہلے شعری مجموعے بانگ درا میں حسن فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔ بال جبرئیل کی شاعری میں مفکرانہ پہلو نمایاں ہیں۔ ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی نظموں پر ڈرامائی انداز اور خطابت حاوی ہے۔ '' ہمالہ'' اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں '' کوہستانِ ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بانگ درا میں '' ہمالہ'' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ اس سے قبل انھوں نے ' فلاح قوم' (انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں 1896ء) نالہ یتیم (انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں '1900) اور'' دردِ دل یا یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے ''(انجمن حمایت اسلام کے سولہویں سالانہ جلسے میں 1901ء) پڑھی تھیں۔'' ہمالہ'' نے صاحبِ ذوق حلقے کو چونکا دیا۔ اس نظم میں حسنِ فطرت' حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت کا جذبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظرِ فطرت سے دلچسپی بعد کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ابتدائی دور میں اقبالؔ نے نیچرل نظمیں لکھیں اور مناظر قدرت کے مختلف مرقعوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو فطرت کا پیام بھی دیا۔ ایسی نظموں میں '' گلِ رنگیں'' ابر کوہسار' آفتابِ صبح' چاند' جگنو' شمع' ماہ نو' انسان اور بزم قدرت' ایک آرزو' موجِ دریا' ابر' کنارہ' راوی قابل ذکر ہیں۔'' ایک آرزو'' شاعرانہ مصوری کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک پرسکون زندگی کی خواہش کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی دامنِ کوہ میں چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں وہ سب سے الگ تھلگ اپنے تصورات کی دنیا میں مست زندگی بسر کرے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہو　　　ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ　　　پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

''پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو'' ایک اچھوتا خیال اور ایک خوب صورت تجسیم ہے۔ بانگِ درا کے حصہ دوم میں حقیقتِ حسن' کلی' چاند اور تارے' انسان' ایک شام' تنہائی جیسی نظمیں فطرت کے جمال و پیام کے آئینے ہیں۔

اقبالؔ نے تجریدی تصورات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کیا اور غیر مرئی اشیا کی تجسیم کر کے خوبصورت پیکر بنائے۔ ان کے افکار اور تصورات استعاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی خوبصورت مثال "حقیقت حسن" ہے۔ حصہ سوم میں ستارہ' نمودِ صبح' بزم انجم' چاند' شبنم اور ستارے' آفتاب' پھول جیسی نظمیں ہیں جس میں شاعری اور فلسفے کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اقبالؔ حسنِ قدرت کے مظاہر میں معنویت تلاش کرتے ہیں اور فطرت کے ساتھ انسان کی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بے جان اشیا کو ذی روح محسوس کرتے ہیں اور ان کی زبانی اپنی بات کہتے ہیں۔ اقبال فلسفیانہ نظموں کے آغاز میں کچھ اس طرح منظر نگاری کرتے ہیں جس سے فضا سازی میں مدد ملتی ہے۔ گورستان شاہی میں وہ سوگوار فضا بناتے ہیں۔ " خضر راہ" کی ابتدا میں جو منظر کشی انہوں نے کی ہے وہ ایک خاص فضا کی تشکیل کرتی ہے۔ ' مسجد قرطبہ" کے آخر میں یہ منظر نگاری اس کی معنویت بڑھا دیتی ہے:

وادیٔ کہسار میں غرق شفق و ہ سحاب — لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت — کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب

وطنی اور قومی شاعری میں انھوں نے حب الوطنی کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی ہے یا قوم کو دعوت عمل دی ہے۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' ترانہ ملی' نیا شوالہ' وطنیت' خطاب بہ جوانانِ اسلام' ہلال عید' صدائے درد' تصویر درد' آفتاب' ترانۂ ہندی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں اقبالؔ نے قوم کو اتحاد کا پیغام دیا۔ اور خبر دار کیا کہ اگر وہ متحد نہ رہیں گے تو پوری قوم کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ اس زمانے میں اقبالؔ نے بچوں کی نظمیں بھی کثرت سے لکھیں جن میں ایک مکڑی ایک مکھی' ایک پہاڑ اور گلہری' ایک گائے اور بکری' بچے کی دعا' ماں کا خواب' پرندے کی فریاد' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ہمدردی اہم ہیں۔ ان میں بعض نظمیں مشہور شعرا ایمرسن' ولیم کوپر' لانگ فیلو اور ٹینی سن کے خیالات سے متاثر ہو کر لکھیں۔

اخلاقی نظموں میں گل پژمردہ' زہد اور رندی' طفل شیر خوار' گورستانِ شاہی شبنم اور ستارے شامل ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اخلاق حسنہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے یا سبق آموز واقعات کو نظم کیا ہے۔

تاریخی نظموں میں ہلال' صقلیہ' غلام قادر رہیلہ' حضور رسالت مآب میں' فاطمہ بنت عبداللہ' محاصرہ ادرنہ' صدیق' بلاد اسلامیہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں تاریخی واقعات نظم کیے ہیں یا مشاہیر اسلام کو موضوع بنایا ہے۔

اقبالؔ کی ابتدائی نظموں میں تلاش' تحقیق اور تجسس کا رنگ گہرا ہے۔ اس دور میں اقبالؔ نے حیات' ماخذ حیات' مقصد حیات' حیات بعد الموت' شعور' ذات' خودی' بے خودی' حسن و عشق کے بارے میں غور و فکر کی۔ اس دور کی نظموں میں اقبالؔ کی فلسفیانہ شاعری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ گل رنگیں' خفتگانِ خاک سے استفسار' شمع' انسان اور بزم قدرت' بچہ اور شمع' جگنو اور دل ایسی ہی نظمیں ہیں۔

1905ء میں اقبالؔ یورپ گئے تھے اور 1908 تک وہاں رہے۔ یورپ کے قیام کے دوران ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ وہاں کی سیاست کو انہوں نے قریب سے دیکھا۔ انہیں وہاں کی تہذیب کی حقیقت کا پتہ چلا۔ انھیں احساس ہوا کہ قومیت اور وطنیت کا نظریہ انسانوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس سے تعصب اور تنگ نظری کو تقویت ملتی ہے۔ اقبالؔ نے دیکھا کہ مغربی تہذیب کی

بنیاد مادیت پر ہے۔ وہ منکرِ خدا ہیں۔ اقبالؔ اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا کی نجات اسلامی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت میں مضمر ہے۔ 1908ء سے 1938ء تک اقبال کی نظموں میں ایک جداگانہ انقلابی رنگ حاوی ہے۔ ان کی اس تبدیلی کا مظہر ان کی نظم " طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" ہے جو انھوں نے یورپ میں قیام کے دوران 1907ء میں لکھی۔ اقبالؔ نے پہلی مرتبہ قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کیا اور اسی نظم سے ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی۔ 1857ء کی ناکام جدوجہد آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ مسلمانانِ ہند کا کوئی نصب العین نہیں تھا۔ اقبالؔ نے انھیں عشق و عمل کا پیغام دیا۔ وہ کہتے ہیں :

اوروں کا ہے پیام اور ' میرا پیام اور ہے

عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

اس نظم میں اقبالؔ کے ان تصورات کے ہلکے نقوش نظر آتے ہیں جو آگے چل کر ایک منضبط فلسفے کی صورت میں ابھرے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے عقل اور عشق کا تقابل پیش کیا۔ اقبالؔ نے عشق اختیار کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے قوم میں ولولہ اور جوش پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں۔ 1906ء میں انھوں نے نظم " محبت" لکھی جس میں انھوں نے حسن نیکی اور صداقت جیسے ستیم' شیوم' سندرم کے فلسفے کو پیش کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلایا۔ یورپ کے قیام کے دوران ان کے خیالات میں جو تبدیلی آئی اس کا احساس نظم " عبد القادر کے نام" میں ملتا ہے۔ یہ نظم انھوں نے 1908ء میں اپنے دوست سر عبد القادر کے نام لکھی تھی۔

یورپ سے واپسی کے بعد اقبالؔ نے نظم " صقلیہ" لکھی۔ جزیرہ سسلی کو عربی میں صقلیہ کہتے ہیں۔ عربوں نے اس جزیرے کو تہذیب و تمدن اور علم و فضل اور صنعت و حرفت سے مالا مال کیا تھا۔ اقبالؔ نے صقلیہ کو تہذیب حجازی کا مزار کہا۔ اس دور میں اقبالؔ کی نظموں کا موضوع فلسفہ خودی' فلسفہ بے خودی اور عشق ہو گیا۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ قوت کو مسلمانوں کو جگانے اور ان کے دل میں ولولہ پیدا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے قوم کو امید و یقین کا پیغام دیا۔ اطاعت اسلام کے جذبے کو ابھارا' مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے خطرات سے آگاہ کیا۔ خطاب بہ نوجوانانِ اسلام' مسلم' شعاع آفتاب' نوید صبح' شکوہ' جواب شکوہ' شمع اور شاعر' خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام ان خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شکوہ اقبال کی پہلی طویل نظم ہے جو انھوں نے 1911ء میں لکھی۔ اس نظم میں اقبالؔ نے مسلمانوں کے دورِ عظمت و شوکت کا حال اور موجودہ زبوں حالی کو نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا۔ اردو کا شعری سرمایہ اس انداز سے بالکل ناآشنا تھا۔ یہ اس دور کے مسلمانوں کے دل کی آواز تھی۔ شکوہ بے حد مقبول ہوئی۔ شکوہ کے ڈیڑھ سال بعد اقبالؔ نے " جواب شکوہ" لکھی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ یہ نظم بیانیہ انداز کی ہے۔ اس میں تاسف کا اظہار بھی ہے' امید بھی بندھائی گئی۔ دعوتِ عمل بھی ہے۔ ان سب نے مل کر نظم کو منفرد بنا دیا ہے۔ ڈرامائی رنگ نے اس کی تاثیر میں اضافہ کیا۔ کہیں کہیں طنزیہ انداز سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔ جیسے :

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

حرم پاک بھی اللہ بھی قران بھی ایک　　　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

"جواب شکوہ"فکر وخیال کی ندرت کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی ایک خوب صورت نظم ہے۔ تاثر کی شدت اور جذبے کی گہرائی نظم کے ہر حصے میں موجود ہے۔ نظم کا اختتام اس قدر لاجواب ہے کہ اس کی مثال پوری شاعری میں نہیں ملتی:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سرکار دو عالمؐ سے اقبالؔ کی بے پناہ محبت' ان کی دوسری نظموں میں جھلکتی ہے۔" شمع وشاعر " بھی ایک اہم نظم ہے۔ اقبالؔ نے رمز' کنایہ وعلامت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اقبالؔ نے شاعری کی پرانی وروایتی علامتوں کو نئے معنی ومطالب عطا کیے۔ اس نظم کا موضوع قومی انحطاط'مسلمانوں کا مقام' راہِ عمل اور درخشاں مستقبل ہے۔ اقبالؔ مسلمانوں کے انحطاط کا سبب ان کے انفرادی کردار کا خاتمہ' اخلاقی پستی' بے عملی' تن آسانی' موثر قیادت کا فقدان آپسی نفاق وانتشار بتاتے ہیں۔ اقبالؔ مسلمانوں کو اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ وہ ماضی میں کیا تھے:

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے

جہانگیر و جہاں دارا' جہاں بان و جہاں آرا

اقبالؔ مسلمانوں کے روشن مستقبل کا انحصار مغرب کی تقلید سے احتراز بتاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مغربی سیاست کی عیاری سے بھی باخبر کرتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ' سرزمین عرب کی تقسیم' اسرائیل کا قیام یہ سب کچھ مغربی چالوں کے مظہر تھے۔ اس پس منظر میں اس نظم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اقبالؔ کی ایک اور طویل نظم" والدہ مرحومہ کی یاد میں" ہے۔ اس نظم میں انھوں نے فلسفہ حیات و ممات' جبر وقدر' عظمت انساں اور سوزو گداز کی اہمیت کو موضوع بنایا۔"خضرِ راہ" اور" طلوع اسلام" میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو امید افزا مستقبل کا مژدہ سنایا۔

"بال جبرئیل" 1935ء میں شائع ہوئی۔" بال جبرئیل" اقبالؔ کی اردو شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔" بال جبرئیل" سرزمین قرطبہ کے متعلق نظموں سے شروع ہوتا ہے" ہسپانیہ" قید خانے میں معتمد کی فریاد' عبدالرحمن اول کا بویا ہوا کھجور کا درخت (سرزمین اندلس میں) طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں کے احساسات وسیع اور واضح ہو کر ایک بڑی نظم" مسجد قرطبہ" کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ پوری نظم شاعری کا کارنامہ ہے۔ وقت مسلسل متحرک ہے' عشق لافانی ہے۔ مسجد دین اور فن کی علامت ہے'مرد مومن ایک کائناتی قوت ہے۔ عصر حاضر ایک انقلابی موڑ پر ہے۔ خون جگر کے بغیر سارے نقش ناتمام ہیں۔ اقبالؔ کے تصور عشق'فلسفہ عمل اور مرد مومن پوری وضاحت کے ساتھ اس نظم میں موجود ہیں۔ اقبالؔ کے مرد مومن میں علم ومحبت' عقل وعشق میں ایک ہم آہنگی ہے جو اسے ایک عالمگیر علامت بناتی ہے۔ بال جبرئیل کی دوسری اہم نظمیں' ذوق وشوق' اور' ساقی نامہ' ہیں۔ اقبال نے جو

بات ' شکوہ' میں اجتماعی طور پر کھلے انداز میں کہی وہی بات ' ذوق وشوق ' میں انفرادی طور پر اختصار کے ساتھ اشاروں میں کی ہے۔ یہ علامتی انداز شاعر کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ایک شاہکار نظم ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی اس کا سوز و گداز ہے۔ یہ نظم ایجاز و بلاغت کی عمدہ مثال ہے۔ " ساقی نامہ " بھی اقبالؔ کی اہم نظم ہے اور یہ ایک پر جوش نظم سمجھی جاتی ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ کا فلسفہ ایک نغمے میں ڈھل گیا ہے اور پوری نظم مترنم اور رواں ہے۔

بال جبرئیل میں خوب صورت تمثیلی اور علامتی نظمیں ملتی ہیں۔ علامتی نظموں میں " لالہ صحرا "اور " شاہین " اہم ہیں۔ لالہ ٔصحرا کائنات کی وسعتوں میں انسان کی تنہائی اور کار فرمائی کی علامت ہے۔ لالہ اور شاہین اقبالؔ کی مرغوب علامتیں ہیں۔ شاہین ایک طاقت ور پرندہ ہی نہیں بلکہ اس میں فقر وغنا' غیرت وحمیت' سخت کوشی اور وسیع النظری' مردار چیزوں سے پرہیز' تازہ شکار کرنا ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اقبال نے شاہین کو علامت بنایا۔ اقبالؔ افراد کی سیرت پر لالہ ٔصحرا کی خاموشی و دل سوزی اور شاہین کی طرح لہو گرم رکھنا چاہتے ہیں تا کہ جلال وجمال' وقار اور عمل کے امتزاج سے ایک متوازن کردار کائنات میں ہستی کی داد دے۔

تمثیلی نظموں میں " روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے " ۔ "لینن خدا کے حضور میں " ۔ 'فرشتوں کا گیت " ۔ " فرمانِ خدا "۔ "جبرئیل وابلیس کا مکالمہ " قابل ذکر ہیں۔ لینن پر نظم اقبالؔ کے فلسفہ ٔحیات' مطالعہ تاریخ اور تجزیہ سیاست کی ترجمان ہے۔ وہ سرمایہ داری اور مادہ پرستی کے ساتھ کلیسائیت پر بھی شدید تنقید کرتے ہیں کیوں کہ مغرب کی مسخ شدہ مسیحیت اور غلط مذہبیت کے رد عمل کے طور پر کمیونزم کی بنیاد دہریت اور الحاد پر رکھی گئی ہے۔

ضرب کلیم میں چھوٹی اور متوسط نظمیں ہیں۔ " شعاعِ امید " سب سے مشہور اور فکر و فن کے اعتبار سے ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں کرنوں سے سورج کا خطاب ہے۔ دوسرے حصے میں کرنوں پر خطاب کا اثر دکھایا گیا۔ تیسرے حصے میں شعاعِ آفتاب کہتی ہے کہ وہ اس وقت تک چمکتی رہے گی جب تک پورا مشرق اور سارا عالم روشن نہ ہو جائے۔ یہ ' شعاعِ امید ' اقبال کی شاعری کے امید افزا پیام کی علامت ہے۔ ضرب کلیم کی دوسری نظموں میں علم وعشق' نگاہ' صبح چمن' لا الہ الا اللہ' معراج' مدنیت اسلام' نکتہ توحید' مرد مسلماں' سلطان ٹیپو کی وصیت' عورت' نگاہ شوق' فنون لطیفہ' ابن سینا' ابلیس کا فرمان اور مسولینی بھی اہم نظمیں ہیں ۔

"ارمغان حجاز' کی سب سے اہم نظم " ابلیس کی مجلس شوریٰ " ہے۔ اس میں پانچوں مشیر دنیا کی صورت حال سے ابلیس کو آگاہ کرتے ہیں۔ پانچواں مشیر اشتراکیت کے نئے فتنے کی نشان دہی کرتا ہے۔ ابلیس اپنے خطاب میں واضح کرتا ہے کہ ابلیسی نظام کو اشتراکیت سے کوئی خطرہ نہیں اسے سب سے زیادہ خطرہ امت مسلمہ سے ہے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار ' آشفتہ مغز ' آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت فتنہ فردا نہیں ' اسلام ہے

ابلیس کی مجلس شوریٰ اپنی ڈرامائیت' روانی' رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اقبال کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

8.4 فلسفہ

اقبال کی شاعری میں جو فلسفہ ملتا ہے اس کے اہم نکات خودی' عشق' فقر' عمل اور مرد مومن ہیں۔ اقبال کی شاعری کی بنیاد فلسفہ خودی ہے۔ اقبال نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا بلکہ اس کا مفہوم احساس نفس اور تعینِ ذات ہے۔ تمام مخلوقات میں انسان سب سے برتر ہے اس لیے اس کی ذات کو خودی کا شعور ہے۔ یہی شعور اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ انسان بھی ایک مخلوق ہے لیکن اس کی ہستی اعتباری نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے مقابلے میں عالمِ فطرت کا وجود محض اضافی ہے۔ انسانی زندگی کا آغاز اسی خودی کا شعور ہے۔ اپنی منزل پانے کے لیے وہ خود کو مستحکم کرتا جاتا ہے۔ خودی کو مستحکم کرنے کے لیے انسان غیر خود یعنی طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے وہ اس طرح کہ وہ اپنے لیے نئے نئے مقاصد متعین کرتا رہے۔ اپنی راہوں کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات پر غالب آنا اس کا نصب العین ہو تو اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی جائیں گی اس طرح خودی کی آگ بھڑکتی رہے گی۔ ایک مقصد کے حصول کے بعد دوسرے مقصد کی کوشش کرتے ہوئے وہ راہ طلب میں آگے بڑھتا رہے اسی بے قراری اور بے چینی اور اس جہد مسلسل و سعیٔ پیہم کا نام زندگی ہے۔ سکوں خواہ بہشت کا سکون ہی کیوں نہ ہو روح انسانی کے لیے موت کا پیام ہے۔ اس کے بعد کی منزل ضبطِ نفس ہے۔ اس طرح انسان اوج کمال پر پہنچتا ہے۔ یہ نیابت الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اسی کی تلاش میں نوع انسانی سرگرداں ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات روزِ ازل سے بے قرار ہے۔ ان اوصاف کا حامل '' مرد مومن '' ہے۔ اقبال اجتماعی خودی پر بھی زور دیتے ہیں۔ ملت کے احساسِ خودی کے لیے علم کائنات اور تسخیر کائنات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی روایات اور تاریخ کی یاد تازہ رکھے۔ تاریخ' اقوام کی زندگی کے لیے قوتِ حافظہ کا حکم رکھتی ہے۔

اس خودی کے لیے ایک رہنما کی ضرورت ہے اور یہ رہنما 'عشق' ہے۔ عشق مرد مومن یا مرد کامل کی صفات میں سے ایک ہے جو معرفت نفس کے مدارج طے کرکے خودی کی معراج پر پہنچ گیا ہو۔ خودی کی سب سے اہم شرط فقر اور استغنا ہے۔ اقبال کے نزدیک فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا' نوامیسِ فطرت پر حکمرانی کرنا۔ دنیا میں امن وانصاف پھیلانا مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے۔

اقبال نے عقل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دی۔ ان کے خیال میں علم و عقل انسان کو منزل کے قریب تو پہنچا سکتے ہیں لیکن بغیر عشق کی مدد کے منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرات کی کمی ہے۔ عشق کی پشت پناہی کے بغیر عقل ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔ عقل جہاں پس و پیش کرتی ہے وہاں عشق زندگی کے قافلے کی رہبری کرتا ہے۔ وہ سارے کارنامے جنھوں نے قوموں کی زندگی بدل دی وہ کسی جذبے کے تحت ہی انجام پائے۔ اقبال عقل کے خلاف نہیں ہیں لیکن جدید تہذیب کا عقل پرستی کی طرف جو شدید رجحان ہے اقبال اس کے مخالف ہیں۔ اس رجحان نے انسانی زندگی کو بے رنگ و بے لطف بنا دیا

ہے۔اقبالؔ عشق کی دومنزلوں کی طرف نشان دہی کرتے ہیں پہلی منزل سوزوگداز کی ہے دوسری کیف دیدار کی ہے۔لذت دیدار سے آشنا ہونے کے بعد بھی نفس انسانی خالق مطلق سے دور ہے۔وہ دردِ جدائی میں تڑپتا ہے۔یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر ہے۔یہ جدائی ہی اس کی خودی کی وجہ حیات ہے۔

اقبال سوز و خلوص پر بھی زور دیتے ہیں۔اقبال جس کو خونِ جگر کہتے ہیں وہ یہی خلوص ہے جس کی پرورش جذبے کی آغوش میں ہوتی ہے۔وہ کہتے ہیں جب تک ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں نہ ہو فن کا معجزہ ظہور میں نہیں آسکتا۔جذبہ چاہتا ہے کہ اس کی خاطر ساری صلاحیتوں کو جھونک دیا جائے۔وہ اس کے اخلاص میں کسی کی شرکت گوارہ نہیں کرتا۔

اقبالؔ کے کلام میں جگہ جگہ عمل کی تلقین ملتی ہے۔وہ کہتے ہیں مقاصد کتنے ہی بلند ہوں عمل کے بغیر بے معنی ہوتے ہیں۔انسان کی شخصیت عمل ہی کے ذریعہ بنتی ہے۔نیکی کوئی بنی بنائی شئے نہیں ہے وہ ہمارے عمل سے جنم لیتی ہے علم کوئی مفرد شئے نہیں ہے جو وہ ذہنی یا خارجی عالم میں پایا جاتا ہے بلکہ اندرونی عمل کی امتزاجی کیفیت ہی علم ہے۔عمل خودی اور زندگی کا اصل سرچشمہ ہے۔

8.5 شاعری کی خصوصیات

اقبالؔ کے کلام میں زبان و بیان کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔انھوں نے خود اپنی زبان اختراع کی۔اقبالؔ کے کلام میں رمزیت و علامت نگاری ملتی ہیں لیکن یہ علامتیں معمہ نہیں بنتیں۔اقبالؔ نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ مضامین باندھے۔معلمانہ انداز میں مقصدی شاعری کی لیکن اسے خشک اور بے رنگ ہونے نہیں دیا۔اقبالؔ جذبات و تخیل کے ساتھ امید آفرینی اور آزادی پر زور دیتے ہیں۔اقبالؔ نے اپنے تخیل کی بنیاد پر کئی ڈرامائی نظمیں لکھیں ان کا سب سے جاندار کردار ابلیس ہے۔

اقبالؔ نے نادر تشبیہات' استعارات' رمز' کنایہ' صنائع' بدائع کے استعمال میں کمال فن کا ثبوت دیا۔اقبال کی نظموں میں خوبصورت تشبیہیں ملتی ہے۔بعض نظموں کے مکمل بند تشبیہات پر مشتمل ہیں۔جیسے نظم جگنو کا یہ بند :

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑگئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن کا

کچھ اور مثالیں:

چرخ نے بالی چرائی ہے عروس شام کی — نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر — فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

تلمیحات:

آبتاؤں تجھ کو رمز آیہ انّ الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری

ڈاکٹر یوسف حسین لکھتے ہیں:

"یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ اس (اقبال) نے اپنے کلام میں زندگی کی نسبت میں جس قدر تشبیہیں، استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں ان کی مثال فارسی اور اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔" (روح اقبال۔ ص126)

روح اقبال میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے تقریباً 120 تراکیب درج کی ہیں۔ اقبالؔ نے قرآن کی بعض آیتوں اور احادیث کا خوب صورت استعمال کیا جیسے:

حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز ٹل نہیں سکتا و قدکم بہ تستعجلون
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر چشم مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ ینسلون

رمز وایما کی بہترین مثال نظم "شمع وشاعر" ہے اور سہل ممتنع کی بہترین مثال "ساقی نامہ" ہے۔ اقبال کے یہاں نظم نما مسلسل غزلیں بھی ہیں جس کی ایک مثال دیکھیے:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

نظموں میں رنگ تغزل ملتا ہے جیسے نظم "شمع وشاعر" کے شعر:

تھا جنھیں ذوق تماشا وہ رخصت ہوگئے لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا
آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

غزل کے اشعار لگتے ہیں:

اقبالؔ کے کلام میں صوتی آہنگ بھی ملتا ہے۔ ان کی نظم "ایک شام" میں وہ خاموشی کی تصویر لفظوں سے کھینچتے ہیں:

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبزہ پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے آغوش میں شب کے سوگئی ہے

ش' کی تکرار سے ایک خاص فضا بنتی ہے اور خاموشی کا تاثر قائم ہوتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری فکری، فنی اور معنوی اعتبار سے معجزہ فن کہلانے کے لائق ہے۔

8.6 نظم "ساقی نامہ" کا متن

(1)

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
اِرم بن گیا دامنِ کوہسار

گُل و نرگس و سَوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی‘ ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی‘ لچکتی‘ سرکتی ہوئی

اچھلتی‘ پھسلتی‘ سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھاکر نکلتی ہوئی

رکے جب ‘ تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام!
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

پلا دے مجھے وہ مَیِ پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گُل روز روز

وہ مے ‘ جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مَے ‘ جس سے ہے مستیِ کائنات

وہ مَے ‘جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ مَے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا ! پردہ اِس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

(2)

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ‘ ساز بدلے گئے

ہُوا اِس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری‘ گیا
تماشا دکھاکر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دلِ طور و سینا وفاراں دونیم
تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زُنّار پوش

تمدّن ‘ تصوّف ‘ شریعت ‘ کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھوگئی
یہ اُمت روایات میں کھوگئی

لبھاتا ہے دِل کو کلام خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اُس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد — محبت میں یکتا ، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھوگیا — یہ سالکِ مقامات میں کھوگیا
بجھی عشق کی آگ ، اندھیر ہے — مسلماں نہیں ، راکھ کا ڈھیر ہے

(3)

شرابِ کُہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بناکر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے — نفس اِس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے ، پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰ ، سوزِ صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگرِ بخش دے — مرا عشق ، میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے ، تو اس کو سیّار کر
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دِل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری ، آرزوئیں مری — امیدیں مری، جستجوئیں مری
مری فطرت آئینہ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغ زار
مرا دِل مری رزم گاہ حیات — گمانوں کے لشکر و یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی ! متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹادے ، ٹھکانے لگا دے اسے

(4)

دما دم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دور

گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل — خوش آئی اسے محنت آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں ، بے نظیر

یہ عالم ، یہ بت خانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خو ، نہیں — کہ تو میں نہیں ، اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں ، تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں، اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چُور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

کہیں جُرّہ شاہینِ سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور — پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

(5)

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو ، راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اِس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت ، حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذت اِسے — تڑپنے ، پھڑکنے میں راحت اِسے

ہوا جب اِسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گل اِس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں ، بڑی زود رس — ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

(6)

یہ موجِ نفس کیا ہے ؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے ؟ تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے ؟ راز درونِ حیات
خودی کیا ہے ؟ بیداری کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تاب ناک
من و تو میں پیدا ' من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ' اَبد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے ' نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے ' شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کش مکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دِل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

(7)

خودی کے نگہباں کو ہے زہرناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اُس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

فرو فالِ محمود سے درگزر
خودی کو نگہ رکھ ' ایازی نہ کر

وہی سجدہ ہے لائقِ احترام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالم ' یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم ' کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

یہ عالم ' یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں
مسافر ! یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اِس خاک داں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے ' تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیر مولا ' جہاں اُس کا صید
زمیں اس کی صید ' آسماں اُس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیِ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تُجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب وزشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ ' گفتار زنگ

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِموے برتر پرَم
فروغِ تجلّی بہ سوزد پرَم

8.7 "ساقی نامہ" کا تجزیہ

ساقی نامہ اقبالؔ کی اہم نظم ہے۔ تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ صوری و معنوی اعتبار سے یہ ایک عمدہ نظم ہے۔ یہ نظم سات بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں موسم بہار کے دلکش ماحول اور رومانی فضا کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ دوسرے بند میں عصر حاضر اور مسلمانوں کے انحطاط کا مرثیہ ... تیسرے بند میں حرکت ... احیائے ملت کے لیے ولولہ وعزم نو' چوتھے بند میں کائنات زندگی کی ماہیت کا بیان' پانچویں بند میں زندگی کی خصوصیات' چھٹے بند میں خودی کی طاقت اور امکانات' ساتویں بند میں خودی کی صفات' پرورشِ خودی کی تلقین ہے۔

پہلے بند میں اقبالؔ بہار کا منظر پیش کرتے ہیں۔ کاروانِ بہار خیمہ زن ہوا ہے اور دامن کوہسار جنت کا نمونہ بن گیا۔ طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ فضا نیلی ہے اور ہوا میں ایک سرور ہے۔ کوہستانی ندی اچھلتی کودتی پہاڑوں کو چیرتی بہہ رہی ہے۔ یہ ندی حرکت اور زندگی کی علامت ہے۔ ایسے خوب صورت منظر میں وہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ مجھے ایسی شراب پلا دے جو حجاب کے پردوں کو جلا دے۔ وہ حجابات جو انسانی عقل اور حقیقت مطلق کے درمیان حائل ہیں۔ ایسی مئے جس کو پی کر وہ حقائق کائنات سے آگہی حاصل کرے اور حیات کے راز اس پر عیاں ہوں۔ ان رازوں کے انکشاف سے عشق الٰہی سے مخمور انسان میں ایسی طاقت آجاتی ہے کہ وہ عناصر کائنات' مظاہر فطرت اور زماں ومکاں پر قابو پالیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ممولا شہباز سے ٹکرائے۔ بظاہر معمولی سا انسان (ممولا) اتنی بڑی کائنات (شہباز) کو تسخیر کرنے کا عزم اپنے اندر پاتا ہے۔ یہ طاقت اسے عشق الٰہی کی وجہ سے آتی ہے۔

دوسرے بند میں وہ حالاتِ حاضرہ اور مسلمانوں کے موقف کو پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہر جگہ حرکت وانقلاب ہے۔ انسان کے طرز زندگی میں عظیم تبدیلیاں آئی ہیں۔ زمانے کا انداز بدل گیا۔ شاہی دور ختم ہوا۔ سرمایہ داری کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملوکیت سے لوگ بیزار ہوگئے اس کی جگہ اشتراکیت نے لے لی۔ چین جو صدیوں سے بادشاہت کی لعنت میں گرفتار تھا وہاں ایک انقلاب رونما ہوگیا' فلسطین' شام' عراق اور حجاز مغرب کے خلاف لڑتے ہوئے تائید غیبی اور معجزے کے منتظر ہیں۔ مسلمان اس میں شک نہیں کہ توحید پرست ہے لیکن اس

کے تمدن میں غیر اسلامی رسوم داخل ہو چکی ہیں۔ تصوف پر ویدانت کے فلسفے کا اثر ہے جو بے عملی اور ترک دنیا کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے' شریعت یعنی عقائد وعبادات پر بھی اسلامی باتیں اثر انداز ہو رہی تھیں جنھیں بعض جوازوں کے ساتھ قبول کیا جارہا ہے۔ مسلمان فضول مسائل میں الجھ کر اپنا وقت اور طاقت برباد کر رہے ہیں۔ غیر اسلامی عقائد وافکار کی بنا پر مسلمان قوم اسلام کی روح یعنی عشق رسول سے بیگانہ ہوتی جارہی ہے۔ عشق کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور مسلمان راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے ہیں۔

تیسرے بند میں اقبالؔ پہلے تو یہ دعا کرتے ہیں کہ انھیں عشق رسول عطا ہو۔ پھر ملت کے جوانوں کے لیے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ انھیں حرکت و عمل کی توفیق دے' پھر وہ کہتے ہیں ان کے اندر جو عشق کی آگ ہے 'جو بے خوابیاں ہیں' جو امنگیں جو آرزوئیں' جو امیدیں' جو جستجو' جو بے تابیاں ہیں یہی ان کا سب کچھ ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور اس دولت کو اپنی قوم پر لٹانا چاہتے ہیں تاکہ ان میں بھی وہ ساری خوبیاں پیدا ہو جائیں۔ وہ اپنی قوم کے لیے مٹ جانے کو تیار ہیں۔

چوتھے بند میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ زندگی ہر دم متحرک ہے۔ ہر شے میں ارتقائی عمل جاری ہے۔ اللہ نے زندگی اور کائنات دونوں کو ترقی پذیر بنایا ہے جس طرح شعلے میں دھویں کی موج چھپی ہوئی ہے اسی طرح زندگی کی وجہ سے جسم کا وجود ہے اور وہ نمو پا رہا ہے۔ جسم کے بغیر زندگی بھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ زندگی ثابت بھی ہے اور سیار بھی... یعنی اس میں دو متضاد خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یعنی متحرک بھی ہے اور غیر متحرک بھی... زندگی عناصر میں گرفتار ہے اس لیے اس سے بیزار ہے۔ آب و گِل یعنی مٹی اور پانی کی صحبت اسے گراں بھی گزرتی ہے لیکن پانی اور مٹی سے وہ محنت کر کے بہت کچھ پاتا بھی ہے۔ وحدت حیات کثرتِ مظاہر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ دنیا جسے وہ بت خانہ شش جہت کہتے ہیں۔ حیات کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ زندگی نے ہی عالم کے اس بت (سومنات) کو تراشا ہے۔ یعنی عالم ایک ایسا بت ہے جسے زندگی نے تراشا ہے۔ زندگی تکرار کو پسند نہیں کرتی۔ کوئی فرد کسی سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ زندگی میں اتنا تنوع ہے۔ زندگی انجمن بھی ہے اور محفل میں خلوت نشیں بھی ہے۔ افراد کبھی انجمن بن جاتے ہیں کبھی بھیڑ میں تنہا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے کئی رنگ ہیں۔ زندگی ہر شئے میں ہے بجلی' تارے' چاندی' سونے' پارے' بیاباں' ببول' کانٹے' پھول' کہسار' چڑیا' مور' شاہین' چکور' کبوتر سب کے سب زندگی کے مختلف مظاہر ہیں۔

پانچویں بند میں بھی وہ زندگی کی صفات بیان کرتے ہیں۔ وہ حرکت و عمل کا فلسفہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شئے میں حرکت ہے اور ہر وجود نئی نئی شکلیں اور صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ تغیر بھی حرکت کی دین ہے۔ جو لوگ زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ اسے ایک راز سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوق پرواز ہی زندگی ہے۔ زندگی ہر وقت سفر میں رہتی ہے اور مختلف منزلیں طے کرتی جاتی ہے۔ وہ کبھی حضر نہیں کرتی۔ حضر (قیام کرنا) سفر کی ضد ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ زندگی حضر میں ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ زندگی تصادم' ہنگامہ اور ٹکراؤ میں لذت محسوس کرتی ہے۔ زندگی اپنے ماحول سے جنگ کرتی ہے۔ مشکلات سے مقابلہ کرتی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی مخالف موت ہے۔ لیکن زندگی نے موت پر بھی بڑی حد تک قابو پالیا۔ یعنی ایسے خطرات جو موت کا باعث بن سکتے ہیں (جیسے درندے' زہریلے کیڑے' موسم کی سختیاں' امراض وغیرہ)۔ انسان کے پاس مذاق دوئی یعنی نر اور مادہ کا امتیاز بھی ہے' اس طرح اس نے

زوج سے فوج تیار کرلی۔ زندگی بے ثبات نہیں ہے ایک نقش مٹتا ہے تو دوسرا ابھرتا ہے۔ یعنی کوئی مرتا ہے تو کوئی پیدا ہوتا ہے اس طرح زندگی جاری وساری رہتی ہے۔ زمانہ جسے کہتے ہیں وہ دراصل شب وروز کی ایک زنجیر ہے اسی طرح زندگی بھی دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے۔

چھٹے بند میں اقبالؔ خودی کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کا سب سے اعلیٰ روپ خودی ہے۔ زندگی اگر تلوار ہے تو خودی تلوار کی دھار ہے۔ جس طرح دھار کے بغیر تلوار بے مصرف ہے۔ اسی طرح خودی کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ خودی کے بغیر کائنات بیدار نہیں ہوسکتی۔ کائنات کی خودی انسان یعنی اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کو اپنی خودی پہچاننے کے لیے مراقبے یا دھیان گیان کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف خلوت یعنی تنہائی ہی میں ممکن ہے۔ اس کے لیے مظاہر کائنات سے اپنا تعلق توڑ کر پوری توجہ اپنی ذات پر مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان ایک بوند کی طرح ہے اور خالقِ کائنات سمندر ہے۔ پانی کی ایک بوند میں سمندر نظر آنے لگتا ہے پھر اندھیرے اجالے، میں اور تو کا فرق مٹ جاتا ہے اور سارے پردے جو درمیان میں حائل ہیں وہ ہٹ جاتے ہیں۔ خودی اگر درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو پھر ساری حدیں مٹ جاتی ہیں۔ خودی زماں و مکاں کی قید میں رہ کر ترقی کرتی ہے اور جب نقطہ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو زماں و مکاں سے ماورا ہو جاتی ہے لیکن اس نقطہ کمال کو پہنچنے کے لیے اسے کئی معرکے سر کرنے پڑتے ہیں۔ مسلسل سفر اسے قوت اور استحکام بخشتا ہے اور جب وہ قوت حاصل کرلیتی ہے تو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرسکتی ہے۔ خودی کئی صورتوں میں موجود ہے لیکن اس کی کوئی صورت نہیں ہے وہ غیر مادی ہے۔ کبھی وہ چاند میں کرن بن کر، کبھی پتھر میں چنگاری بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ خودی ازل سے ارتقائی منزلیں طے کرتی آرہی ہے۔ آخر کار وہ خاک آدم میں صورت پذیر ہوئی۔ یہ سوال ذہن میں آسکتا ہے کہ خودی اگر لامحدود ہے تو پھر وہ کیسے انسان کے دل میں سما سکتی ہے؟ اقبال بڑی خوبصورت مثال دیتے ہیں۔ جس طرح آنکھ کی تِل میں فلک سما سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کے دل میں خودی سما سکتی ہے اور یہی اس کا نشیمن ہے۔

ساتویں بند میں اقبال پہلے چار اشعار میں خودی کی نگہبانی کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں خودی کی حفاظت کے لیے اکل حلال ضروری ہے۔ جس طرح زہر کھانے سے آدمی مرجاتا ہے اسی طرح لقمۂ حرام کھانے سے خودی کی موت واقع ہوتی ہے۔ خودی کے استحکام کی دوسری شرط غیر اللہ کی غلامی سے پرہیز کرنا ہے۔ مسلمان صرف اللہ کو سجدہ کرے پھر اسے دوسروں کے سامنے سجدہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اللہ کے سوا دوسرے کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں یہ دنیا کے ہنگامے عارضی ہیں۔ یہ عالم جہاں زندگی کا مقصد صرف خورد و نوش (کھانا اور پینا) ہے۔ یہ کائنات خودی کی پہلی منزل ہے۔ یہ مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ تو اس خاک دان سے آگ حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ دنیا تیرے لیے پیدا کی گئی ہے تو دنیا کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ یہ کائنات اس لیے بنائی گئی ہے کہ تو اس کی تسخیر کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات پر فتح حاصل کرکے آگے بڑھنا چاہیے۔ اور جہاں بھی ہیں جنھیں دریافت کرنا ہے ان پر یلغار کرنا ہے۔ اس کائنات میں جتنی چیزیں ہیں، جیسے رات اور دن، موسموں کی تبدیلی، نظام شمسی وغیرہ صرف اس لیے ہیں کہ تو اپنی خودی کی قوتوں کو استعمال کرکے اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں سے باخبر ہوکر اپنا مقام حاصل کرے۔ اقبالؔ انسان کو اس کی حقیقت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو فاتح عالم ہے۔ تیری حقیقت کی وضاحت کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ حقیقت ایک آئینہ کی طرح ہے اور الفاظ زنگ کی طرح ہیں۔ تیری حقیقت بیان

کرنے کی طاقت لفظوں میں نہیں ہے اگرچہ میں اسے سمجھ سکتا ہوں۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا ہے تو خود اپنے من میں ڈوب جا۔ یعنی خدا کو دیکھنا چاہتے ہو تو خودی کو دیکھ لو... اگر تو اپنی جستجو کرے گا تو وہ (خدا) تجھے مل جائے گا۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا۔

8.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء میں سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایم۔ اے (فلسفہ) پاس کیا اور میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔
- اردو میں ان کی شاعری کے چار مجموعے بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز شائع ہوئے۔ فارسی کے شعری مجموعوں میں اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ قابل ذکر ہیں۔
- اقبال کے پہلے شعری مجموعے بانگ درا میں حسن فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں ہیں۔ بال جبریل میں مفکرانہ، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی نظموں میں ڈرامائی رنگ اور خطابت حاوی ہے۔
- اقبال کی شاعری میں جو فلسفہ ملتا ہے اس کے اہم نکات خودی، عشق، فقر اور عمل ہیں۔
- اقبال کا تصوراتی انسان "مرد مومن" ہے۔ اقبال سوز و خلوص پر بھی زور دیتے ہیں اسے وہ خون جگر سے تعبیر کرتے ہیں۔
- اقبال کے کلام میں فلسفے کے ساتھ ساتھ فن شاعری کی ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کو خشک اور بے رنگ ہونے نہیں دیا۔
- نادر تشبیہات، رمز، کنایہ، صنائع و بدائع کے استعمال میں انہوں نے کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال نے جتنی تراکیب استعمال کی ہیں اس کی مثال کسی اور اردو شاعر کے یہاں کم ہی ملتی ہے۔
- اقبال نے اپنی شاعری میں قرآنی آیتوں اور احادیث کا بھی خوبصورت استعمال کیا ہے۔
- "ساقی نامہ" اقبال کی اہم نظم ہے۔ اس میں اقبال کا پورا فلسفہ سمٹ آیا ہے۔
- تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ صوری و معنوی اعتبار سے یہ ایک عمدہ نظم ہے۔ یہ نظم سات بند پر مشتمل ہے۔
- پہلے بند میں موسم بہار کے دلکش ماحول اور رومانی فضا کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ دوسرے بند میں عصر حاضر اور مسلمانوں کے انحطاط کا مرثیہ گوئی ہے۔
- تیسرے بند میں حرکت... احیائے ملت کے لیے ولولہ و عزم نو' چوتھے بند میں کائنات زندگی کی ماہیت کا بیان'
- پانچویں بند میں زندگی کی خصوصیات' چھٹے بند میں خودی کی طاقت اور امکانات'
- ساتویں بند میں خودی کی صفات' پرورشِ خودی کی تلقین ہے۔ اس بند میں انھوں نے انسان سے خطاب کیا ہے۔

8.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ارم	:	خوبصورت باغ، شداد کی جنت
بے مہری ایام	:	زمانے کی بے مروتی
تجلی کدہ دل	:	دل، جہاں نور ہتا ہے
تلاطم	:	موجوں کا زور، جوش، ولولہ بپا کرنا
ناصبور	:	بے چین
رم زندگی	:	زندگی سے بھاگنا
زنار	:	وہ دھاگا جو ہندو گلے میں اور بغل میں پہنتے ہیں
زہر ناب	:	کاٹنے والا زہر
سوز جگر	:	جگر کی آگ
سیماب	:	پارہ
ضرب کلیمی	:	جناب موسیٰ کا عصا سے چوٹ لگانا
عالم لاہوت	:	عالم ذات الٰہی جہاں سالک کو مقام فنافی اللہ حاصل ہوتا ہے
غواص	:	غوطہ خور
طیور	:	پرندے
تنویر	:	روشنی
خاور	:	مشرق
شرر	:	چنگاری
نفس	:	سانس، دم، لمحہ

8.10 نمونہ امتحانی سوالات

8.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. علامہ اقبال کس شہر میں پیدا ہوئے؟
2. اقبال کی پیدائش کس سن میں ہوئی؟

3. اقبال کے والد کا نام کیا تھا؟

4. اقبال نے کس شاعر سے شرف تلمذ حاصل کیا؟

5. علامہ اقبال نے کس یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی؟

6. اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم کا نام بتائیے۔

7. اقبال کا کون سا مجموعہ کلام فارسی اور اردو دونوں میں ہے؟

8. "ساقی نامہ" میں کتنے بند ہیں؟

9. "روح اقبال" کے مصنف کا نام بتائیے۔

10. ساقی نامہ" کس مجموعے میں شامل ہے؟

8.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ساقی نامہ کا مرکزی خیال کیا ہے؟ بیان کیجیے۔

2. اقبال کی شاعری میں جو فلسفے پائے جاتے ہیں، اختصار سے قلم بند کیجیے۔

3. ساقی نامہ کے کسی ایک بند کی تشریح کیجیے۔

4. اقبال کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

5. اقبال کے اردو مجموعوں کا تعارف پیش کیجیے۔

8.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. علامہ اقبال کے حالات زندگی اور کارنامے قلم بند کیجیے۔

2. علامہ اقبال کی نظم نگاری کا احاطہ کیجیے۔

3. ساقی نامہ کا تجزیہ کیجیے۔

8.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.	بال جبریل	علامہ اقبال
2.	اقبال نمبر	شاعر (بمبئی)
3.	ذکر اقبال	مولانا عبدالمجید سالک
4.	روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
5.	فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم

بلاک III : اقبال کے معاصرین

اکائی 9: چکبست کی نظم نگاری: رامائن کا ایک سین

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید
9.1 مقاصد
9.2 چکبست کا تعارف اور نظم نگاری کی خصوصیات
9.2.1 حالات زندگی
9.2.2 ادبی خدمات
9.2.3 نظم نگاری کی خصوصیات
9.3 نظم "رامائن کا ایک سین" کا متن
9.4 نظم "رامائن کا ایک سین" کا تنقیدی جائزہ
9.5 اکتسابی نتائج
9.6 کلیدی الفاظ
9.7 نمونہ امتحانی سوالات
9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

اردو نظم کی تاریخ میں پنڈت برج نارائن چکبست کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور شبلی نعمانی کے بعد چکبست نے حب الوطنی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ بالخصوص ان کی نظمیں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔ حب

الوطنی اور قوم پرستی کے موضوع پر چکبست نے "خاک ہند"، "قوم کی لڑکیوں سے خطاب"، "پھول مالا"، "آوازہ قوم"، "رامائن کا ایک سین" وغیرہ نظمیں لکھی ہیں، جو قابل تحسین ہیں۔

"رامائن کا ایک سین" چکبست کی ایک شاہ کار نظم ہے۔ اس نظم میں انہوں نے والمیکی کی رامائن کے اس حصے کو موضوع بنایا ہے، جس میں رام چندر جی اپنا راج پاٹھ چھوڑ کر جوگی کا بھیس اختیار کر کے چودہ برس کے لیے بن باس جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ اس اکائی میں آپ چکبست کی حیات و خدمات، ان کی نظم نگاری کی خصوصیات کے علاوہ نظم "رامائن کا ایک سین" کے متن کی قرأت کریں گے اور ساتھ ہی اس نظم کے تنقیدی تجزیے کا بھی مطالعہ کریں گے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- چکبست کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- چکبست کی ادبی خدمات پر روشنی ڈال سکیں۔
- چکبست کی نظم نگاری کی خصوصیات کو سمجھ سکیں۔
- نظم "رامائن کا ایک سین" کے متن کی قرأت کر سکیں۔
- نظم "رامائن کا ایک سین" کا تنقیدی جائزہ لے سکیں۔

9.2 چکبست کا تعارف اور نظم نگاری کی خصوصیات

9.2.1 حالات زندگی:

چکبست کا پورا نام برج نارائن چکبست تھا۔ ان کے آبا و اجداد کشمیری پنڈت تھے، جو اٹھارویں صدی کے اواخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ چکبست کی پیدائش 19 جنوری، 1882 کو محلہ راٹھ حویلی، فیض آباد میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام پنڈت اُودِت نارائن چکبست اور والدہ کا نام کچھی شوری تھا۔ چکبست کے والد پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں شاعری سے شغف تھا اور شعر بھی کہتے تھے۔ وہ یقین تخلص اختیار کرتے تھے۔ اودت نارائن چکبست کا کوئی مجموعہ کلام شائع ہونے کا ثبوت تو نہیں ملتا البتہ ان کے اشعار ملتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اللہ اللہ اثر نالوں کا ترے اے بلبل
پردۂ غیب سے گل چاک گریباں نکلا

چکبست کی عمر تقریباً پانچ برس رہی ہو گی تبھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی لیے چکبست کی والدہ کو مجبوراً اپنے بھائی لالتا پرساد کے ساتھ لکھنؤ میں رہنا پڑا۔ وہیں چکبست کی پرورش و پرداخت شروع ہوئی۔ والد کے انتقال کے سبب چکبست کی باقاعدہ تعلیم دیر سے شروع

ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، جہاں ان کو ایک مولوی صاحب اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے۔

1895 میں چکبست کا داخلہ کاظمین مڈل اسکول میں کرایا گیا جہاں سے انہوں نے 1897 میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں 1898 میں گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ 1902 میں میں ایف۔ اے۔، 1905 میں بی۔ اے۔ پاس کیا اور 1907 میں وکالت کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا۔ اس وقت لکھنؤ میں وکالت کی پڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ الہ آباد سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لے کر وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔

چکبست نے دو شادیاں کیں تھی۔ ان کی پہلی شادی 1905 میں "جوالا" کے ساتھ اس وقت ہوئی جب وہ بی۔ اے۔ کر رہے تھے، لیکن ایک سال بعد ہی جب بچے کی پیدائش کے وقت جوالا کا انتقال ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد بچہ بھی فوت ہو گیا۔ چکبست کی دوسری شادی 1907 میں پنڈت سورج ناتھ آغا کی بیٹی " کھیما دیوی" سے ہوئی، جو ایک سرکاری وکیل کی بیٹی تھیں۔ اس وقت چکبست وکالت کی پڑھائی مکمل کر چکے تھے۔ کھیما دیوی سے ان کی کئی اولادیں ہوئی، لیکن ان سے صرف ایک بیٹی "مہاراج دلاری" زندہ رہی، جن کی شادی "شری برجندر ناتھ کاک" سے ہوئی۔ چکبست کا خاندان مالی اور علمی حیثیت سے بہت بلند تھا مگر ان کے والد نے تمام جائداد، جو ان کے بزرگوں نے چھوڑی تھی، ختم کر دی۔ اس لیے چکبست کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مختصر یہ کہ چکبست ہمیشہ انتہائی نامساعد حالات سے دوچار رہے۔ چکبست کا انتقال اسی نامساعد حالات میں محض 44 برس کی عمر میں 12 فروری 1926 کو لکھنؤ میں ہوا اور وہیں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

9.2.2 ادبی خدمات:

چکبست کی طبیعت بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ وہ نو سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ ان کا پہلا شعر ملاحظہ ہو:

تڑپ کر توڑ ڈالے بند بازو کے کبوتر نے
بہت باندھا تھا کس کر ایک پر کو دوسرے پر سے

درج بالا شعر سے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ چکبست کے مکان کے متصل ہی نواب وزیر حسن کا مکان تھا۔ نواب صاحب کو کبوتر بازی کا شوق تھا۔ ایک روز ان کی چھت پر کسی اور کا عمدہ کبوتر اڑ کر آ گیا۔ نواب صاحب نے اسے پکڑا اور اس کا پر باندھ دیا، لیکن گرہ کھل گئی اور وہ کبوتر اڑ گیا۔ اس وقت چکبست یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور برجستہ یہ شعر کہہ دیا۔

چکبست شاعری میں منشی سید افضل علی خاں لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے غزل، نظم، مرثیہ وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ چکبست نے اپنی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1894 نظم "حب قومی" سے ہوا۔ اس نظم کو انہوں نے کشمیری پنڈتوں کی کانفرنس "سوشل کانفرنس کشمیری پنڈتاں" کے ایک اجلاس میں سنائی۔ چکبست نے 1901 میں ہندوستان کے معروف جج "مہادیو گووند راناڈے" کی وفات پر مسدس کی شکل میں مرثیہ کہا، جو ان کا پہلا مرثیہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ چکبست میر انیس سے بہت متاثر تھے، اسی لیے ان کے بیشتر مرثیے مسدس کی ہیئت میں ہیں۔

1926 میں "صبحِ وطن" کے عنوان سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہوا، جو ان کی پہلی کتاب بھی ہے۔ اس مجموعے میں غزل، نظم اور شخصی مرثیے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کل اشعار کی تعداد2025 بتائی جاتی ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد 477 اور غزلوں کی تعداد 58 ہے۔ چکبست کی بیشتر نظمیں مسدس کی ہیئت میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب "مضامین چکبست" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں چکبست کے بیس مضامین شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں چکبست کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔ چکبست کے انتقال کے بعد کالی داس گپتا رضا نے ان کی چار کتابیں مرتب کر کے شائع کیں، جن میں کلیات چکبست، مقالات چکبست، چکبست و باقیات چکبست اور سہو د سراغ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ عبد الستار دہلوی، روپ نارائن اور عطیہ نشاط نے چکبست کے کلام کا انتخاب مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ چکبست نے ایک رسالہ "ستارۂ صبح" بھی جاری کیا تھا، جو اس وقت بہت مشہور تھا۔

9.2.3 نظم نگاری کی خصوصیات:

چکبست کا شمار دور جدید کے اہم نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری بالخصوص نظم نگاری کے ذریعے ایک سچے محب وطن ہونے کا ثبوت دیا اور اپنی شاعری کو قوم کی اصلاح و فلاح کا ذریعہ بنایا ۔ جدید دور میں ان کا نام علامہ اقبال اور حسرت موہانی جیسے بلند مرتبت شعرا کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں قومی شاعر کا لقب سے بھی دیا گیا ہے۔ انہوں نے قومی اور حب الوطنی موضوعات پر کئی نظمیں لکھی ہیں، جن میں خاک ہند، وطن کا راگ، آوازۂ قوم، مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام وفا، فریاد قوم، قوم کے سورماؤں کی الوداع، ہمارا وطن دل سے پیارا وطن، وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک، برق اصلاح، کرشن کنھیا، قومی مسدس، رامائن کا ایک سین، گائے، گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات سے چکبست کے قومی اور ملی نظریات بھی کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

چکبست کی شاعری کی ابتدا ہی حُب الوطنی اور قومی ہمدردی سے ہوتی ہے۔ انھوں نے محض نو سال کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ چکبست نے اپنی پہلی نظم "حُب قومی" کے عنوان سے 1894 میں لکھی، جس کو انہوں نے لکھنؤ کے ایک جلسے میں پڑھی بھی۔ کم عمری میں ایسی نظم لکھنے پر ان کو بہت داد ملی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کا مذاقِ شعری پروان چڑھنے لگا اور ان کا مطالعہ و مشاہدہ بھی وسیع ہوا، جس کی وجہ سے ان کے کلام میں پختگی آنے لگی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہر طرف قومی ہم دردی اور حُب الوطنی کا چرچا تھا۔ سرسید اور حالی ہندوستانیوں کی تعلیم اور ترقی کا صور پھونک چکے تھے۔ ان کے بعد کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ان کی آواز میں آواز ملائی۔ انگریزوں کی ظالمانہ حکومت، ہندوستانیوں کی ذلت و محکومی سے تمام حسّاس فن کار و ادیب دل برداشتہ تھے۔ اندر ہی اندر آزادی کی آرزو کروٹ بدل رہی تھی اور ہندوستانیوں کے آپسی اتحاد و اتفاق اور یک جہتی کی اہمیت سمجھ میں آرہی تھی۔ مختلف طبقات میں ہم آہنگی اور یگانگت کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جانے لگی۔ ایسے دور میں اقبال، جوش ملیح آبادی، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم نے حُب الوطنی کے گیت گائے اور اتحاد واتفاق کی تعلیم کو اپنی شاعری سے عام کرنے کی کوشش کی۔ ایسے دور میں چکبست نے "خاکِ

ہند" کے عنوان سے جو نظم لکھی، وہ اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں :

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حُسنِ ازل عیاں ہے　　　اللہ رے زیب وزینت، کیا اَوجِ عزّ وشاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　　چین و عرَب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　　چشم و چراغِ عالَم تھی سر زمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کُہن میں

چکبست کی بیشتر نظموں میں ہمیں جب الوطنی کا عکس جا بجا نظر آتا ہے انہیں اپنے وطن سے بے لوث محبت تھی۔ مسلکی و قومی معاملات میں وہ ایک خالص ہندوستانی تھے، مگر ان کی شاعری میں قومی یکجہتی کا خوب درس ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم نگاری کے ذریعے نہ صرف حب الوطنی کے گیت گائے بلکہ ہندو مسلم اتحاد اور آزادی تحریک کی کھل کر حمایت کی۔ ان کے سامنے اپنے وطن کی گنگا جمنی تہذیب کی مثال موجود تھی۔ لہٰذا انہوں نے حالی اور علامہ اقبال کی روش پر قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانی نوجوان کی اصلاح کی۔ ان میں تعلیمی بیداری اصلاحی پہلو کا جذبہ پیدا کر کے وطن سے محبت کرنا سکھایا۔ چکبست کی نظمیں قومی اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے

چکبست کی قومی شاعری کے متعلق اثر لکھنوی لکھتے ہیں:

"صرف چکبست ہی وہ قومی شاعر ہے جس نے کل ہندوستان کے جذبات و نظریات کی بلا تفریق مذہب ترجمانی کی ہے۔"

اسی طرح پروفیسر احتشام لکھتے ہیں:

"ہماری غلطی ہو گی اگر ہم چکبست کے یہاں کوئی بین الاقوامی نقطہ نظر تلاش کریں۔ اگر ہم ان کے عصر حاضر کے یہاں کوئی سیاسی فلسفہ ڈھونڈیں، اگر ہم ان کے عصر حاضر کے جمہوری نظریہ کا شاعرانہ بیان سننا چاہیں، ان کے جذبات وخیالات اس ہندوستان سے وابستہ تھے، جس میں گوکھلے اور بشن نرائن کی آواز گونج رہی تھی اور جنہوں نے حب وطن کا درس دے کر ایک اصلاحی

پروگرام ہندوستان کے سامنے رکھا تھا۔"

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چکبست صرف قومی شاعر ہی نہیں تھے بلکہ سماجی اصلاح، نوجوانوں کی تربیت، بچوں سے محبت اور ان کی بہترین تربیت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی مشہور نظموں "پھول مالا" اور "قوم کی لڑکیوں سے خطاب" میں لڑکیوں کو ترقی کی دوڑ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

پنڈت برج نارائن چکبست کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے بلکہ ہمیں ان کے یہاں سماجی اصلاح کا منطقی طریقہ ملتا ہے، جس میں مشرقی و مغربی تہذیب کے عناصر گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پرانی تہذیب سے جو کچھ بھی اچھی قدریں ملے اسے پوری طرح سمیٹ لینا چاہیے لیکن اس سے بھی نئی روشنی اور نئے تمدن سے بھی آنکھیں چار کرنا چاہیے۔ ہماری تہذیب مشرق و مغرب دونوں کا عکس ہونا چاہیے۔ چکبست اسی تہذیب کے قائل تھے لیکن اس بات کے مخالف تھے کہ ان کی قوم دوسری تہذیب کی پیروی کرے اور ان کے نقش قدم پر چلے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہمیں اپنا راستہ خود بنانا چاہیے۔

وہ حب وطن خون میں شامل نہیں رکھتے
گو حوصلہ رکھتے ہیں مگر دل نہیں رکھتے

چکبست کے یہاں اصلاحی پہلو اور حب الوطنی کا جذبہ ہر جگہ کار فرما ہے۔ انہوں نے ہر اس چیز سے نوجوانوں کو منع کیا جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔ خواہ وہ تعلیم و تربیت کا مسئلہ ہو یا مال و دولت کا، مال و دولت سے متعلق چکبست کا نظریہ متوازن ہے۔ وہ دولت کو مزدوری سمجھتے ہیں لیکن ان کی مناسب تقسیم کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں زر ہونا چاہیے اور دولت اس لیے بھی نہیں کمانی چاہیے کہ اس کا مظاہرہ کیا جائے۔ وہ قوم کو مشورہ دیتے ہیں کہ زندگی میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہے، جو لوگ مالدار ہیں انہیں چاہئے کہ دوسروں کی مدد کریں۔ اس سلسلے میں ایک بند ملاحظہ کیجیے:

کہتے تھے برا زر کو سخن سنج پرانے — ان لوگوں کے ہمراہ گئے ان کے زمانے
وہ فلسفہ علم وادب اب ہیں فسانے — بدلا ہے نیارنگ زمانے کی ہوا نے

دولت سے ہے اب زیست کاشانۂ تہذیب
کہتے ہیں اسے شمع جلوہ خانۂ تہذیب

چکبست کے یہاں صرف حب الوطنی یا قوم پرستی کے ہی موضوعات نہیں ملتے بلکہ حکمت و فلسفہ، عشق و محبت، ہجر و وصال وغیرہ کے بھی اشعار ملتے ہیں، لیکن ان میں بھی قومیت و وطنیت کے عناصر غالب ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں سماج کے غلط رسم و رواج اور عقائد پر کاری ضرب لگائی ہے۔ جہاں انگریزی تہذیب پر کھل کر طنز کیا ہے وہیں ہندوستانی تہذیب کی طرف رغبت دلائی ہے۔

چکبست کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا انداز بیان سادہ لیکن انتہائی دلکش ہوتا ہے۔ ان کی تقریباً سبھی نظموں میں اچھوتی

تمثال نگاری نظر آتی ہے۔ ان کی اس سادگی کو فنی تکنیک میں سہل ممتنع کہا جاسکتا ہے۔ چکبست کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کا نقطہ نظر بہت وسیع اور کشادہ تھا۔ وہ تنگ دلی و تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ ہر جگہ باہمی محبت واخوت کے نقطہ نظر کے حامی نظر آتے ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کا پورا کلام انسانیت کے معیار کی تعمیر کا ضامن ہے۔ بنیادی طور پر وہ نظم ہی کے شاعر ہیں۔ اپنی نادر شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر ہی برج نارائن چکبست کا شمار بلاشبہ اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔

9.3 نظم "رامائن کا ایک سین" کا متن

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام — راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ — نور نظر یہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرہ کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا — افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا — وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا
درد دل غریب جو صرف بیاں ہوا
خون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید　　　اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید　　　سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم　　　ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم　　　تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال　　　دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال　　　آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر　　　گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر　　　یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ　　　منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ　　　اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز　　　اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　　لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری میں نہ ان پر کرو نظر کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر

خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کرد گار
تم ہی نہیں ہو کشتہ نیرنگ روزگار ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار

سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوز دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب

کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گل ہوئے رنگ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال ان بے کسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار — کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار — یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام — بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام — قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں — ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں — وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار — موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار — وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو رب کریم کا
موج سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر — صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر — رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

یہاں سے رام چندر جی کی ماں کا جواب شروع ہو جاتا ہے۔

9.4 نظم "رامائن کا ایک سین" کا تنقیدی جائزہ

نظم "رامائن کا ایک سین" بائیس (22) بندوں پر مشتمل ہے، جو مسدس کی شکل (ہیئت) میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کو چکبست نے 1906 میں لکھا تھا۔ "رامائن کا ایک سین" میں چکبست نے رام کے بن باس جانے کی تیاری کو موضوع بنایا ہے۔ اس کی تخلیق میں چکبست

نے بالمیکی اور ادھیاتم رامائن سے استفادہ کیا ہے۔ اس نظم کے لیے چکبست نے رامائن کے اس سین کا انتخاب کیا ہے جہاں رام راج پاٹ چھوڑ کر جوگی کا بھیس اختیار کر کے چودہ برس کے لیے بن باس جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ بالمیکی رامائن میں سین اس طرح ہے کہ رام کو راجا دسرتھ اپنے محل میں بلاتے ہیں، جہاں وہ کیکئی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ وہیں کیکئی رام کو بتاتی ہے کہ تمھیں چودہ برس کا بن باس اور بھرت کے لیے اجودھیا کی راج گدی کا بر میں نے مہاراج سے مانگا ہے جس کا وعدہ انھوں نے مجھ سے کیا تھا۔ اس لیے اب تم جلدی سے بن باس جانے کی تیاری کرو۔ رام کے بن باس جانے کی بات کیکئی کے منہ سے سنتے ہی راجا دسرتھ غش کھا کر وہیں گر پڑتے ہیں۔ تب رام انھیں اٹھا کر بیٹھا دیتے ہیں اور اس کے بعد بن باس جانے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ بالمیکی رامائن اجودھیا کانڈ کے انیسویں سبق کے شلوک نمبر 34,35 کے مطابق: ”سری رام نے اپنے اوپر خوبصورت چتر لگانے کی مناہی کر دی۔ ڈالے جانے والے مزین چنور بھی روک دیے۔ وہ رتھ لوٹا کر کنبے کے لوگوں اور نگر باسیوں کو بھی وداع کر کے دکھ کو دل میں ہی دبا کر انفاس کو قابو میں کر کے یہ دکھ سے بھری خبر سنانے کے لیے ماں کو شلیا کے محل میں گئے۔ اس وقت انھوں نے دل کو پوری طرح قابو میں کر رکھا تھا۔“ یہیں سے چکبست کی رامائن کا آغاز ہوتا ہے۔

چکبست اس نظم کے پہلے بند میں کہتے ہیں کہ رام چندر جی نے جب اپنے خدا کا نام لے کر اپنی منزل مقصود کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو جانے سے پہلے اپنی ماں کوشلیا سے ملنے کا ارادہ کیا۔ ارادہ کرتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ غمگین ہو گئے اور اپنی قمیض کے دامن سے اپنے آنسو صاف کرنے لگے اور دل ہی دل میں یہ سوچنے لگے کہ اگر ماں مجھے اس حالت میں دیکھے گی تو اداس ہو جائے گی اور یہ ماں پر ظلم ہو گا۔ اس لیے مجھے ہمت سے کام لینا چاہیے۔

دوسرے بند میں شاعر کہتا ہے کہ کم عمر رام چندر جی جب اپنے دل کی حالت پر قابو پاتے ہیں تو اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے خیال کی تصویر کی عکاسی بنی ہوئی، بہت ہی خستہ حالی میں ایک دروازے کے پاس بیٹھی ہیں۔ دکھ کی شدت سے ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہے۔ ان کا جسم ایسا زرد پڑا ہوا ہے کہ جیسے اس میں خون کی ایک بوند بھی باقی نہ ہو۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ گویا وہ کوئی انسان نہیں بلکہ پتھر کی کوئی مورت ہوں۔

تیسرے بند میں چکبست نے یہ بتایا ہے کہ رام چندر جی کی ماں نہ جانے کس خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنے نور نظر یعنی اپنے بیٹے کو دیکھا۔ ان کے ہونٹوں میں ذرا سی جنبش ہوئی اور ایک سرد آہ نکلی۔ ان کی آنکھوں کے کونوں نے ان کے بیٹے کے چہرے کو دیکھا۔ بیٹے کے چہرے کا رنگ دیکھ کر ان کے دل کی حالت بدلنے لگی۔ لہٰذا ان کے جسم کا ہر بال لرزنے لگا۔

چوتھے بند میں شاعر نے رام چندر جی کی ماں کے احساس کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آخر کار امید کے اس قیدی کا قفل یعنی تالا کھل ہی گیا جس کی چابی کھو گئی تھی۔ زندگی میں جو تکلیف اور مصیبت ہے اس کا وہ بھی کھل گیا ہے۔ رام کے بن باس جانے کی وجہ سے ان کی ماں کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان کے جسم کا کوئی حصہ کٹ کر الگ ہو رہا ہو۔ اس درد کو ان کی ماں بیان نہیں کر پا رہی تھیں بلکہ ان کے خون جگر کے رنگ سے ان کی تکلیف عیاں ہو رہی تھی۔

پانچویں بند میں چکبست نے رام چندر جی اور ان کی ماں کے مکالمے کو بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ رام چندر جی کی ماں نے رو کر ان سے یہ کہا کہ میری جان تم خاموش کیوں کھڑے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کس لیے یہاں کھڑے ہوں۔ اگر سب کی خوشی اسی میں ہے کہ تم صحرا کی جانب روانہ ہو جاؤ، لیکن میں تم کو اپنے منھ سے ہر گز اجازت نہیں دوں گی کہ تم جنگل کو جاؤ۔ کیوں کہ میں اپنے آنکھوں کے تارے کو کسی بھی طرح اپنے سے دور نہیں بھیج سکتی۔ اپنی شہزادے کو فقیر یا جوگی بنا کر روانہ نہیں کر سکتی۔

چھٹے بند میں چکبست نے یہ اشارہ کیا ہے کہ راجا دشر تھ کی تین بیویاں تھیں۔ کیکئی، سمترا اور کوشلیا۔ کیکئی کا ایک بیٹا تھا بھرت اور کوشلیا کے تین بیٹے تھے، رام، لکشمن اور ستر ودھن۔ اس بند میں بھرت جی کی ماں کیکئی کی طرف اشارہ ہے جو مال و زر اور تخت و تاج کے لیے اس قدر اندھی ہو گئی ہے کہ اپنے بیٹے بھرت کے واسطے تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے جال بچھانے لگی تھی اور ضد بھی کرنے لگی تھی، جن کی ضد سے راجا دسر تھ نے رام چندر جی کو بن باس کا حکم دیا تھا اور بھرت جی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔

ساتویں بند میں چکبست کہتے ہیں کہ رام چندر جی کی ماں کہتی ہے کہ اگر میں کسی بھکاری کے گھر میں پیدا ہوتی تو یہ رنج و غم دیکھنے نہیں پڑتے۔ یہ شاہی شان و شوکت سانپ بن کر نہیں ڈستے۔ میرے لاڈلے تم ہی میری حکومت کی طرح ہو۔ اگر کوئی یہ تخت و تاج جلا دے تو مجھے خوشی ہو گی۔ تمہارے بغیر میں اس حکومت کا کیا کروں گی۔

آٹھویں بند میں رام چندر جی کی ماں کے جذبات کو نظم کیا گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے کیسی کیسی محنت کر کے یہ سال گزارے ہیں۔ اے بیٹے جب تمہاری شکل دیکھی تو تمہاری شادی کا ارمان پورا ہوا اور جب مجھ پر بڑھاپا آ گیا تو یہ آفت آ گئی۔ میں ان سے ہی دور ہو گئی جن کے لیے میں جوگن بنی تھی، کیا میں نے اس دن کے واسطے یہ سب کیا تھا؟

نویں بند میں چکبست اسی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس بند میں رام چندر جی کی ماں کہتی ہیں کہ ایسے بھی بہت سے نامراد نظر آئیں گے کہ جن کے گھر عمر بھر کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ ایسا ہی میرے گھر میں ہوتا تو اچھا رہتا کہ مجھے بھی اولاد نہ ہوتی تو مجھے سکون رہتا، میرا تو مقدر بن کر بگڑ گیا، پھل پھول کر میرا باغ اجڑ گیا۔ یعنی میرا بیٹا مجھے مل کر مجھ سے دور ہو رہا ہے۔

دسویں بند میں شاعر نے رام چندر جی کی ماں کوشلیا کے مکالمات کو بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ رام چند کی ماں اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے، جو میں یوں مشکلات کے طوفان میں گھر چکی ہوں۔ مجھے اس مشکل سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ اب اگر موت کی صورت میں، میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو ہمیشہ رہنے والی دنیا ہی میں مجھے پناہ مل سکتی ہے۔ میری یہ خطا مجھے تخلیق کرنے والا خالق ہی معاف کر سکتا ہے اور موت ہی میری یہ مشکل آسان کر سکتی ہے۔

گیارہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ رام چندر جی نے جب اپنی ماں کی یہ دلخراش فریاد سنی تو ان کے دل کی کیفیت ایسی ہو گئی گویا ان کے دل پر کسی نے تلوار چلا دی ہو۔ اس وقت ان کی کیفیت یوں بھی تھی کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے کے قریب تھے۔ مگر ہزار کوشش کے باجود وہ ان کو روک نہیں پا رہے تھے۔ انہوں نے یہ سوچا کہ خود سے عاجز آئی ماں کی یہ صورت حال اور اپنے بیٹے کو ناخوش پا کر کہیں وہ اپنی جان ہی سے نہ گزر جائے۔

بارہویں بند میں چکبست نے اسی بات کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد رام چندر جی نے اپنی اداس ماں سے کہا کہ آپ کیوں روتی ہیں۔ پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ بڑھاپے میں آپ کو یہ صدمہ سہنا پڑ رہا ہے، لیکن آپ اپنے دل پر قابو رکھیے۔ اسی خزاں (پت جھڑ) کے موسم سے بہار کے دن نکلیں گے اور یہی پروردگار کی مرضی ہے۔

تیرہویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ رام چندر جی اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جعل، یہ فریب اور یہ دھوکہ دہی جو بھی ہونا ہے سب اس پروردگار کی مرضی سے ہوگا، لیکن اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ جو چیز ظاہر میں دکھائی دے رہی ہے اس پر نظر نہ رکھو، ہمیں نہیں معلوم کہ قدرت نے ہمارے لیے کیا بہتر سوچا ہے۔ ہم اس کی مصلحت کو نہیں جانتے اور یہ بھی نہیں جانتے کہ اسے منظور کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں قدرت پر یقین رکھنا چاہیے۔

چودہویں بند میں اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے رام چندر اپنی ماں سے کہتے ہیں کہ اطمینان ہو، رنج و غم ہو کہ انتشار ہو، ہر حال میں ہمیں خوش رہنا چاہیے اور اس پروردگار کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ رام چندر جی ماں سے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں تم ہی نہیں کہ جس پر مصیبت و پریشانی آئی ہے بلکہ لاکھوں لوگ ہیں جو ماتم میں سوگوار ہیں۔ کیا کوئی دنیا میں ایسا ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ پر کبھی کوئی مصیبت نہیں پڑی یا میں کبھی کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوا۔

پندرہویں بند میں شاعر رام چندر جی کے حوالے سے کہتا ہے کہ دنیا نے اس سے بڑھ کر بھی حالات دیکھے ہیں کتنے ہی بے گناہوں کی زندگیاں خراب ہوئی ہیں۔ اندرونی غم سے دل و جگر تک خراب ہو گئے ہیں۔ کسی کا بڑھاپا ختم ہو گیا اور کسی کی جوانی لٹ گئی۔ نصیب بگڑنے تھے بگڑ گئے، ہم سے کچھ نہ ہو سکا۔ درد و غم کی بجلیوں نے گھروں کو جلا کر خاک کر دیا۔

سولہویں بند میں چکبست نے کوشلیا کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رام کے ماں باپ ہر گھڑی ان کا منھ ہی دیکھ رہے تھے۔ کیوں کہ ان سے ان کے ماں باپ کی بڑی بڑی امیدیں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ سوچنے لگے کہ جس کے دامن پر کبھی دھول بھی اڑ کر نہیں پڑی، جن کو خواب میں بھی کبھی بھول کر چھڑی نہیں ماری ہو، اس کو زندگی کی رنگینیوں سے کیسے محروم ہوتے دیکھوں، میں کیسے اس کے ارمانوں کو خاک کروں؟

سترہویں بند میں چکبست رام چندجی کے ماں باپ کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رام چندر جی کے ماں باپ کا حال دیکھ کر لوگوں کو ملال ہو رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ اب ان کا بچنا محال ہے۔ ان کے ماہ و سال کبریا کو یاد کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ درد ہجر سے ان کا خیال مٹتا جا رہا تھا۔ کچھ دنوں تک بیٹے کے جانے کا غم مناتے رہے۔ آخر رو کر تھک گئے اور اداس بیٹھ گئے۔ کیوں کہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

اٹھارویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ رام چند اپنی ماں کو یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ جس انسان پر غم کا بوجھ پڑتا ہے اس کو پاک پروردگار ہی صبر عطا کرتا ہے۔ مایوسی چوں کہ کفر ہے اس لیے وہ انسان کو گناہ کی جانب لے جاتی ہے۔ اللہ کی ذات ہی انسان کو سب کچھ عطا کرنے والی ذات ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کی راہ میں ثابت قدم رہے۔ وہی بہترین انسان ہے، جس کی گردن اس کے رب کی رضا میں جھکی رہے۔

انیسویں بند میں رام چندر جی اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے ماں آپ کو کس بات کا غم ہے۔ سفر کے بعد میں خوشی خوشی اپنی وطن واپس آؤں گا۔ بات بات ہی میں چودہ برس گزر جائیں گے۔ ہمیں امید کرنی چاہیے کہ دنیا امید پر قائم ہے اور پھر دنیا میں کون ہے جو غم سے دور ہے۔

بیسویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ جیسے باغ میں پھولوں کے باغباں ہوتے ہیں۔ انہیں ان پھولوں کے لیے دن کی دھوپ اور رات کی شبنم بہت بری لگتی ہے، لیکن جس باغ کا رنگ اچانک بدل جائے اس کے پھول ہزار پردوں میں بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو انہیں اپنی جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں وہ بھی اکثر خزاں کے پتے کی طرح افسوس سے اپنے ہاتھ مل رہے ہوتے ہیں۔

اکیسویں بند میں شاعر کہتا ہے کہ رام چندجی اپنی ماں سے کہتے ہیں کہ جو پھول کسی صحرا میں کھلتے ہیں۔ ان پر کسی باغ کی بہار کا انحصار نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی قدرت کے کرشمے ہیں کہ یہ باغ، بادل، ہوا، برف ہر طرح کے موسموں میں اپنی بہار برقرار رکھتے ہیں۔ ان پر جب ان کے پروردگار کا فضل ہو تو جھلسا دینے والی گرم ہوا بھی ان کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوتی ہے۔

بائیسویں اور آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ رام چندر جی نے کہا کہ اگر خدا کی مدد اور کرم اس میں شامل حال رہے تو صحرا بھی ان کے لیے باغ ثابت ہوگا۔ جنگل، پہاڑ اور سفر ہو یا آرام کی کیفیت وہ کسی بھی صورت میں اپنے بندے سے بے خبر نہیں رہتا ہے۔ اگر اس کا کرم شامل حال ہے تو کیسا غم، اس صورت میں جنگل کا دامن بھی ماں کی آغوش سے کم نہیں ہوتا۔

9.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- چکبست کا پورا نام برج نارائن چکبست تھا۔ ان کے آباو اجداد کشمیری پنڈت تھے، جو اٹھارویں صدی کے اواخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔
- چکبست کی پیدائش 19 جنوری، 1882 کو محلہ راٹھ حویلی، فیض آباد میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام پنڈت اُودِت نارائن چکبست اور والدہ کا نام کچھی شوری تھا۔
- چکبست کے والد پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں شاعری سے شغف تھا اور شعر بھی کہتے تھے۔ وہ یقینؔ تخلص کرتے تھے۔ اودت نارائن چکبست کا کوئی مجموعہ کلام شائع ہونے کا ثبوت تو نہیں ملتا البتہ ان کے اشعار ملتے ہیں۔
- چکبست کی عمر تقریباً پانچ برس رہی ہوگی تبھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی لیے چکبست کی والدہ کو مجبوراً اپنے بھائی لالتا پرساد کے ساتھ لکھنؤ میں رہنا پڑا۔ وہیں چکبست کی پرورش و پرداخت شروع ہوئی۔
- والد کے انتقال کے سبب چکبست کی باقاعدہ تعلیم دیر سے شروع ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، جہاں ان کو ایک مولوی صاحب اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے۔
- چکبست شاعری میں منشی سید افضل علی خاں لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے غزل، نظم، مرثیہ وغیرہ اصناف میں طبع

آزمائی کی۔ چکبست کی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1894 نظم "حب قومی" سے ہوا۔

- چکبست نے 1901 میں ہندوستان کے معروف جج "مہادیو گووند راناڈے" کی وفات پر مسدس کی شکل میں مرثیہ کہا، جو ان کا پہلا مرثیہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ چکبست میر انیس سے بہت متاثر تھے، اسی لیے ان کے بیشتر مرثیے مسدس کی ہیئت میں ہیں۔
- 1926 میں "صبحِ وطن" کے عنوان سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہوا، جو ان کی پہلی کتاب بھی ہے۔ اس مجموعے میں غزل، نظم اور شخصی مرثیے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کل اشعار کی تعدا2025 بتائی جاتی ہے۔
- اس کے علاوہ ان کی ایک اور کتاب " مضامین چکبست " کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں چکبست کے بیس مضامین شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں چکبست کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔
- چکبست کے انتقال کے بعد کالی داس گپتا رضا نے ان کی چار کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ جن میں کلیات چکبست، مقالات چکبست، چکبست و باقیات چکبست اور سہو د سراغ شامل ہیں۔
- چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں لکھنوی تہذیب، کشمیری برہمنوں کے مسائل، خواتین کے مسائل، سماجی، سیاسی، ادبی ماحول اور ذاتی ترجیحات بھی شامل ہیں۔
- نظم "رامائن کا ایک سین" بائیس (22) بندوں پر مشتمل ہے، جو مسدس کی شکل (ہیئت) میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کو چکبست نے 1906 میں لکھا تھا۔ "رامائن کا ایک سین" میں چکبست نے رام کے بن باس جانے کی تیاری کو موضوع بنایا ہے۔

9.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
راہِ وفا	:	وفا کا راستہ
نونہال	:	کم عمر بچہ
صورتِ خیال	:	خیال کی طرح
خستہ حال	:	بگڑا ہوا حال
سکتہ	:	حیرت میں کھو جانا
شدتِ ملال	:	غم کی تیزی
تصویر سنگ	:	پتھر کی تصویر
گوشہ ہائے چشم	:	آنکھ کی پتلیاں
موئے تن	:	بدن کا بال
اشک ریز	:	آنسو بہانا

گریز	:	بچنا
انقلاب	:	تبدیلی، بڑی تبدیلی
سوزِ دروں	:	اندرونی جلن
پیری مٹی	:	بڑھاپا ختم ہونا
رنج و محن	:	غم اور تکلیف
کردگار	:	کرنے والا، خدا
دانائے روزگار	:	زمانے کو جاننے والا
حضر	:	ٹھہرنا، رکنا
دامانِ دشت	:	جنگل کا دامن
دامانِ مادر	:	ماں کا دامن

9.7 نمونۂ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. چکبست کا پورا نام کیا تھا؟
2. چکبست کے آباواجداد کہاں کے رہنے والے تھے؟
3. چکبست کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
4. چکبست کے والد اور والدہ کا کیا نام تھا؟
5. چکبست کی پہلی بیوی کا نام کیا تھا؟
6. چکبست کے استاد کا کیا نام تھا؟
7. چکبست کی پہلی کتاب کون سی ہے؟
8. نظم "رامائن کا ایک سین" میں کتنے بند ہیں؟
9. نظم "رامائن کا ایک سین" کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟
10. چکبست کا انتقال کب اور کہاں ہوا؟

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. چکبست کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. نظم "رامائن کا ایک سین" کا خلاصہ پیش کیجیے۔

3. نظم "رامائن کا ایک سین" کے مرکزی خیال کو واضح کیجیے۔

4. نظم "رامائن کا ایک سین" کے حوالے سے رام چندر جی کے چند واقعات کا ذکر کیجیے۔

5. درج ذیل بندوں کی تشریح کیجیے۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام — راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. چکبست کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. چکبست کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. نظم "رامائن کا ایک سین" کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. صبح وطن (مجموعہ کلام) — برج نارائن چکبست
2. چکبست: حیات وادبی خدمات — افضال احمد
3. چکبست اور باقیات چکبست — کالی داس گپتا رضا
4. مضامین چکبست — برج نارائن چکبست
5. پنڈت برج نارائن چکبست: شخصیت اور فن — عزیز نبیل

اکائی 10 : جوش کی نظم نگاری: کسان

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 جوشؔ ملیح آبادی کے حالات زندگی

10.2.1 پیدائش اور تعلیم و تربیت

10.2.2 شعر گوئی کی ابتدا

10.2.3 جوشؔ اور حیدر آباد

10.2.4 حیدرآباد کے بعد جوشؔ کی دیگر ملازمتیں

10.2.5 جوشؔ کی پاکستان کو ہجرت

10.3 جوشؔ کی نظم گوئی

10.3.1 جوش، شاعر فطرت

10.3.2 جوش کی منظر نگاری

10.3.3 جوش، شاعر حسن و عشق

10.4 نظم "کسان" کا متن

10.5 نظم "کسان" کا تجزیہ

10.6 اکتسابی نتائج

10.7 کلیدی الفاظ

10.8 نمونہ امتحانی سوالات

10.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

علامہ اقبال بیسویں صدی کے سب سے ممتاز شاعر ہیں۔ اقبال کے بعد اردو شاعری کے جو دو بڑے نام ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں زمانی ترتیب کے اعتبار سے جوش کو دوسرا بڑا شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

جوش کی شاعری کے کئی پہلو ہیں۔ وہ شاعرِ فطرت ہیں' ان کی بہت سی نظموں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ شاعرِ رومان بھی تھے۔ ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے انہوں نے نظم اور غزل مسلسل دونوں میں ایسی رومانی شاعری کی ہے جسے اردو کی اعلاترین رومانی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ جوش کو شاعرِ انقلاب بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی زبردست آواز بلند کی اور انقلاب کے ایسے نعرے لگائے کہ ان کا یہ شعر عوام وخواص سب کی زبان پر تھا:

کام ہے میرا تغیر' نام ہے میرا شباب

میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب

چنانچہ جنگِ آزادی کے زمانے کی ان کی وطنی اور انقلابی شاعری کے تناظر میں ہندوستانی عوام نے انہیں ' شاعرِ انقلاب' کے خطاب سے نوازا۔ میر انیس کے بعد جوش وہ واحد شاعر ہیں جنہیں زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان کے پاس الفاظ کا بیش بہا خزانہ تھا۔ عشق ومحبت اور رومانی شاعری اور فطرت نگاری کے لیے وہ جو نرم اور سبک الفاظ استعمال کرتے ہیں ان میں پھولوں کی خوشبو ہوتی ہے اور جب وہ انقلابی شاعر کی حیثیت سے گرج رہے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہورہی ہے۔ الفاظ کی گھن گرج سے محسوس ہوتا ہے کہ زلزلہ آگیا ہے۔ جوش کی زباں دانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے قطار باندھے کھڑے رہتے تھے۔ انیس کے بعد زبان پر سب سے زیادہ قدرت ان ہی کو حاصل تھی۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- جوش ملیح آبادی کے حالات زندگی بیان کرسکیں۔
- جوش کی نظم گوئی کے بارے میں اظہار خیال کرسکیں۔
- جوش کی نظم "کسان" کے متن کا مطالعہ کرسکیں۔
- جوش کی نظم "کسان" کی تشریح وتوضیح کرسکیں۔

10.2 جوشؔ ملیح آبادی کے حالات زندگی

شبیر حسن خاں جوش کے اجداد میں ایک بزرگ یار بیگ خاں درۂ خیبر کے سرداروں میں تھے۔ یار بیگ خاں کے دو لڑکے تھے محمد نام دار خان اور محمد بلند خان۔ ان دونوں بھائیوں میں نام دار خان تو اپنے وطن ہی میں رہے لیکن محمد بلند خان اپنے دو بیٹوں محمد عوض خان اور فقیر محمد خان کے ساتھ 1819ء کے آس پاس ہندوستان آکر اتر پردیش میں قائم گنج میں آباد ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد وہ لکھنؤ منتقل ہوگئے جہاں نواب غازی الدین حیدر کی فوج میں تین سو روپے ماہوار پر انہیں ملازمت مل گئی۔ نواب غازی الدین حیدر نے لکھنؤ کے پاس ملیح آباد میں انہیں کنول ہار نام کا ایک محلہ دے دیا جہاں محمد بلند خاں نے اپنے اور اپنے ملازموں کے لیے مکانات بنا دیے۔

جوش کے دادا کا نام محمد احمد خاں بہادر تھا۔ انہیں اپنے باپ سے وراثت میں بے انتہا دولت ملی تھی۔ انہوں نے ملیح آباد میں رہنے کے لیے مکانات بنائے تھے۔ ان کی فیاضی کا بہت چرچا تھا۔ غریبوں میں پیسہ پانی کی طرح بہا دیا کرتے تھے۔ محمد احمد خاں بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا نام ' دیوان احمد ' تھا۔ یہ دیوان پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔

10.2.1 پیدائش اور تعلیم و تربیت:

جوش کے والد کا نام نواب بشیر احمد خاں اور تخلص بشیرؔ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا خوب صورت انسان تھے۔ فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انہیں سعدیؔ حافظؔ اور فردوسیؔ کا پورا کلام ازبر تھا۔ اردو میں میر تقی میرؔ اور میر انیسؔ کے زبردست مداح تھے۔ شاعری میں پہلے مرزا داغ کے شاگرد ہوئے اس کے بعد امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی سے اصلاح لی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی بہت فیاض تھے۔ ان کی سرکار سے سینکڑوں بیواؤں ' یتیموں اور بوڑھوں کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مختلف لوگوں نے جوشؔ کی تاریخ ولادت لکھی ہے۔ کسی نے 1896ء اور کسی نے 1898ء لکھا ہے۔ لیکن خود جوش کا بیان ہے کہ وہ 5 دسمبر 1898ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مولوی نیاز علی خاں نے انہیں فارسی ' مولانا طاہر نے اردو ' مولوی قدرت اللہ بیگ نے عربی اور ماسٹر گومتی پرشاد نے انگریزی پڑھائی۔ جب گھر کی تعلیم مکمل ہوگئی تو انھیں سیتاپور بھیج دیا گیا۔ جہاں فرینچ ایچ اسکول میں انہیں داخل کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال تک جوش نے وہاں تعلیم حاصل کی اور پھر ان کے والد نے سیتاپور سے واپس بلا کر لکھنؤ کے حسین آباد اسکول میں داخل کر دیا جہاں جوش نے چھٹی اور ساتویں کے ایک ساتھ امتحان دیے اور آٹھویں کلاس میں داخل ہوگئے۔ 1912ء میں جوش کو علی گڑھ بھیج دیا گیا اور ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ شرارتوں کی وجہ سے علی گڑھ کالج سے نکالے گئے تو دوبارہ لکھنؤ آئے اور یہاں جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوگئے۔ اس کے بعد وہ اسی شہر میں چرچ مشن اسکول اور ریڈ کرسچین کالجیٹ اسکول میں داخل ہوگئے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران انہوں نے مرزا ہادی حسن رسواؔ سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ لکھنو سے جوش پیٹرز کالج آگرہ چلے گئے۔ آگرے میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ یہ واقعہ 1916ء کا ہے۔ آگرہ میں جوش نے سینئر کیمبرج تعلیم حاصل کی۔ جوش نے اپنی خود نوشت سوانح "یادوں کی برات" میں لکھا ہے کہ وہ چھ مہینے شانتی نکیتن میں رہے۔ یہ دن انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ گزارے۔ شانتی نکیتن

سے جوشؔ ملیح آباد واپس آ گئے۔ یہاں ان کے ذمے جائیداد کی دیکھ بھال ہوگئی۔ یہیں انہوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا اور فارسی کے بڑے شاعروں کا مثلاً سعدیؔ، حافظؔ، خیامؔ، فردوسیؔ، عرفیؔ اور خاقانیؔ وغیرہ کا کلام پڑھا۔

10.2.2 شعر گوئی کی ابتدا:

جوش کے والد کو یہ پسند نہیں تھا کہ جوش شاعری کریں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں پوری کوشش کی تھی کہ جوش شعر گوئی سے باز آجائیں۔ اس سلسلے میں جوش نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

"میں نے نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میں نے خلاف واقعہ لکھی ہے۔ کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ میں شعر نہیں کہتا تھا بلکہ شعر خود کو مجھ سے کہلواتا تھا۔ "

جوش کے والد شاعری کے اتنے خلاف تھے کہ جوش چوری چھپے شعر کہا کرتے تھے۔ اگر کبھی شعر کہتے ہوئے پکڑے جاتے تو انہیں سخت سزا دی جاتی۔ کم سے کم سزا یہ تھی کہ ان کا جیب خرچ بند کر دیا جاتا یا والد کے ساتھ دستر خوان پر کھانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس پابندی کا جوش کی صحت پر بُرا اثر پڑنے لگا۔ ایک دفعہ جوش بے ہوش ہوگئے تو انہیں اجازت دے دی گئی۔ جوش نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی۔ لیکن بہت جلد نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ غزل اور نظم کے علاوہ انہوں نے مرثیے، سلام، گیت، رباعیاں اور قطعے بھی کہے۔ جوش کے والد کے انتقال کے بعد ان کی جائیداد تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ جوش فطرتاً لاابالی تھے۔ اپنی جائیداد کی دیکھ بھال میں ذمہ داری سے کام نہیں لیتے تھے اس لیے ان کے بڑے بھائی نے دستاویزوں پر جوش کے دستخط کرا لیے جس کی وجہ سے جوش اپنی جائیداد کے بہت بڑے حصے سے محروم ہوگئے۔

جوش کو بچپن ہی سے انگریزوں سے نفرت تھی۔ چنانچہ والد کے انتقال کے بعد اترپردیش کے گورنر سرہار کورٹ بٹلر نے بلا کر ڈپٹی کلکٹر یا اسپیشل کورٹ آف وارڈ کی ملازمت پیش کش کی تو انہوں نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔

1918ء میں جوش کو ہندوستان کی سیاست میں دلچسپی ہوگئی اور وہ کانگریس کی جنگ آزادی کی تحریک سے بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں احمد آباد میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ جوش بھی وہیں چلے گئے اور وہاں ان کی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے مہاتما گاندھی سے ان کا تعارف کرایا۔ وہیں جوش کی ملاقات پنڈت نہرو، ان کی بہن وجے لکشمی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد سبحانی سے ہوئی۔ اسی کانفرنس میں جوش، مولانا حسرت موہانی اور کانگریس کے بہت سے دوسرے اہم رہنماؤں سے ملے۔ کچھ ہی عرصے بعد جب جوش لکھنؤ پہنچے تو وہاں ٹیگور آئے ہوئے تھے۔ جوش ٹیگور سے ملنے گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت متاثر ہوئے۔ ٹیگور نے جوش سے کہا کہ میرے والد فارسی کے بہت بڑے اسکالر تھے اور وہ حافظ کا دیوان اپنے سرہانے رکھتے تھے۔ جب جوش رخصت ہونے لگے تو ٹیگور نے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے پاس کچھ دن کے لیے شانتی نکیتن آئیں اور مجھے حافظ کے کلام کو سمجھنے میں مدد کریں۔ جوش نے یہ دعوت قبول کرلی اور کچھ دن کے بعد شانتی نکیتن پہنچ گئے۔ وہاں رہ کر جوش نے ٹیگور کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی۔ جوش کا ٹیگور کے بارے میں خیال تھا کہ وہ نہایت دلچسپ، بے حد شریف، مہذب، حساس اور حسن پرست تھے۔ ہاں ان کی

نمود و نمائش جوش کو پسند نہیں تھی۔ جوش شانتی نکیتن میں چھے مہینے کے قیام کے بعد اپنے وطن واپس آ گئے۔

10.2.3 جوش اور حیدر آباد:

1922ء کا واقعہ ہے کہ جوش کو خیال آیا کہ ان کی جائیداد کا کام کرنے والے تھوڑی تھوڑی کر کے ساری جائیداد ختم کر چکے ہیں اور اب بیوی بچوں کے لیے ان کے پاس کچھ زیادہ رقم نہیں بچی۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ حیدر آباد جا کر ملازمت کی کوشش کریں۔ جوش عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر وحید الدین سلیم سے خط و کتابت کی اور حیدر آباد کے مہاراجا کرشن پرشاد کے نام علامہ اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی، عبدالماجد دریابادیؔ اور سید سلیمان ندوی جیسی اہم شخصیتوں کے سفارشی خطوط لے کر 1924ء کے آغاز میں حیدر آباد پہنچ گئے۔ وہاں جوش کئی مہینے تک ملازمت کے لیے کوشش کرتے رہے لیکن کوئی صورت نہیں نکلی۔

ایک دن حیدر آباد کے نواب میر عثمان علی خاں نے انہیں بلایا اور دوران گفتگو جوش سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جب جوش نے اپنا کلام سنایا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ ایک ہفتے بعد حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں انگریزی ادب کے مترجم کے طور پر جوش کا تقرر ہو گیا۔ جوش کی زندگی عیش و آرام سے گزرنے لگی لیکن انسان کے دن ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ خود مختار ریاست حیدر آباد میں سازشوں کا بازار گرم رہتا تھا۔ جب کوئی بھی شخص حضور نظام سے قریب ہوتا تو اس کے خلاف سازشوں کا جال بچھ جاتا۔ ایسا ہی جوش کے ساتھ ہوا۔ کسی مشاعرے میں جوش نے ایک ایسی نظم پڑھی جس میں نواب میر عثمان علی خاں کے بارے میں اشارتاً کچھ نازیبا باتیں کہی گئی تھیں۔ کسی نے اس نظم کے اشعار جا کر حضور نظام کو سنائے تو وہ ناراض ہو گئے اور یہ معاملہ اس حد تک بڑھا کہ حضور نظام نے انہیں حیدر آباد سے نکلنے کا حکم دے دیا۔ جوش حیدر آباد سے نکل کر پہلے دتیا ریاست آئے اور وہاں سے دھولپور پہنچے لیکن کہیں مناسب انتظام نہیں ہو سکا۔ وہ بالآخر دہلی آئے۔

10.2.4 حیدر آباد کے بعد جوش کی دیگر ملازمتیں:

مسز سروجنی نائیڈو جوش کی بہت بڑی مداح تھیں اور اکثر خود ان کا کلام سنتی تھیں اور دوسری اہم شخصیتوں تک پہنچاتی تھیں۔ دہلی میں مسز نائیڈو سے جوش کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے تجویز پیش کی کہ آپ دہلی سے ایک رسالہ نکالیے۔ جوش پریشان تھے کہ رسالے نکالنے کے لیے رقم کہاں سے ملے گی۔ مسز نائیڈو نے کہا کہ جائیے میرے کمرے میں۔ ایک بہت بڑا لفافہ رکھا ہے وہ خاموشی سے لے کر چلے جائیے اور رسالہ نکالنے کی تیاری کیجیے۔ جوش نے کمرے میں جا کر وہ لفافہ لے لیا۔ دہلی سے 'کلیم' نام سے ایک رسالہ جاری کر دیا۔ پہلے تو اس رسالے کی حالت بہت اچھی رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ جوش کے شاعرانہ مزاج کی وجہ سے 'کلیم' کی مالی حالت خراب ہونی شروع ہو گئی۔ کئی منزلوں سے گزر کر جوش کو یہ رسالہ بند کرنا پڑا۔

جوش اور ساغر نظامی ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی گئے ہوئے تھے جہاں ان کی ملاقات شالیمار پکچرز کے مالک زیڈ احمد سے ہوئی۔ احمد صاحب نے دونوں کو اپنی کمپنی میں ملازمت کی پیش کش کی جو ان دونوں نے قبول کر لی۔ پھر کسی بات پر ان کی زیڈ احمد سے ان بن ہو گئی اور انہوں نے یہ ملازمت ترک کر دی۔ یہ 1948ء کا زمانہ ہے۔ دہلی سے شائع ہونے والے ماہانہ 'آج کل' کے ایڈیٹر کے لیے اشتہار

شائع ہوا اور پنڈت نہرو نے اس عہدے پر جوش کا تقرر کرا دیا۔ کچھ دن بعد جوش آل انڈیا ریڈیو کے ایڈوائزر بھی مقرر ہو گئے۔ اس طرح جوش کو پھر عیش و آرام میسر ہو گیا لیکن ابھی ان کی قسمت میں بہت سے نشیب و فراز باقی تھے۔

10.2.5 جوش کی پاکستان کو ہجرت :

1955ء میں جوش ایک مشاعرے کے سلسلے میں پاکستان گئے تو ایک پرانے دوست سید ابو طالب نقوی کراچی کے چیف کمشنر تھے۔ وہ جوش کو پہلے بھی کراچی آنے کی دعوت دے چکے تھے اور اس دفعہ انہوں نے اتنا اصرار کیا اور ایسے خواب دکھائے کہ جوش ترک وطن کر کے کراچی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ عام خیال ہے کہ جوش کی یہ وہ غلطی تھی جس کی قیمت انہیں زندگی کے آخری ایام تک چکانی پڑی۔ جب جوش پاکستان پہنچے تو مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں کے شاعر اور ادیب یہ سمجھنے لگے کہ جوش کے سامنے ان کا چراغ نہیں جلے گا۔

جوش نے مستقل طور پر اسلام آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ جو شخص محفلوں کی جان تھا اور جس کے دم سے ہندوستان میں محفلوں کی رونق ہوتی تھی وہ اسلام آباد کے ایک گھر میں تنہا پڑا رہتا تھا۔ 22 فروری 1982 کو اردو دنیا اپنے اس قادر الکلام شاعر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔

10.3 جوشؔ کی نظم گوئی

جوش کو شاعر انقلاب' شاعر شباب اور شاعر فطرت کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی انقلابی فکر ہے۔ برطانوی حکومت کے ظلم و استبداد نے ان میں بغاوت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ان میں انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار تھے۔

برطانوی سامراج کے خلاف اور جنگ آزادی کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر جوش کی نظموں کا معیار جتنا بلند ہے اور آزادی حاصل کرنے کے جذبے کی شدت جتنی جوش کی نظموں میں ہے اتنی شاذ و نادر ہی کسی شاعر کے ہاں ملے گی۔

جوش ہماری جنگ آزادی کے سب سے قد آور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری نے لاکھوں مجاہدین آزادی میں آزادی حاصل کرنے کا آہنی عزم پیدا کیا۔ سر پر کفن باندھ کر آزادی کے میدان جنگ میں اترنے کے لیے ولولہ' ہمت اور حوصلہ پیدا کیا۔ جوش نے جنگ آزادی کے سلسلے میں 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب' کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اسے جنگ آزادی کے مجاہدین اور محب وطن ہندوستانیوں میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی زمانے میں اردو کی کسی نظم کو حاصل نہیں ہوئی۔ یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی۔ یہ چھپی ہوئی نظم نئی دہلی کے نیشنل آرکائیوز میں جنگ آزادی کے دوران ضبط ہونے والے ادب کے ذخیرے میں موجود ہے۔ کسی سرکاری افسر نے اس نظم پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ' یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر ہندوستان اور خاص طور

سے یو۔پی' بنگال اور پنجاب میں تقسیم کی گئی ہے' اس نظم کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مجاہدین آزادی جلوس کی صورت میں شہر کا چکر لگاتے تھے اور سب مل کر یہ نظم پڑھتے تھے۔ برطانوی حکومت نے یہ نظم ضبط کر لی تھی۔ اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو ؟ — دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر' بھیڑیا ہے بھیڑیا — بھیڑیے کو مار دو گولی' پئے امن و بقا
باغ انسانی میں چلنے ہی کو ہے بادِ خزاں — آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے — ڈائر گرگ خوں آلود اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے — اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے ؟
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی — جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں — موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

ہم جنگِ آزادی کے اس زمانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے جب دنیا کی سب سے بڑی طاقت یعنی برطانوی حکومت سے نہتے ہندوستانی 'صرف اپنی ہمت اور حوصلے کے بل پر' وطن عزیز کی آزادی کے لیے ظالم سامراجیوں سے لوہا لے رہے تھے۔ اس وقت ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین آزادی دار و رسن کی آزمائش سے گزر رہے تھے۔ جوش نے ' بغاوت ' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ یہ نظم ایک جانباز مجاہد ہی لکھ سکتا تھا' جسے موت کا خوف نہ ہو۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہاں بغاوت ' آگ ' بجلی اور آندھی میرا نام — میرے گرد و پیش اجل' میرے جلو میں قتل عام
زرد ہوجاتا ہے میرے سامنے روئے حیات — کانپ اٹھتی ہے مری چین جبین سے کائنات
الحذر' میری کڑک کا زور' ہنگام مصاف — صاف پڑجاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف
اللہ اللہ بزم ہستی میں مری گل باریاں — ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو ریزہ ریزہ استخواں
الامان والحذر' میری کڑک' میرا جلال — خون سفاکی' گرج طوفان' بربادی' قتال

جوش کی ایک نظم ہے جس میں انقلاب کا نعرہ اس طرح بلند کیا گیا ہے جیسے مجاہدوں کی فوج دشمنوں پر حملہ کر رہی ہے۔ وطن کی محبت اور اس پر قربان ہونے کے جذبے نے اس فوج کے ہر سپاہی میں شہادت کا وہ جذبہ پیدا کر دیا ہے جو انسان کو دنیا کے ہر خطرے سے اور حد تو یہ ہے کہ موت سے بھی بے خوف کر دیتا ہے۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب — میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں — کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا — گھومتا ' گھرتا ' گرجتا ' گونجتا ' گاتا ہوا
خون میں لتھڑی ' بساطِ کفر و دیں الٹے ہوئے — فخر سے سینے کو تانے آستیں الٹے ہوئے

ولولوں سے برق کی مانند لہراتا ہوا   موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھاتا ہوا

جنگِ آزادی کے موضوع پر جوشؔ کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو اردو کی ادبی تاریخ کا اہم حصّہ ہیں اور جنگِ آزادی کی تاریخ بھی ہیں۔ اس موضوع پر جوشؔ کی بعض نظمیں ہمیشہ جنگِ آزادی کی تاریخ کا اہم حصّہ رہیں گی۔ یہ نظمیں ہیں۔ 'بیدار ہو بیدار'، ' غدّار سے خطاب'، 'شکستِ زنداں کا خواب'، 'بھوکا ہندوستان'، 'حیف اے ہندوستان'، 'زنداں کا گیت'، 'دردِ مشترک' ' ترانہ آزادیٔ ہند' , ' دعوت انقلاب' , ' اٹھ اے ندیم' , 'کسان' ۔ ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر خاصی تعداد میں نظمیں ہیں۔

10.3.1 جوش، شاعر فطرت:

جوش اردو کے واحد شاعر ہیں جنہیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہیں شاعر فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ اردو میں فطرت نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس کے بہت اچھے نمونے ہمیں اردو مثنویوں میں مل جاتے ہیں لیکن جوش نے فطرت نگاری کے فن کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جوش کو فطری مناظر سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ مناظرِ فطرت کے زبردست عاشق تھے۔ انہیں صبح کے پو پھٹنے کا منظر بہت پسند تھا۔ اسی لیے وہ صبح چار بجے اٹھ کر باغوں کی سیر کو چلے جاتے تھے۔ صبح کے حسین مناظر سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ صبح کے مناظر انہیں اتنے دلکش لگتے تھے کہ کہا کرتے تھے' ان میں انہیں قدرت حق کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوش کی ایک نظم ' پیغمبرِ فطرت' ہے۔ اس نظم کے شروع میں جوش نے صبح کا منظر انتہائی خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

تاروں نے جھلملا کے جو چھیڑا ستار صبح   گانے لگی چمن میں نسیم بہارِ صبح
غنچوں میں چشمِ ناز سے ٹپکا خمارِ صبح   ابھرا افق سے جامِ زمرّد نگارِ صبح
شاعر کی روح عشق کی ہم راز ہوگئی   دنیا تمام جلوہ گہہِ ناز ہوگئی

جوش فطرت کی منظر کشی میں خوبصورت استعاروں' نادر تشبیہوں' اچھوتے تخیل اور معنی آفرینی سے کام لیتے ہیں۔ وہ جزئیات نگاری سے کام لے کر منظر کی پوری تصویر اس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ تصویر کا ایک ایک پہلو دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ جوش کی ایک نظم ہے ' پانچ نغمے' ۔ اس نظم کے تیسرے بند یا تیسرے نغمے میں جوش نے چڑیوں کی حرکات و سکنات بہت دلچسپ سادہ اور دلنشیں انداز میں بیان کی ہے۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

مہکتے ہوئے پھول کے پاس آؤ   لچکتی ہوئی شاخ پر بیٹھ جاؤ
ہوا میں کبھی اڑ کے بازو ہلاؤ   کبھی صاف چشمے میں غوطہ لگاؤ
یونہی پیاری چڑیو ابھی اور گاؤ   کبھی برگِ تازہ کو منہ میں دباؤ

کبھی کنج میں بیٹھ کر پھڑپھڑاؤ — کبھی گھاس پر لوٹ کر دل لبھاؤ
کبھی جا کے بیلوں کو جھولا جھلاؤ — یونہی پیاری چڑیو ابھی اور گاؤ

10.3.2 جوش کی منظر نگاری:

جوش کا مشاہدہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ وہ جب بھی کوئی منظر پیش کرتے ہیں اس کی تمام تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ کسی مقام پر کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے 'گرمی اور دیہاتی بازار'۔ شاعر تو کیا کسی نثر نگار نے بھی دیہاتی بازار کا ایسا منظر نہ کھینچا ہو گا' جیسا جوش کی اس نظم میں ہے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کا بہت قریب سے اور بہت گہرا مشاہدہ کیا اور نظم لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں دیہاتی بازار کا پورا منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ محفوظ تھا۔ اس نظم کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں دیہاتی بازار کی مکمل عکاسی کی گئی ہے:

شور' ہلچل' غلغلہ' ہیجان' لو' گرمی' بخار — بیل' گھوڑے' بکریاں' بھیڑیں' قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ' گڑ کی بو' مرچوں کی دھانس — خربزے' آلو' کھلی' گیہوں' کدو' تربوز گھانس
دھوپ کی شدت' ہوا کی یورش' گرمی کی رو — کملیوں پر سرخ چاول ٹاٹ کے ٹکڑوں پر جو
گرم ذرّوں کے شدائد' جھکڑوں کی سختیاں — جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کی دھواں

جب برسات کی پہلی گھٹا جھوم کر برستی ہے تو خوشی و مسرت اور کیف و سرور سے جوش بھی جھوم جھوم جاتے ہیں اور اس حسین منظر کو ایسے دلکش الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ سننے والے کے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

کیا جوانی ہے فضا میں مرحبا صد مرحبا — چل رہی ہے روح کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
آرہی ہے دور سے کافر پپیہے کی صدا — حسن اٹھا ہے خاک سے انگڑائیاں لیتا ہوا
جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا — مطربوں نے ساحلوں پر جا کے چھیڑے ہیں ستار
ہل دھرے کاندھے پہ ہنستے جا رہے ہیں کاشت کار — مست ہے جنگل میں چرواہا' چمن میں جوئے بار
گا رہا ہے ناخدا دریا کے سینے پر ملار — جھوم کر برسی ہے کیا برسات کی پہلی گھٹا

جوش کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے' غریب الوطن کا پیام۔ اس نظم میں ایک ایسے شخص کے جذبات بیان کیے گئے ہیں جو فطری مناظر سے دور شہر کے ہنگاموں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کے چھے اشعار ملاحظہ ہوں:

اے چاند جب ستارے گردوں پہ جھلملائیں — جب قدرتی مناظر صحرا میں مسکرائیں
تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو پھیکی — چادر سرک گئی ہو ماتھے سے جب کسی کی
بے داغ جب زمیں ہو اور آسمان کورا — جب سینۂ افق پر غلطاں ہو سرخ ڈورا
مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا — آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا!

جوش فطرت اور اس کے مختلف مظاہر کے پرستار ہیں۔ چڑیوں کی حرکات وسکنات ہوں یا آسمان پر چھائی ہوئی گھٹا' برسات کی رم جھم ہو یا شفق کا منظر' دیہاتی بہار ہو یا زمین پر موتی بکھیرتی ہوئی آبشار' جوش کے لیے فطرت ایک بے جان شئے نہیں بلکہ اس کا زندہ وجود ہے۔ جوش کا عقیدہ ہے کہ جنگل' گلشن اور فطرت سے جو محبت اور خلوص انسان کو ملتا ہے وہ انسانوں سے نہیں ملتا۔ دوست بے وفا ہو سکتے ہیں لیکن فطرت کبھی بے وفائی نہیں کرتی۔ انسان سے فطرت کی دوستی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

جوش حسن کے عاشق اور دیوانے ہیں چاہے وہ حسن فطرت میں ہو یا انسان میں۔ زندگی کی رعنائیوں سے وہ ایک شاعر' ایک انسان دوست اور ایک جمال پرست کی حیثیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ حسن کی جلوہ سامانیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

10.3.3 جوش، شاعر حسن وعشق:

جوش نے حسن اور عشق کے موضوع پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں جوش کا تجربہ' مشاہدہ' جذبہ' حسن سے فطری لگاؤ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے۔ جوش حسن کو ہر انداز میں ہر رنگ میں دیکھتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی رومانی نظمیں مثلاً' انتظار کے دن'،' یہ کون اٹھا ہے شرماتا'،' اٹھتی جوانی'،' دوپٹے کو مسلے بدن کو چھپائے'،' پیغام بہار'،' امینِ شباب' ، 'اپنی ملکہ سخن سے'، ' شرابِ آغوش'،پرتوِاجسام'،' جنگل میں منگل' ، ' برسی ہوئی آنکھیں' ایسی خوبصورت اور دلآویز رومانی نظمیں ہیں کہ اردو میں ان کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

جوش نے "گنگا کے گھاٹ پر" کے عنوان سے ایک رومانی نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں ایک ایسی لڑکی کی تصویر کشی ہے جو گنگا کے گھاٹ سے نہا کر آرہی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ جوش نے اس نظم میں الفاظ کے جادو سے حسن کی زندہ جاوید تصویر بنادی ہے۔ نظم کے کچھ اشعار ہیں :

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے — نہایا کون چلا آرہا ہے گنگا سے
سرِا دلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے — دبائے دانتوں میں آنچل' بدن چرائے ہوئے
دراز زلف میں جادو' سیاہ آنکھ میں مدھ — نسیمِ صبحِ بنارس ' ہلالِ شامِ اودھ
مری طرف سے کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب — کہ وقتِ صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب
ازل کے دن سے درِ حسن کا بھکاری ہوں — ادھر بھی ایک نظر میں ترا پجاری ہوں

جوش حسن کی دلکشی اور دلآویزی کی تصویر کشی میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ان کی بعض نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حسن کی اداؤں اور رنگینیوں کو ایک ایسے مصور کی طرح پیش کرتے ہیں جو منظر سے زیادہ اپنی فنی مہارت دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی ایک نظم ' کہستان دکن کی عورتیں' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ ابلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں — سنگِ اسود کی چٹانیں ' آدمی کے روپ میں
چال جیسے تند چشمے ' تیوریاں جیسے غزال — عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

یہ جواں چہرے پہ چہروں میں ہے برنائی کا جوش
تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

دید کے قابل ہے ' ان کافر بتوں کا رنگ روپ
کھپ چکی ہے جس میں بارش ڈس چکی ہے جس کو دھوپ

ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی ' الاماں
پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

پروفیسر آل احمد سرور نے جوش کی نظم گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔"جوش کی حسن کاری میں کلام نہیں۔ ان کی تشبیہات جاندار' دلکش اور معنی خیز ہوتی ہیں۔ ان کا تخیل لالہ کار ہے مگر دور رس نہیں۔ انسانیت سے اس قدر گہری محبت اور اس کے روشن مستقبل پر یقینِ محکم نے ان کے کلام میں بڑی آب و تاب پیدا کر دی ہے۔"

جوش کسی بھی موضوع پر نظم کہتے ہیں تو الفاظ و بیان پر اپنی قدرت کا پورا استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات اور نئے الفاظ کے استعمال میں اردو کا کوئی بھی شاعر جوش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

10.4 نظم "کسان" کا متن

(1)

جُھٹپٹے کا نرم رو دریا' شفق کا اضطراب
کھیتیاں' میدان' خاموشی' غروبِ آفتاب

دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ

زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود

وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی' اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلِا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا

خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بام گردوں پر کسی کے روٹھ کے جانے کی شان

دوب کی خوشبو میں' شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل' زمیں پر تتلیاں' سر پر طیور

پارہ پارہ ابر' سرخی' سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں' کھویا ہوا سا آسماں

پتّیاں مخمور' کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

(3)

یہ سماں اور اک قوی انسان' یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا' تہذیب کا پروردگار

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیر بوستان
ناظر گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
وارث اسرارِ فطرت، فاتح امید و بیم
صبح کا فرزند، خورشید زر افشاں کا علم
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسن فطرت کا گواہ
قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
قلب آہن جس کے نقش پا سے ہوتا ہے رقیق
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں بازیاب

لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
جس کی جاں کاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک
ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
خونِ جس کا دوڑتا ہے، نبضِ استقلال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے، ہے عزّ و وقار
سر نگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کی محنت سے بھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کے بازو، کی نزاکت پر صلابت کا مدار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل (3)
کون ہل ؟ ظلمت شکن، قندیل بزم آب و گل
خوشنما شہروں کا بانی، راز فطرت کا سراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام

ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزم جہاں
ناز پرور، لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
محرمِ اسرارِ باراں، واقف طبع نسیم
محنت پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم
ماہ کا دل ،مہر عالمتاب کا نورِ نگاہ
منکشف جس کی فِراست پر مزاجِ صبح و شام
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے ہے جاں پرور گلاب
شعلہ خو، جھونکوں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہ آفتاب
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
کھیت سے پھیرے ہوئے منھ، گھر کی جانب ہے رواں
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خاندانِ تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ
شامِ زیرِ ارض کو، صبحِ درخشاں کا پیاؔم

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چمکاتا ہوا
جس کے چھو جانے سے مثلِ نازنین مہ جبین
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں
پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو الٹ دیتی ہے خاک
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی
جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہیں
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں
ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیّوں پر جمائے ہے نظر
جن میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیر غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیِ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شباب سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا ؟
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منھ اترا ہوا
سیم و زر نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

(4)

ایک دل، اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے!
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے!
تیری نظروں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی او کم بخت! ساری کائنات
ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی؟
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیِ امن و اماں
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
ادعائے پیرویِ دین و ایماں اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو
ہاں، سنبھل جا اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب میں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

10.5 نظم "کسان" کا تجزیہ

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی ایسی ہے جس میں ہندوستان کے شعرا نے مزدوروں اور کسانوں کو بیدار کرنے اور انھیں مضبوط کرنے کا کام کیا ہے تاکہ وہ استحصالی اور سامراجی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔ ترقی پسند تحریک موضوع اور ہیئت دونوں میں تبدیلی کے ساتھ واقع ہوئی کیوں کہ نیا موضوع اپنے ساتھ نیا آہنگ اور اظہار و بیان کا نیا پیمانہ بھی ساتھ لاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے نظم نگاروں نے سماجی زندگی کی کیفیات اور واردات کو نئی ہیئت، نیا اسلوب اور نیا آہنگ دیتے ہوئے ترتیب و توازن کا خاص خیال رکھا اس

تحریک کے اہم شعرا نے نظموں کی تخلیق میں جمالیاتی اقدار کا لحاظ بھی رکھا۔ انھیں شعرا میں سے ایک جوش ملیح آبادی ہیں جنہوں نے اپنی مشہور نظم ''کسان'' مثنوی کی ہیئت میں کہی اور کسانوں کو اپنا موضوع بناتے ہوئے سرمایہ داری کو نشانہ بنایا ہے۔ جوشؔ ایک ایسے شاعر ہیں جن کو فطرت نگاری اور مرقع نگاری پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی نظم کسان کا آغاز فطرت نگاری سے کیا ہے اور نظم کے آغاز میں شام کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ غروب آفتاب کے وقت دریا کا دھیرے دھیرے بہنا اور آسمان میں شفق کا بکھرنا، شام کے وقت دن بھر کی محنت فراغت نصیب ہونا، دریا کے کنارے دھندلے دھندلے چراغوں کا ٹمٹمانا اور پھر آسمان و زمین کی باہمی گفتگو اور غروب آفتاب سے ہونے والا اندھیرا، میدان کی وسعتوں کا سمٹ جانا اور سبزہ کا افسردہ ہو جانا اور ساتھ ہی ایک سناٹے کی صدا کا احساس جو گویا دن کی گرمی کا شکوہ کر رہی ہو۔ ان تمام مناظر کو شاعر نے بڑے ہی دلکش اور پرکشش انداز میں پیش کیا ہے۔

اس کے بعد جوش ملیح آبادی کسان کی محنت و مشقت اور لگن کو بیان کرتے ہیں۔ وہ اس کے کردار اور اہم رول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان ہمیشہ پھولوں، پھلوں اور باغوں کی حفاظت کرتا ہے اور ہر طرف لہراتے ہوئے سبزہ زاروں، پھولوں کی مہک اور رنگینی کو دیکھا جائے تو سوال اٹھتا ہے کہ یہ سب کس کی بدولت ہے؟ یہ کسان ہی ہے جو اندھیروں میں کھیتوں کے بیچ راستہ طے کرتا ہوا چلا جاتا ہے اس وقت کا منظر گویا کسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نرم جان پودوں کو نیند آئی ہوئی ہے۔

ان خوبصورت مناظر کے درمیان میں کسان جیسا مضبوط انسان موجود ہے جو ہماری ترقی کا پیشوا اور تہذیب و تمدن کا رکھوالا ہے۔ وہ کسان طفل باراں، سلطنت کا امیر اور قدرت کے قوانین کا ماہر ہے وہی درحقیقت دنیا کے نظم و نسق کو سنبھالنے والا، گلوں پر نظر رکھنے والا، خوشیوں کا پاسبان، لہلہاتے کھیتوں کی ناز برداری کرنے والا اور فطرت کے راز کو سمجھنے والا اور مایوسی میں امید کی کرن جگانے والا ہے۔ یہ وہی کسان ہے جو بارش کے بھید کو سمجھتا ہے اور ہواؤں کی طبیعت سے بھی واقف ہے۔ یہ کسان صبح کا ہر دل عزیز فرزند ہے۔ یہی کسان مسلسل محنت و مشقت کا پیمانہ ہے۔

اس کے بعد جوشؔ اپنی نظم میں کہتے ہیں کہ کسان خدا کی قدرت اور اس کے حسن کا گواہ ہوتا ہے اور گویا وہ ماہتاب کا دل اور آفتاب کا نور نگاہ ہوتا ہے جس کے دل پر ظلمت و نور کا نظام ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنی عقل و فہم سے صبح و شام کے مزاج کو بخوبی سمجھتا ہے اور اسی کی جوانی کے لہو سے گویا بہار روزگار قائم ہے۔ کسان فراغت کے وقت لبوں پر جو تبسم بکھیرتا ہے اس کا دار و مدار اس کے آنسوؤں پر ہوتا ہے۔ اسی کی محنت کے نتیجے میں عرق شراب یعنی غلہ اور سامان عیش و عشرت دستیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے مگر وہ گلابوں کو جاودانی بخشتا ہے۔

اس کے بعد شاعر کسان کی جانفشانی اور بے پناہ محنت و مشقت کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسان کے نقش پا سے لوہا بھی پگھل جاتا ہے وہ محنت کرتے کرتے گرم جھونکوں اور تیز کرنوں کا دوست و رفیق بن جاتا ہے اور بجلیوں کی انجمن کو اس کے خون سے جلا ملنے لگتی ہے اور اس کے سر پر آفتاب کی ٹوپی ہوتی ہے مگر اس کی محنت کے آگے یہ سب کچھ بھی نہیں۔ اس دوران گویا رگ

خاشاک میں اس کا لہو گردش کرنے لگتا ہے پھر اس کے دل کی آنچ رنگ و بو میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ رات ہوتی ہے تو اس کی نگاہیں آسمان کی جانب ہوتی ہیں اور دن میں اس کی انگلیاں مٹی کی نبض کو دیکھتی ہیں جس کی جانفشانی سے زمین امرت ٹپکاتی ہے اور جس کے دم سے زمین لالہ و گل بن کر اترانے لگتی ہے۔

پھر شاعر کہتا ہے کہ یہی کسان ہے جس کی محنت و مشقت دولت مندوں کے لیے مسرت کا سبب بنتی ہے۔ بادشاہوں کا چہرہ بھی کسان کی محنت سے تابانی کی بھیک مانگتا ہے۔ کسان کا ہی خون ہے جو صبر واستقلال میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے اور یہی خون شہزادیوں کی چال کو بھی بدل دیتا ہے۔ یہ کسان ہی ہے جس کے ماتھے کے پسینے کی چمک سے ہی تاجدار کے تاج میں چمک دمک باقی ہے۔ اگر کسان چاہ جائے تو دنیا کی تمام تخریبی طاقتیں اس کسان کے آگے سرنگوں ہو جائیں گی اور تہذیب کی کمر بھی لچک جائے گی۔

یہ کسان ہی ہے جس کی محنت و مشقت کے نتیجے میں ہمارے جسم میں طاقت باقی رہتی ہے۔ یہ کسان ہی ہے جس کی ہتھیلی پر ظلم و جبر کو برداشت کرنے والے تمدن کا چراغ جلتا ہے۔ یہ کسان ہی ہے جس کے بازو اتنے مضبوط ہیں کہ اس کے بل پر شہریار اکڑتا ہے۔ روزانہ شام کے وقت دھوپ سے جھلسے ہوئے اس کسان کے چہرے پر محنت و مشقت کے نشانات ظاہر ہونے لگتے ہیں اور وہ کھیت سے منھ پھیر کر اپنے گھر کی جانب جانے لگتا ہے۔ وہ اپنے سر پر ٹوکری اور بغل میں پھاوڑا لیے ہوئے تیوری پر بل کے ساتھ جارہا ہے اور اس کے سامنے بیلوں کی مضبوط جوڑی ہے اور اس کے کندھے پر مضبوط ہل ہے۔

پھر شاعر استفہامیہ انداز میں کہتا ہے کہ کون ظلمت کو ختم کرنے والا ہے اور کون آب و گل کی اس بزم یعنی دنیا کی قندیل کو روشن کرنے والا ہے جو گلشن کی سلطنت کا دریچہ کھولتا ہے جو سینۂ گیتی کا دل اور خوبصورت شہروں کا بانی ہے۔ کون فطرت کا پتہ دینے والا ہے جو تیغ جوہر دار کے خاندان کا چشم و چراغ ہے، جس کی دھار پر چمن میں کھلنے والے شگوفوں کا نظام ہے جو شام کو درخشندہ صبح کا پیام دیتا ہے جو مٹی میں روح دوڑاتا ہے جو زمین کے ذروں کی موسیقیت میں چار چاند لگاتا ہے، جس کے چھو جانے کے سبب نازک اندام مہ جبین کی صورت لیلائے زمین کروٹیں لیتی ہے۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ کسان کا ہل ہے اور اس کی بے پناہ محنت و مشقت ہے۔

پھر جوش ملیح آبادی کسان کے ہل کے بارے میں کہتے ہیں کہ کسان کے ہل چلنے سے زمین کے اندر کے سارے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور خاک مسکراتے ہوئے اپنی چادر کو الٹ دیتی ہے۔ اسی کی چمک میں عید کے چاند جیسی روشنی نمایاں ہوتی ہے جو خاک کے مایوس کن مطلع پر امید کی کرن بکھیرتا ہے اور اس کے لوہے سے زمین سونا اگلنے لگتی ہے اور شفق کی سرخیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ کسان سر کو جھکائے ہوئے اپنے گھر کی جانب رواں ہے اور وہ ان سیاسی رتھ کے پہیوں پر نظر جمائے ہوئے ہے جن میں کھیتوں کو روند کر تیزی آجاتی ہے۔

کسان کی محنت و مشقت کا ذکر کرنے کے بعد شاعر اس کی حالت زار کو یوں بیان کرتا ہے کہ ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اپنے جگر پر تیر کھائے ہوئے اپنی دولت کو دشمن ملک کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کی راہ کبھی حرماں نصیبی سے کٹتی ہی نہیں بلکہ اس کی نگاہ اپنے فاقہ کش بچوں کے بجھے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے بار بار وہ خونچکاں منظر پھرنے لگتا ہے جو گھر کی ناامیدی

اور اس کے غمناک شباب کی شکل میں پنہاں ہے وہ یہ سوچتے ہوئے جا رہا ہے کہ کن آنکھوں سے اپنی بیوی کا بے ردا سر اور بچوں کا اترا ہوا منھ دیکھے گا۔ سال بھر دن رات پسینہ بہانے کے بعد بھی کسان کے گھر میں نہ مال و دولت ہے نہ نان و نمک اور نہ ہی دانہ پانی ہے اگر کچھ ہے تو وہ صرف ایک خاموش ماتم ہے۔

جوش ملیح آبادی اپنی اس نظم کے آخری حصہ میں سرمایہ داری کو نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسان کی اس ابتر حالت اور اس پر غموں کے ہجوم کا ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ ظالم و سنگ دل سرمایہ داری ہے۔ پھر وہ للکارتے ہوئے کہتے ہیں اے سرمایہ داری تیری نظروں میں سنگ دلی کے وہ شرارے تیر رہے ہیں جن کے آگے چنگیزی خنجر کی دھار بھی مڑ جاتی ہے۔ اے سرمایہ داری تیرے ہاتھ بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں پھر بھی تو ساری کائنات کو چبانا چاہتی ہے۔ آخر ظلم و ستم کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ ذرا نگاہ تو کر تیرے جبڑوں میں غریب انسانوں کی بوٹیاں نظر آتی ہیں۔ اے امن و اماں کی دعویداری سرمایہ داری! تیرے ظلم و ستم دیکھ کر بھیڑیے بھی دانتوں تلے انگلی دباتے نظر آتے ہیں۔ اے دین و ایمان کی دعویداری کرنے والی سرمایہ داری! ذرا اپنی کہنیوں کی طرف نگاہ کر کے دیکھ تو سہی کہ تیری کہنیوں سے مظلوموں کا لہو ٹپکتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اب تیری بھلائی اسی میں ہے کہ تو سنبھل جا کیوں کہ لوگوں کے دل تیرے لیے بغاوت سے بھرے ہوئے ہیں اور نہ جانے کتنے طوفاں تیری اس کشتی کو غرق آب کرنے کے لیے بے چین ہیں۔

10.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- جوش کے والد نواب بشیر احمد خاں شاعر تھے اور بشیرؔ ان کا تخلص تھا۔
- جوش 5 دسمبر 1898ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔
- ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے سیتاپور گئے اور فرینچ اسکول میں داخلہ لیا۔
- نو برس کی عمر میں جوش نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔
- آٹھ سال تک عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں بطور مترجم کام کیا۔
- تقسیم ہند کے بعد جوش پاکستان چلے گئے اور 22 فروری 1982ء میں ان کا اسلام آباد میں انتقال ہوا۔
- جوش انقلابی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔
- جنگ آزادی کی جدوجہد میں جوش سے زیادہ کسی نے فکر انگیز اور شعلہ بار نظمیں نہیں کہیں۔
- جوش کا دوسرا پسندیدہ موضوع فطرت نگاری تھا۔
- جوش کسی بھی موضوع پر نظم کہتے ہیں تو الفاظ و بیان پر اپنی قدرت کا پورا استعمال کرتے ہیں۔
- نظم "کسان" جوش کی ایک طویل نظم ہے جس میں جوش نے کسان کی محنت اور جدوجہد کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ کسان ہمیں 'تاجدارِ خاک'، 'ارتقا کا پیشوا'، 'تہذیب کا پروردگار' اور اس دنیا کو چلانے والا نظر آتا ہے۔

- عام آدمی کی نظر میں کسان ایک جاہل انسان ہے جس کا کام صرف دوسروں کے لیے خون پسینہ بہانا ہے جس کی محنت کے بل پر بڑے بڑے محل تعمیر ہوتے ہیں' جس کا پسینہ دولت مندوں کے لیے عیش و عشرت کا سامان تیار کرتا ہے۔ جوش کہتے ہیں کسان کے ماتھے کا پسینہ قابل احترام ہے' کیوں کہ بادشاہ اور دولت مند لوگ عزت اور وقار حاصل کرنے کے لیے اس سے بھیک مانگتے ہیں۔
- جوش نے اپنی نظم "کسان" میں کسانوں کو استحصالی اور سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا پیغام دیا ہے۔
- جوش نے اپنی نظم کسان کا آغاز فطرت نگاری سے کیا ہے اور نظم کے آغاز میں شام کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔
- اس نظم میں کسانوں کی محنت اور لگن کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ باغ، پھل، پھولوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
- جوش ملیح آبادی اپنی اس نظم کے آخری حصہ میں سرمایہ داری کو نشانہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسان کی ایسی حالت اور اس پر غموں کے ہجوم کا ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ یہ ظالم وسنگ دل سرمایہ داری ہے۔

10.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
سما	:	آسمان
افسردہ	:	مرجھایا ہوا، اداس، غمگین
قطع کرنا	:	کاٹنا، تراشنا
خاروخس	:	کانٹے اور گھاس پھوس
دوب	:	نرم اور عمدہ گھاس
آئین	:	قانون
ناظم	:	انتظام کرنے والا
قلب آہن	:	لوہے کا دل، مضبوط دل
رقیق	:	پتلا، نرم، ملائم
خاشاک	:	کوڑا کرکٹ
کلاہ آفتاب	:	سورج کی پگڑی
جاں کاہی	:	سخت محنت
تابانی	:	روشنی، چمک

تاک	:	انگور کی بیل، ٹکٹکی، گھات لگانا
عزو وقار	:	عزت و مرتبہ
سرنگوں	:	سر کے بل۔ اوندھا، شرمندہ
صلابت	:	مضبوطی، سختی
مضمحل	:	کمزور، دبلا، پتلا، رنجیدہ
حرماں	:	ناامیدی، مایوسی بدقسمتی
خوں چکاں	:	خون ٹپکتا ہوا
شرار	:	چنگاری
غلطاں	:	ڈوبا ہوا، لڑھکتا ہوا، گرتا پڑتا
گرگ	:	بھیڑیا

10.8 نمونہ امتحانی سوالات

10.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. جوش کے والد کا نام کیا تھا؟
2. جوش کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟
3. جوش کی وفات کس سنہ میں ہوئی؟
4. عثمانیہ یونیورسٹی میں جوش کس شعبہ سے وابستہ تھے؟
5. "یادوں کی برات" کے مصنف کا نام بتائیے۔
6. کس سنہ میں جوش نے پاکستان ہجرت کی؟
7. اس اکائی میں شامل جوش کی نظم کا عنوان کیا ہے؟
8. گرگ کسے کہتے ہیں؟
9. "شاعر آخر الزماں، جوش ملیح آبادی" کس کی تصنیف ہے؟
10. جوش نے کس عمر میں شاعری شروع کی؟

10.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. جوش ایک شاعر فطرت ہیں، مختصر نوٹ لکھیے۔

2. جوش کی منظر نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3. حسن و عشق کے حوالے سے جوش کی شاعری کا جائزہ لیجیے۔

4. جوش کے قیام حیدر آباد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

5. جوش کو شاعر انقلاب کیوں کہا جاتا ہے؟ بیان کیجیے۔

10.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. جوش ملیح آبادی کے حالات زندگی پر مفصل نوٹ لکھیے۔

2. جوش کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3. نظم "کسان" کا خلاصہ پیش کیجیے۔

10.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی
2. شاعر آخر الزماں، جوش ملیح آبادی	ڈاکٹر فضل امام
3. جوش کی شاعری کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر عقیل احمد
4. جوش نمبر ماہ نامہ ساقی	کراچی
5. جوش ملیح آبادی، تنقیدی جائزہ	(مرتب) خلیق انجم

اکائی 11: اختر شیرانی کی نظم نگاری: اے عشق کہیں لے چل

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی
11.2.1 شخصیت
11.3 اختر شیرانی کی نظم نگاری
11.3.1 مذہبی اور اخلاقی نظمیں
11.3.2 تاریخی، سماجی اور اصلاحی نظمیں
11.3.3 قومی و سیاسی نظمیں
11.3.4 بچوں اور عورتوں کے لیے نظمیں
11.4 اختر شیرانی کی نظموں کا فنی جائزہ
11.4.1 اختر شیرانی کی جمالیات پرستی
11.4.2 اختر شیرانی کی فطرت پرستی
11.4.3 اختر شیرانی کی نظموں کی لفظیات
11.4.4 اختر شیرانی کی نظموں کی ہیئت
11.4.5 ماہیا
11.4.6 گیت
11.5 نظم "اے عشق کہیں لے چل" کا متن
11.6 نظم "اے عشق کہیں لے چل" کا تجزیہ
11.7 اکتسابی نتائج
11.8 کلیدی الفاظ

11.9 نمونہ امتحانی سوالات
11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

شاعری کی مختلف اصناف میں نظم نگاری کو ایک اہم صنف کا درجہ حاصل ہے۔ اس صنف پر مختلف تحریکات کے اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا حالیؔ کے دور میں اردو نظم پر نیچرل شاعری کا اثر رہا۔ جس کے بعد ترقی پسند تحریک نے نظم کو متاثر کیا۔ اردو نظم کو فروغ دینے والے ایسے شاعروں کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جنھوں نے شاعری کی نمائندگی کرتے ہوئے نظم نگاری میں رومانویت اور جمالیات کو شامل کیا۔ اردو کی رومانوی تحریک سے وابستہ شاعروں میں اختر شیرانی کا شمار ہوتا ہے۔ یہ اردو کے نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے جنہوں نے اردو نظم نگاری میں بہ حیثیت رومانوی شاعر اختر شیرانی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ ان کی شاعری رومانویت اور حسن و جمال پرستی کی مظہر ہے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے بے باکی کے ساتھ اپنی محبوباؤں کے نام سے نظمیں لکھیں۔ رومانوی جذبات کی عکاسی میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ نظم نگاری کو مختلف بند اور ہیئتوں سے وابستہ کر کے اختر شیرانی نے نظم میں گیت کا حسن پیدا کیا ہے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اختر شیرانی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت سے واقف ہو سکیں۔
- اختر شیرانی کی غزل گوئی کے بارے میں جان سکیں۔
- اختر شیرانی کی نظم نگاری کے موضوعات کو بیان کر سکیں۔
- اختر شیرانی کی نظموں کا فنی جائزہ پیش کر سکیں۔
- نظم "اے عشق کہیں لے چل" کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم "اے عشق کہیں لے چل" کا تجزیہ کر سکیں۔

11.2 اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی

اختر شیرانی کا پورا نام محمد داؤد خاں تھا۔ ان کے والد حافظ محمود شیرانی اردو کے صاحب طرز ادیب اور ماہرِ لسانیات تھے۔ ان کا

خاندان پٹھانوں کے مشہور قبیلے شیرانی سے تعلق رکھتا تھا۔ سرحدی پٹھانوں کا یہ قبیلہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے متصل جنوبی وزیرستان میں آباد تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے والد ریاست ٹونک کے ملازم تھے۔ اختر شیرانی 4 مئی 1905 کو ٹونگرہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے جو ریاست ٹونک کا ایک حصہ تھا۔ محمد داؤد خاں شیرانی کی پیدائش کے وقت حافظ محمود شیرانی انگلستان میں تھے۔ ان کی پرورش داستانوی انداز میں شہزادوں جیسی ہوئی۔ کم عمری میں شاعری کی طرف راغب ہوگئے۔ ابتدائی تعلیم قرآنِ شریف کی تلاوت سے گھر پر شروع کی۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں صابر علی شاکرؔ سے کلام پر اصلاح لی۔ لڑکپن سے ہی وہ عاشق مزاج اور حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ جس کا مکمل اظہار ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزری۔ 1921ء میں اپنے والد کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔ اختر شیرانی نے لاہور آنے کے بعد 1921ء میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اسی سال منشی فاضل کا امتحان اچھے نمبروں سے کامیاب کیا۔ اگلے سال اسی کالج سے ادیب فاضل میں کامیابی حاصل کی۔ بعد میں میٹرک بھی کرلیا۔ کوئی اعلیٰ سند نہ ہونے کے باوجود انھیں انگریزی ادب میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ اردو کے رومانوی شاعروں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ ساری زندگی مے نوشی رومانی اور جمالیاتی خیالات کی پیش کشی کے لیے وقف کردی۔ ان کی شاعری رومانوی احساسات کی نمائندہ ہے۔ ان کی نظموں میں فریفتگی کا نرالا انداز اور وارفتگی کا حسین طرز دکھائی دیتا ہے۔ ان کے آٹھ شعری مجموعے اور خطوط کا ایک مجموعہ یادگار ہیں۔ ان کے شاعری کے مجموعے: (1) شعرستان (2) صبح بہار (3) نغمۂ حرم (4) طیور آوارہ (5) اخترستان (6) شہزور (7) لالۂ آوارہ (8) شہناز کے نام شائع ہوچکے ہیں۔ رومانوی شاعری کے چراغ جلا کر اختر شیرانی نے 1948ء میں بمقام لاہور اس دار فانی سے کوچ کیا۔

11.2.1 شخصیت :

حافظ محمود شیرانی کے گھر میں پیدا ہونے والے اختر شیرانی کی پرورش شاہانہ انداز میں ہوئی۔ پیدائش سے لے کر سات سال کی عمر تک ان کے والد انگلستان کے دورے پر رہے۔ ابتدائی تعلیم مذہبی انداز سے ہوئی۔ حافظ محمود شیرانی جب ہندوستان لوٹے تو پہلی جنگ عظیم کی شروعات ہوچکی تھی۔ محمود شیرانی نے وطن ٹونک لاہور منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اختر شیرانی اپنے والد کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔ انھیں لاہور سے بے انتہا محبت رہی۔ گھریلو ماحول میں مذہبی پابندیوں نے انھیں مجبور رکھا اور جب باہر کی دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھا تو آزادانہ روش نے متوجہ کیا۔ بچپن ہی سے رومان پرست واقع ہوئے تھے۔ آزادانہ ماحول میں مے نوشی کو شغل بنالیا۔ کئی خواتین سے اپنی ذات کو وابستہ کیا۔ سلمیٰ سے محبت میں ناکامی کے بعد اختر شیرانی نے کئی عشق کیے۔ سب میں ناکام رہے۔ ان کی شخصیت میں چھپا ہوا حسن کار شاعری کے اندر نمودار ہونے لگا۔ سلمیٰ سے پہلے عشق کی یاد ان کی شاعری میں جگہ جگہ اثر دکھاتی ہے۔

عورت کے حسن اور اس کی جمالیات کا بیان اختر شیرانی کی کمزوری ہے۔ وہ سلمیٰ کے حوالے سے نسوانی حسن میں ڈوب کر جو جوہر دکھائے ہیں' وہ ملاحظہ ہو:

تم چاند سے بڑھ کر روشن ہو' زہرہ کی قسم تاروں کی قسم
تم پھول سے بڑھ کر رنگیں ہو' فطرت کے چمن زاروں کی قسم

تم سب سے حسیں ہو دنیا کی ' دنیا کے حسیں نظاروں کی قسم
دنیا سے نفرت کرتا ہوں ' میں تم سے محبت کرتا ہوں

جمالیات میں خاص طور پر عورت کے حسن کی تعریف اور بے باکانہ طور پر خواتین کا نام لے کر عشق کا اظہار اختر شیرانی کا وصف ہے۔ بے شمار خواتین سے اپنے جذباتی اظہار کو نمایاں کرتے ہوئے اختر شیرانی نے " عذرا " کے حسن کو اس طرح پیکر میں ڈھالا ہے:

بہار و خواب کی تنویر مرمریں عذرا — شراب و شعر کی تفسیر دل نشیں عذرا
دل و دماغ کو سرشار کردیا تو نے — شباب و عشق کو بیدار کردیا تو نے
میری حسیں ' مری ناز آفریں عذرا

اختر شیرانی کی شخصیت میں افلاطونی عشق اور جنسی محبت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہر عورت کو ٹوٹ کر چاہنے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو اختر شیرانی نے عشق کی سرمستی سے وابستہ رکھا۔ ان کی شاعری پر شخصیت کا پرتو اس قدر ہے کہ وہ اپنی تمام تر شاعری کو حسنِ نسوانی ' حسن کی تحسین ' ماورائیت ' جوشِ عشق ' دنیا سے بیزاری اور خیالی بہشتوں کی تعمیر کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری پر جمالیات پرست شخصیت کا غلبہ رہا۔ ان کی شاعری میں جمال پرست فنکار اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر شاعری کو زندگی کی عکاسی بنا دیتا ہے۔

11.3 اختر شیرانی کی نظم نگاری

اردو کے جمالیات پرست شاعر کی حیثیت سے اختر شیرانی نے نظم نگاری کو کوئی نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کی نظم نگاری روایتی انداز کی نشاندہی کرتی ہے اور پابند نظم کے ذریعے انھوں نے شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ حسن و عشق کی بھرپور تصویر کشی کے علاوہ اختر شیرانی کی نظموں میں تاریخی ' سماجی ' اصلاحی اور اخلاقی نظموں کی کمی نہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے پسماندہ اور مظلوم طبقات سے ہمدردی اور مزدور پیشہ سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی سیاسی اور قومی نظموں میں سرمایہ دار طبقے کی مخالفت اور مجاہدین کے سرفروشانہ کارناموں کی حمایت نمایاں ہے۔ مناظر قدرت کی نمائندگی اور عورتوں اور بچوں کی حمایت میں ان کی نظم نگاری اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ بچوں کی نظموں کا مجموعہ " پھولوں کے گیت " لاہور سے 1936ء میں شائع ہوا۔ عورتوں اور بچوں کے لیے نظموں پر مشتمل مجموعہ " نغمۂ حرم " مکتبہ اردو لاہور سے 1939ء میں شائع ہوا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر شیرانی کی نظمیں ہر موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔

11.3.1 مذہبی اور اخلاقی نظمیں:

اختر شیرانی کی کلیات میں مذہبی اور اخلاقی نظموں کی کمی نہیں۔ چند مذہبی اور اخلاقی نظموں سے منتخب اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

الٰہی مجھ کو ایسی نالہ سامانی عطا کردے — جو بزمِ دہر میں ہنگامۂ محشر بپا کردے
اگر تیرے سوا بھی مدعا ہوسکتا ہے کوئی — تو میرے دل کو یکسر بے نیاز مدعا کردے

سوادِ عالمِ حسرت میں ہوں گمراہ مدت سے | مرے پائے طلب کو اب تو منزل آشنا کر دے

اس مناجات سے اختر شیرانی کے مذہبی میلان کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اختر شیرانی کے آخری دور کی شاعری میں مذہبی، اخلاقی اور سماجی عناصر زیادہ نظر آتے ہیں۔ زندگی کی ہزار تلخیوں کے نچوڑ کے ساتھ اپنی بے عملی کا اعتراف کرتے ہوئے اختر شیرانی لکھتے ہیں:

مسندِ عیش سے اٹھ، منزل پُرخار میں آ | بزم جم کو چھوڑ کے بزمِ رسن و دار میں آ
عشرتِ کوہ کنی سے نہیں واقف پرویز | کہہ دو یہ لطف اگر چاہے تو کہسار میں آ
تابکے بندگیِ ساغر و مینا اختر | اب کے اللہ کے بندے صفِ احرار میں آ

نصرتِ خداوندی پر اختر شیرانی کا کامل یقین بھی ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگرچہ راہ کٹھن ہے قدم بڑھائے چل | خدا کے آسرے سے آس تو لگائے چل
نہ ہار حوصلہ منزل بھی آنے والی ہے | نہ رو، نہ رو کہ خوشی مسکرانے والی ہے

اختر شیرانی کی مذہبی شاعری میں نعت کا تقدس بھی ملتا ہے۔ وہ نعت کے ذریعے جس عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، اس کا اندازہ ملاحظہ ہو:

دنیائے ہست و بود کی زینت تمہیں سے ہے | اس باغ کی بہار کے ساماں تمہیں تو ہو
روشن ہے جس کی ضو سے شبستانِ زندگی | وہ ماہِ نیم، ماہ شبستاں تمہیں تو ہو
دنیا کی آرزوئیں، فنا آشنا ہیں سب | جو روحِ زندگی ہے، وہ ارماں تمہیں تو ہو
صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے جس کا نور | وہ جلوہِ زارِ حسنِ درخشاں تمہیں تو ہو
شادابیٔ صنوبر و نسریں تمہیں سے ہے | بوئے گل و بہارِ گلستاں تمہیں تو ہو
اخترؔ کو بے نوائیِ دنیا کی فکر کیا | ساماں طرازِ بے سرو ساماں تمہیں تو ہو

مذہبی منظومات کے علاوہ انھوں نے اخلاقی اقدار کو بھی نظموں میں پیش کیا ہے۔ وہ دنیا میں اخلاق، مروت، خلوص، محبت اور انسانیت جیسے اعلیٰ اقدار کی حکمرانی چاہتے ہیں۔ وہ انسانیت دوست ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی پامالی پر وہ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی نظم کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ساز دہر سے جاری حرص کے ترانے ہیں | فسق کے فسانے ہیں
مٹ گیا ہے ہستی سے ذوقِ پاک دامانی | نقشِ کیف روحانی

انسان کی حیوانیت سے حیاتِ انسانی کی پامالی کا نقشہ بھی ان کی نظموں میں نمایاں ہوتا ہے ایک نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

تمنائیں تڑپتی ہیں، جہاں معصوم روحوں کی | مرادیں تلملاتی ہیں جہاں مغموم روحوں کی
جہاں ہر سمت آفت ہے، مصیبت ہے اذیت ہے | یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

جہاں کا ذرہ ذرہ ، درسِ خونخواری سکھاتا ہے   جہاں حیراں ہے یزداں اور شیطاں مسکراتا ہے
جہاں حیوانیت ہر وقت مسرورِ بغاوت ہے   یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

اختر شیرانی کی نظموں کے موضوعات کافی وسیع ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی موضوعات کے ساتھ ساتھ وہ تاریخی ، سماجی اور اصلاحی موضوعات پر بھی نظمیں پیش کرتے ہیں۔

11.3.2 تاریخی، سماجی اور اصلاحی نظمیں:

اختر شیرانی نے مے نوشی کے ذریعے اپنی زندگی کو بے اعتدالی کی ڈگر پر ڈال تو دیا لیکن ان کی شاعری میں جدید فیشن ، رقص و سرود کی محفلوں اور عریانیت کے خلاف صدائے احتجاج ضرور بلند ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے تاریخی اور سماجی ورثے پر وہ فخر کرتے اور سماج میں اصلاح کے خواہاں ہیں۔ ان کے تاریخی ، سماجی اور اصلاحی شعور کی نمائندہ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:

کفر ہے بر سر پر خاش پھر ایمانوں سے   اے صبا کہنا ! علی گڑھ کے غزل خوانوں سے
کہہ دو دنیائے سیاست کے صنم خانوں سے   چھیڑ اچھی نہیں اللہ کے دیوانوں سے
چھین لو شمع ستاروں کے شبستانوں سے   اور گزر جاؤ مہ و مہر کے ایوانوں سے
دور ہے منزلِ سلمائے حیاتِ جاوید   اور گزرنا ہے تمہیں موت کے ویرانوں سے
عمل و علم سے قائم ہے نظامِ اسلام   یہ نہ ترکوں سے ، نہ عربوں سے افغانوں سے

اختر شیرانی کی شاعری میں اسلام کے ماضی کی تاریخ کے دھندلکے روشن ہوتے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حریت پسند شاعر ہیں۔ اسلامی تاریخ کے صفحات الٹتے ہوئے اختر شیرانی نے معاشرے کے بدنما داغ کو بھی دھونے کی کوشش کی ہے۔ وہ امیر و غریب کے فرق کو مٹانے کے علمبردار ہیں۔ وہ مزدور ، کسان اور محنت کش کے بڑے حامی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا کا ہر آرام امیروں کے لیے ہے   پھر کون سی شے ہے جو فقیروں کے لیے ہے
بدبخت مریدوں پہ بھی یا رب نگہِ لطف   مانا کہ جو نعمت ہے وہ پیروں کے لیے ہے
ایک سیٹھ نے گندم کی یہ تعریف نئی کی   کھانے کے لیے کب ہے ذخیروں کے لیے ہے

حیات انسانی کو سنوارنے میں مزدور ، محنت کش اور کسان کے حصے کو قبول کرتے ہوئے اختر شیرانی نے اپنی نظم ''کسان'' میں کسانوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مادیت کے عروج اور روحانیت کے زوال سے اعلیٰ انسانی اوصاف کی پامالی پر افسوس بھی اختر شیرانی کی نظموں میں موجود ہے۔ وہ روزمرہ زندگی ، دفاتر ، بازاروں ، عبادت گاہوں اور درس گاہوں میں جس کمی کو محسوس کرتے ہیں ، ان کا ذکر ملاحظہ ہو:

خلوص و اعتقاد و حسنِ نیت جس کو کہتے ہیں   بسنتی لال میں باقی ، نہ شبراتی میں باقی ہے
بتاتی ہے یہ کثرت ہوٹلوں کی آج شہروں میں   کہ مہمانی کا جذبہ صرف دیہاتی میں باقی ہے

حق ہمسایہ کا پاس اگلے وقتوں کا جو زیور تھا　　　　نہ اب بدھ سنگھ میں ہے نے جمعراتی میں باقی ہے

اس نظم میں اختر شیرانی کے اصلاحی جذبے کی نمائندگی ہوتی ہے اور یہ بات واضح ہورہی ہے کہ مادیت کے عروج سے کس طرح روحانی جذبے پس پشت ڈالے جارہے ہیں۔

11.3.3 قومی وسیاسی نظمیں:

وہ جہاں مذہبی اور اخلاقی موضوعات کا اپنی شاعری میں احاطہ کرتے ہیں ' وہیں تاریخی ' سماجی اور اصلاحی موضوعات کے ساتھ قومی اور سیاسی موضوعات کی جھلک بھی ان کی شاعری میں جگہ بنالیتی ہے۔ قومی نظریے اور ملکی سیاست پر ان کی نظموں سے چند اقتباسات پیش ہیں۔ نظم " آزادی " کا یہ بند دیکھیے:

پکارتی ہے ہمالہ کی رفعتِ آزاد　　　　کہ ہے ستاروں کا ہمسر مقامِ آزادی
چلی نسیم ' اٹھیں نکہتیں ' اڑے طائر　　　　چمن میں دیکھے کوئی اہتمامِ آزادی
سبق یہ ملتا ہے دریاؤں کی روانی سے　　　　جہاں میں کوئی نہ ہو تشنہ کام آزادی

اختر شیرانی کی قومی نظموں میں جہاں آزادی اور آزادی کے لیے جانبازی کا جذبہ نظر آتا ہے وہیں فوجی سپاہیوں کی دلیری اور حوصلہ مندی کی ستائش بھی موجود ہے۔

اختر شیرانی نے جنگ کے موضوع پر کئی نظمیں لکھیں ہیں " ایک جنگی ترانہ " ۔ " وطن کے شہیدانِ جنگ " ۔ "موسم بہار "، " نعم البدل " اور "دلیرانِ وطن کے نام " جیسی نظمیں اختر شیرانی کی دلی آرزو کی نمائندہ ہیں۔ حبِ وطن کا جذبہ ان کی شاعری میں حصول لذت دکھاتا ہے۔

اختر شیرانی کے کلام میں قومی وسیاسی نظموں کی کمی نہیں جس میں ان کی وطنی جذبے کی نمائندگی ہوتی ہے اور وہ اپنی نظموں کے ذریعے ملک وقوم میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں کے مخاطب کسان ' مزدور ' سپاہی اور محنت کش ہی نہیں بلکہ ملک کے تمام انسان ہیں۔

11.3.4 بچوں اور عورتوں کے لیے نظمیں:

اختر شیرانی نے اپنی شاعری میں ہمہ جہت موضوعات کا احاطہ کیا۔ انھوں نے بچوں اور خواتین کے لیے بھی نظمیں تحریر کیں۔ ان کی نظمیں "شریر لڑکا " " قانون کی عزت " اور " اس سے کہہ دوں گا " بچوں کے لیے بڑی سبق آموز ہیں جن میں مناظر فطرت کی عکاسی کے علاوہ بچوں کی فطرت کی موثر نمائندگی بھی دکھائی دیتی ہے۔

ان کے شعری مجموعہ " نغمۂ حرم " میں بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی نظمیں موجود ہیں ایسی نظموں میں "ایک لڑکی کا گیت " "باغوں کی بہاریں " اور " پھول کے گیت " شامل ہیں۔ بچوں کے گیت میں اختر شیرانی موسم بہار کی رنگینیوں اور اس کی مست کر دینے والی فضاؤں کے علاوہ جھولے کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک لڑکی کی آرزو کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

جہاں اونچے پہاڑوں پر گھٹائیں گھر کے آتی ہوں　　　　ہوا کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہوں

وہاں میں ہوں، مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

انھوں نے خواتین کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ نظم "بلاوا" میں نسوانی جذبات کی عکاسی صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔"طیور آوارہ" میں شامل ان کے گیت "پی کی یاد میں" عورت کی بے قراریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

انھیں جی سے میں کیسے بھلادوں سکھی، مرے جی کو جو آکے لبھا ہی گئے

مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے، مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے

اختر شیرانی کی نظموں میں دکھ سکھ کی نمائندگی اور خواتین کے جذبات اور احساسات کی خوبصورت پیش کشی موجود ہے۔

11.4 اختر شیرانی کی نظموں کا فنی جائزہ

اختر شیرانی ایک باشعور نظم نگار ہیں۔ انھوں نے شوقیہ یادل کے بہلانے کے لیے نظم نگاری کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ اپنے شوق و ذوق سے نظم کا انتخاب کیا۔ ان کے یہاں موضوعاتی نظموں کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ انہوں نے گیت، سانیٹ اور ماہیے بھی لکھے۔ نظم کی تکنیک اور اس کے انداز بیان میں اختر شیرانی نے کئی تجربے کیے جو نہ صرف کامیاب بلکہ اردو دنیا کے لیے قابل قبول رہے۔ اختر شیرانی کی نظمیں جمالیات پرستی اور فطرت پرستی کی مظہر ہیں۔ لفظوں کی سادگی اور سلاست نے ترنم پیدا کر دیا ہے صنائع و بدائع کی تلاش ان کی نظموں میں سعی حاصل ہے۔

11.4.1 اختر شیرانی کی جمالیات پرستی:

اختر شیرانی کے عہد میں ترقی پسند تحریک کو عروج حاصل ہو چکا تھا اور حقیقت پسندی کا رجحان پروان چڑھنے لگا تھا۔ اردو کے بیشتر شعرا نے ادب برائے زندگی اور حقیقت پسندی کو شعری وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اختر شیرانی بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے لیکن انھوں نے ترقی پسندی اور حقیقت پرستی کے بجائے جمالیات پرستی، رومانیت اور حسن آفرینی کو اپنی نظموں میں شامل کیا۔ وہ اپنی ہر نظم کو حسن اور وارفتگی کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ اختر شیرانی کی جمالیات پرستی میں ناکامی اور نامرادی کا کوئی دخل نہیں۔ وہ جس چیز کو چاہتے ہیں۔ اسے ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ حسن و جمال اور وارفتگی کے ساتھ والہانہ پن کو شاعری میں جگہ دے کر حسن پیدا کرنا اختر شیرانی کی شاعری کا کمال ہے۔ انھوں نے ہر چیز میں پوشیدہ حسن کو نمایاں کرنے کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری میں جمالیات پرستی ہر منظر کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

"بنگال کی ایک شام" کی رعنائی کو اختر شیرانی نے جس حسن کاری اور جمالیاتی خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ اس کا انداز ملاحظہ ہو:

گنگناتی ہوئی، ہنستی ہوئی اٹھلاتی ہوئی　　　　شامِ بنگال اٹھی، زلفوں کو لہراتی ہوئی

چشم میگوں میں لیے خواب زلیخا کا ہجوم　　　چاک دامانیٔ یوسف کی قسم کھاتی ہوئی
بھر کے دامن میں حسینوں کا مہکتا ہوا نور　　　قصۂ طور کو ہر گام پہ دہراتی ہوئی
سارے خم بھول کے اک عالم سرمستی میں　　　قہقہہ بن کے ہر ایک ہونٹ پہ لہراتی ہوئی

موسم بہار کی فطرت کی سرگرمیوں کو اختر شیرانی نے وجد آفرینی اور مستی آفرین انداز میں نظم کیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تب وادی کی کمسن کلیوں تک، زہرہ کی شعاعیں آتی ہیں　　　اوران کے رنگ و بو کے رسیلے پردوں میں بس جاتی ہیں
اور شبنم بوسے لیتی ہے، مستی کی بہاریں چھاتی ہیں　　　اورماہ و شانِ کاہ کشاں، گل ہائے طلا برساتی ہیں
جس وقت یہ سب رنگینیاں، اس وادی میں یکجا ہوتی ہیں　　　تب کلیوں کے رنگیں پہلو سے کچھ حوریں پیدا ہوتی ہیں

جنگل کے ایک سنسان منظر کے حسن کو بیان کرنے کے لیے اختر شیرانی نے خیال کو جس وجد اور کیف آفریں فضا میں پہنچا دیا ہے، اس کی دلکشی کا جمالیاتی انداز ملاحظہ ہو:

فرشِ زمردیں پر کچھ پھول سو رہے ہیں　　　نغمے کے پر کی جنبش، جن کو جگا رہی ہے
جنگل مہک رہا ہے، کلیاں چٹک رہی ہیں　　　ہر تان میں الہیٰ، کیا گل کھلا رہی ہے
وادی میں موجزن ہے، نغموں کا کیف لرزاں　　　ہر پھول، ہر کلی پر، مستی سی چھا رہی ہے
اک نہر بہ رہی ہے، تھوڑے سے فاصلے پر　　　گاتی ہوئی جو اپنی، منزل کو جاری ہے
یا جل پری روپہلی، موجوں کے بربطوں پر　　　تاروں کے دیوتا کو، نغمے سنا رہی ہے
وہ دیکھو کوئی جوگن، جنگل میں گا رہی ہے

11.4.2 اختر شیرانی کی فطرت پرستی:

مناظر قدرت پر بھی ان کی بے شمار نظمیں ان کی فطرت پرستی کی مظہر ہیں۔ برکھارت، جشن بہار، آمد بہار، نغمہ بہار، ابر سے، ترانہ بہار، طلوع بہار، ماتم بہار اور فروغ سحر ایسی نظمیں ہیں جن سے ان کی فطرت پرستی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے:

پھرتی ہیں آوارہ و متوالی گھٹائیں اس طرح
اور ہوائیں اس طرح
جھومتا پھرتا ہو جیسے میگساروں کا ہجوم
بادہ خواروں کا ہجوم
یہ گھٹائیں ہیں کہ خوابوں کے سفینے ہیں رواں
بے قرینے ہیں رواں

بادبانوں میں چھپائے چشمہ ساروں کا ہجوم
جوئباروں کا ہجوم
یوں نظر آتے ہیں کوہسارِ مسوری دور سے
مست سے مخمور سے
جوں سمندر سے جزیروں کے قطاروں کا ہجوم
سبزہ زاروں کا ہجوم

فطرت کی مشاطگی کو مزید دلفریب بنانے میں اختر شیرانی کی تشبیہات اور استعارے اپنی حسن آفرینی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی نظم "وادیٔ گنگا" میں شامل فطرت پرستی کا نکھار ملاحظہ ہو:

یہ تارے ہیں یا نور کے پیمانے ہیں روشن
معصوم پری زادوں کے کاشانے ہیں روشن
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں روشن
یا دامنِ افلاک میں بے باک شرارے
مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے کنارے

نظم " او دیس سے آنے والے بتا" کے اکثر بند میں اختر شیرانی نے فطری منظر کشی کو نمایاں کیا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ حسن پرستی اور فطرت پرستی کا انوکھا انداز اختر شیرانی کی نظموں میں امڈ پڑتا ہے۔ وہ ہر شے میں موجود حسن کو شعری سلیقے کے ساتھ نمایاں کرنے میں بڑا کمال رکھتے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز کی منظر کشی کے لیے اپنے کلام میں الفاظ کا ایسا نادر ذخیرہ رکھتے ہیں کہ جس کے ذریعے قوت بیان کے تمام وسائل ان کی شاعری میں اپنے جوہر دکھانے لگتے ہیں۔

11.4.3 اختر شیرانی کی نظموں کی لفظیات:

مترنم لفظیات اور جمالیاتی خصوصیات کی حامل لفظیات کو شاعری میں جگہ دینا اختر شیرانی کا وصف ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سادہ اور عام فہم الفاظ کو جگہ دی ہے۔ الفاظ کی نشست سے معنویت پیدا کرنے اور کیف پرور ماحول پیدا کرنے کا فن اختر شیرانی کو خوب آتا ہے۔ جمالیات اور حسن آفرینی کے ذریعے رومانویت کا حق ادا کرنے کے لیے وہ تراکیب لفظی پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ طویل فارسی اور عربی تراکیب سے وہ اجتناب کرتے ہیں اور موزونیت کے اعتبار سے ہندی اور سنسکرت الفاظ کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی

شعریات میں حسن کا سرور اور عشق کا کیف پایا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور بے باکی ان کی شاعری میں اُمڈ پڑتی ہے۔ سادہ لفظیات کے ذریعہ وہ اپنی شاعری کی کائنات سجاتے ہیں۔ پر شکوہ اور پیچیدہ تراکیب سے گریز ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ یہی انداز ان کی شاعری کو انفرادیت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

11.4.4 اختر شیرانی کی نظموں کی ہیئت:

اختر شیرانی نے غزل کے بانکپن کی طرح نظم کو تمام فنی اور تکنیکی خصوصیات سے وابستہ کر دیا ہے جس میں رومانی رویے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پابند نظم کے انداز کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی نے اپنی نظم کے لیے نئی نئی ہیئتیں استعمال کی ہیں۔ اپنی نظموں میں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کے علاوہ خالص گیت کے طرز کو بھی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ان کی نظمیں مختلف ہیئتوں میں نظر آتی ہیں۔ بعض نظموں میں وہ دو اور تین مکمل مصرعوں کے بعد دو مختصر مصرعوں کے ذریعے نظم کی ہیئت کا تعین کرتے ہیں۔ ان کی نظم " اے عشق کہیں لے چل " تین مکمل مصرعوں کے بعد دو مختصر مصرعوں کے ذریعہ تشکیل پاتی ہے۔ ان کی مشہور زمانہ نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کی تشکیل پہلے ایک مصرعہ کے بعد تین مصرعے اور پھر پہلے مصرعہ کو بار بار دہرانے کی تکنیک سے ہوئی۔ ان کی مشہور نظم " آخری امید " میں ہر بند تین مصرعوں پر مشتمل ہے جس کے بعد دو مختصر مصرعوں کی تکرار سے نظم کے حسن کو دوبالا کیا گیا ہے۔ اردو نظم میں اس قسم کے ہیئت کے تجربے سب سے پہلی بار اختر شیرانی کے کلام میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عام انداز سے غزل اور بند کی بنیاد پر بھی نظمیں تحریر کرتے ہیں لیکن نظم کے ہیئتی ڈھانچے کو پیش کرنے کے معاملہ میں وہ جدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی اور حالیؔ کی روایتوں سے ضرور فائدہ اٹھایا اور ان کی اختیار کردہ ہیئت کو فروغ دیتے ہوئے اردو نظم کو پابند نظم کی جکڑ بندیوں سے نکال کر گیت اور جدید نظم کی ڈگر پر لا کھڑا کیا۔ اختر شیرانی نے اگرچہ نظم نگاری کے دوران قافیہ، ردیف، وزن، بحر اور علم عروض کی مکمل پابندی بھی کی ہے لیکن نظم کی ساخت میں تبدیلی لا کر اپنے انفرادی انداز کی بنیاد رکھی ہے۔

11.4.5 ماہیا:

نظم کی شاعری کو جدت پسندی اور نئے نئے تشکیلی عناصر سے وابستہ کر کے اس صنف میں اجتہادی رویہ اختیار کرنا اختر شیرانی کا مقصد رہا۔ چنانچہ انھوں نے جہاں انگریزی صنف نظم "سانیٹ" کو اردو شاعری میں فروغ دیا وہیں پنجابی شاعری کی صنف " ماہیا" کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ماہیا پنجاب کا مقبول ترین عوامی گیت ہے۔ اردو، فارسی، عربی یا ہندی کی کوئی بھی صنف شاعری اس سے مماثلت نہیں رکھتی۔ البتہ اردو غزل، مستزاد اور گیت کی یہ ملی جلی شکل کہی جاسکتی ہے: جس کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے۔ اختر شیرانی کی نظموں میں اس صنف کی پذیرائی موجود ہے۔ تین تین مصرعوں کے ماہیے میں وہ سوالات پیش کرتے ہیں:

وہ جب کبھی یاد آتے ہیں
کیوں چھیڑے ہیں مجھ کو
کیوں مجھ کو ستاتے ہیں

چپ چپ سے وہ رہ رہ کر
کچھ آنکھوں میں کہہ کہہ کر
کیوں مجھ کو ستاتے ہیں

اختر شیرانی کے ماہیوں میں کم از کم چار اور زیادہ سے زیادہ چھ مصرعوں کا انداز نمایاں ہے جس میں عمومیت اور سادگی موجود ہے۔

دل ہم کو لٹا بیٹھا
ہم دل کو لٹا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

مٹ جائے یہ سینے سے
اس عشق میں جینے سے
ہم ہاتھ اٹھا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

دم عشق کا بھرتے ہیں
ہم یاد انھیں کرتے ہیں
وہ ہم کو بھلا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

لکھا تھا یہ قسمت میں
آخر کو محبت میں
ہم جان گنوا بیٹھے
کیا روگ لگا بیٹھے

......

غم خانۂ ہستی میں
اس خواب کی بستی میں
جو چیز ہے فانی ہے
دو دن کی جوانی ہے
اک خواب شبانہ ہے

آہوں کا فسانہ ہے

اشکوں کی روانی ہے

دو دن کی جوانی ہے

اختر شیرانی نے ماہیا کے انداز پر نظمیں لکھیں۔ ماہیا کے علاوہ گیت کے ذریعے بھی نظم نگاری کو اظہار کا ذریعہ بناتے ہوئے انھوں نے اجتہاد اور جدت کے دروازے کھلے رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اختر شیرانی کی نظموں میں کئی ندرتیں دکھائی دیتی ہیں۔

11.4.6 گیت:

گیت کی کوئی ہیئت مقرر نہیں ہوتی بلکہ اس کا مدار بڑی حد تک موسیقی پر ہوتا ہے۔ دھن کے تقاضوں کے مطابق مصرعوں کی ترتیب اور الفاظ کی نشست و برخاست پر توجہ دی جاتی ہے۔ ہندی سے اردو میں پھلنے پھولنے والی اس صنف کو اختر شیرانی نے خاص طور پر اپنی نظموں میں استعمال کیا چنانچہ ان کی شاعری بے شمار گیتوں سے مالا مال ہے۔ ان کے گیت کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

ہم پریم پجاری ہیں ' تو پریم کنہیا ہے

تو پریم کنہیا ہے ' یہ پریم کی نیا ہے

یہ پریم کی نیا ہے ' تو اس کا کھوّیا ہے

کچھ فکر نہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل

اختر شیرانی نے مستزاد کے طرز پر کئی گیت لکھے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں:

لیلیٰ شب کے پریشاں ہیں گیسوے سیاہ

شورش آباد جہاں تیرہ و تار

نشہ برساتی ہے' مدہوش ستاروں کی نگاہ

نیند میں غرق ہے سارا سنسار

چار سو چھا گئی' خاموشی و ظلمت کی سیاہ

نور و آہنگ نے لی راہِ فرار

نیند کی سیج سے جاگ اٹھا ہے خوابیدہ گناہ

شیر خونخوار ہو جیسے بیدار

......

القصہ فلسفۂ ذوقِ جوانی یہ ہے

کہ جوانی نہ لٹائی جائے

مہ پارینہ کی خوبی کی نشانی یہ ہے

مدتوں تک وہ چھپائی جائے

عفت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے

شاعروں کو نہ سنائی جائے

مذہب شعر کی الہام فسانی یہ ہے

معصیت خوب بڑھائی جائے

اس طرح اختر شیرانی نے نظم کے علاوہ ماہیا اور گیت میں جوہر دکھائے اور ثابت کیا کہ ان کا ذہن ہر خیال کو نظم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

11.5 نظم "اے عشق کہیں لے چل" کا متن

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے ، لعنت گہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے
دور ...... اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں تُو پریم کنہیا ہے!
تو پریم کنہیا ہے ، یہ پریم کی نیّا ہے!
یہ پریم کی نیا ہے تو اس کا کھوّیا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی!
دل چاک اُمیدوں کی، سفاک نگاہوں کی!
ظلموں کی ، جفاؤں کی ، آہوں کی ، کراہوں کی!
ہیں غم سے حزیں۔ لے چل
اے عشق کہیں لے چل

قدرت ہو حمایت پر، ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمٰی بھی ہو پہلو میں، سلمٰی کی محبت بھی
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی

اے طفلِ حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

سنسار کے اُس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انسان کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے نظاروں پر تنہائی برستی ہو

یوں ہوتو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہوں

تو خوف نہیں، لے چل
اے عشق کہیں لے چل

برسات کی متوالی گھنگور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں
یا چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں

اے زُہرہ جبیں، لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی نہروں میں

اے خضرِ حسیں، لے چل
اے عشق کہیں لے چل

11.6 نظم "اے عشق کہیں لے چل" کا تجزیہ

اختر شیرانیؔ کی رومانوی نظموں میں عشق کی گرمی اور اس کی بے تابی کو ظاہر کرنے والی ایک انفرادی نظم کی حیثیت سے ''اے عشق کہیں لے چل'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نظم مثلث کے سات بند پر مشتمل ہے اور نظم کا تمام تر نظام اس کے لفظوں کی بے ساختگی اور جذبہ کی فراوانی کی وجہ سے ایک کیف پرور ماحول سے معمور ہو جاتا ہے۔ عشق کو ایک جذبہ ہی نہیں بلکہ دنیا میں پلنے والے ایک قیمتی احساس کا درجہ دیتے ہوئے اختر شیرانیؔ کہتے ہیں کہ دنیا گناہوں کی بستی ہے جہاں نفس پرست عشق کو پلنے دینا نہیں چاہتے۔ اس لیے نفرت کو پالنے والی اس دنیا سے نکل کر وہ ایک ایسی عشق کی دنیا میں بسیرا کرنا چاہتے ہیں جہاں محبت کی حکمرانی ہو اور جہاں کے نظارے انسان کی صورت کو ترستے ہوں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں عشق کو لے جانا چاہتے ہیں جہاں انسان اور حیوان تو کیا شیطان کا وجود بھی نہ ہو اور اس بستی میں ہر وقت برسات کی متوالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں اور پہاڑ کے دامن میں مستانہ ہوائیں چلتی ہوں اور چاندنی رات' شفاف فضا کا ایک حسین نظارہ بن جائے۔ یہ جذبہ اختر شیرانیؔ کو اس لیے دنیا سے دور لے جانے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ انہوں نے دنیا میں بس کر دیکھ لیا ہے کہ اس دنیا میں ہر طرف نفرتیں ہیں۔ موقعہ پرستی اور نفس شعاری انسان کا مسلک بن گئی ہے۔ جہاں پر ہر وقت لعنت برستی ہے اور ساری دنیا درد سے بھری اور گناہوں اور کراہوں سے بھری ہوئی ہے اس لیے اس دنیا سے دور لے جانے کے لیے وہ عشق سے التجا کرتے ہیں۔ اس نئ عشق کی بسائی ہوئی دنیا میں پہنچنے کے بعد وہ قدرت کی حمایت اور قسمت کی ہمدردی کے علاوہ سلمیٰ کی محبت اور ہر شئے سے فراغت کی دُعا کرتے ہوئے خدا سے عنایت کی التجا کرتے ہیں۔ ایک ایسی پاک وصاف بستی میں جا کر اپنے عشق کے ساتھ وہ آباد ہونا چاہتے ہیں جہاں کوئی فکر کوئی خوف نہ رہے وہ چاند تاروں سے بکھرے ہوئے شہروں میں نور کی ٹھہری ہوئی کرنوں سے معمور نہروں اور اس میں بسنے والے انسانوں سے بے حد خفا ہو کر حضرت خضر کو آواز دیتے ہیں کہ ایسی صاف وپاک بستی جہاں عشق ہی سب سے بڑا سرمایہ ہو ایسی دنیا سے شاید ہی خضر واقف ہوں اس لیے اختر شیرانیؔ ان سے ایسی بستی میں لے جانے کی آرزو کرتے ہیں۔ پوری نظم بے ساختہ جذبات اور دلی احساسات سے اس قدر مالا مال ہے کہ نظم کا ہر لفظ اپنے اندر معنویت کی دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ ساری نظم تاثیر سے بھرپور ہے۔

رومانوی فضا تیار کرنے کا ایک انداز ایسا بھی ہوتا ہے جس کے ذریعہ کسی حقیقت کی نفی کر کے اثبات کا جواز پیدا کیا جائے۔ اختر شیرانی نے اپنی نظم ''اے عشق کہیں لے چل'' کو دنیا کی نفی اور عشق کی بستی کے اثبات کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔ وہ اپنے عشق کے ساتھ جس مقام پر رہائش اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ مقام درحقیقت ان کے خیالات کی ایسی رومانوی بستی ہے جس کا وجود صرف خیالی ہے۔ عشق کی یہ بستی دنیا کے اُس پار ایسی جگہ موجود ہے جہاں صدیوں سے کسی انسان کی صورت کا گزر نہ ہوا اور اس کے ہر نظارے پر تنہائی کی حکمرانی ہے اور اس سرزمین پر ہر قسم کی فراغت کا دور دورہ ہے۔ ایک ایسی دنیا کا تصور حقیقت میں ممکن نہیں لیکن شاعر کے خیال اور احساس کے ذریعہ ایسی دنیا کا تصور پیش کیا گیا ہے جو حقیقت سے بالاتر ہے اور رومانی احساس کی وجہ سے صرف خیالی دنیا کا درجہ رکھتا ہے۔

اردو کی رومانوی نظموں میں اختر شیرانی کی نظم '' اے عشق کہیں لے چل'' کو اس وجہ سے بھی بڑی اہمیت حاصل ہے کہ یہ نظم جمالیاتی طور پر ہی نہیں بلکہ احساساتی سطح پر بھی انسان کو ایک فرحت بخش ماحول فراہم کر دیتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے ماحول سے

اکتا جاتا ہے وہ کسی قسم کی تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے۔ نظم " اے عشق کہیں لے چل " میں آفت وبلا اور مصیبتوں سے بھری ہوئی دنیا سے خود کو الگ کرنے کا ایک قیمتی احساس نمایاں ہوتا ہے۔ اس نظم میں اختر شیرانی نے بے شمار ہندی کے سبک اور رواں الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ پاپ' پریم' پجاری' کنہیا' نیّا' کھویا' گھنگھور' گھٹا جیسے الفاظ کو پوری نغمگی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ ہم قافیہ الفاظ جیسے بستی' ہستی' پرستی' ترستی اور برستی کے استعمال سے بھی نظم میں نغمگی کا احساس شدید ہوگیا ہے۔ مجہول جمع' گاہوں' نگاہوں' گھٹاؤں' ہواؤں' فضاؤں' کراہوں' جفاؤں کے علاوہ آہوں اور ظلموں کو بھی اختر شیرانی نے بڑی امتیازی خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے نظم کے جمالیاتی احساسات میں کئی گناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ نظم کی صوتی خصوصیات کے ساتھ ساتھ نغمگی اور موسیقیت کے بھی کئی وسائل نظم میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ ہئیتی اعتبار سے بھی اختر شیرانی نے مصرعہ کے آدھے حصے کو ٹیپ کے مصرعہ کے طور پر استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے اس نظم میں گیت کا آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔

11.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اختر شیرانی کا تعلق ریاست ٹونک کے مایہ ناز خاندان سے تھا۔ ان کی پیدائش 1905ء میں ہوئی۔
- اختر شیرانی کی تعلیم وتربیت گھر پر ہوئی پھر انہوں نے شعر گوئی کی طرف توجہ دی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کا مزاج حسن وعشق پرست تھا۔
- ان کی شاعری میں رومانویت اپنا بھرپور اثر دکھاتی ہے۔ انہوں نے حسن وعشق میں ڈوب کر شاعری کی۔ ان کی شعر گوئی میں جدت پسندی بھی دکھائی دیتی ہے۔
- اختر شیرانی کا تعلق ترقی پسند شاعروں کے قافلے سے تھا لیکن انہوں نے شعر گوئی کے لیے ترقی پسند نظریات سے خود کو الگ کیا۔
- انہوں نے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے علاوہ جنگ اور جدوجہد آزادی پر بھی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں بھی رومانویت کا اثر غالب نظر آتا ہے۔
- اختر شیرانی نے خواتین اور بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں نفسیاتی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔
- اختر شیرانی کی نظمیں اردو کی رومانوی شاعری کی سب سے بہترین نظمیں قرار دی جاتی ہیں اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے اختر شیرانی کو نظم کی شاعری میں انفرادی مقام حاصل ہے۔
- نظم گوئی میں رومانویت سمونے والا یہ شاعر 1948ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف 43 سال تھی۔
- اختر شیرانی کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نظم مثلث کے سات بندوں پر مشتمل ہے۔

11.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
محور	:	مرکز، جس پر پہیہ گردش کرتا ہے
باضابطہ	:	طریقے سے
منافقت	:	ظاہر و باطن میں فرق
ہیئت	:	بناوٹ، شکل
ترسیل	:	پہنچانا، روانہ کرنا
تشنگی	:	پیاس
ازالہ	:	زائل کرنا، مٹانا
شعار	:	طریقہ
ثقیل	:	بھاری
وارفتہ	:	فدا ہونا
مستعار	:	ادھار، مانگا ہوا
خول	:	اوپر کا غلاف

11.9 نمونہ امتحانی سوالات

11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. اختر شیرانی کا پورا نام کیا تھا؟
2. اختر شیرانی کے والد کا نام بتائیے؟
3. اختر شیرانی کس سن میں پیدا ہوئے؟
4. اختر شیرانی کے کتنے شعری مجموعے شائع ہوئے؟
5. "اخترستان" کس کا شعری مجموعہ ہے؟
6. اختر شیرانی نے کس شہر میں وفات پائی؟
7. نظم "اے عشق کہیں لے چل" کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟
8. نظم "اے عشق کہیں لے چل" کتنے بند پر مشتمل ہے؟

9. "مکتوبات اختر شیرانی" کے مصنف کا نام بتایئے؟

10. اختر شیرانی کی وفات کس سن میں ہوئی؟

11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. اختر شیرانی کی نظموں کی ہیئت پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. اختر شیرانی کی مذہبی اور اخلاقی نظموں کا جائزہ لیجیے۔
3. اختر شیرانی نے تاریخی، موضوعاتی اور اصلاحی نظمیں کس انداز سے لکھی ہیں؟ بیان کیجیے۔
4. اختر شیرانی کی قومی وسیاسی نظموں کا احاطہ کیجیے۔
5. بچوں اور عورتوں کی نظموں میں اختر شیرانی کے انداز کا جائزہ لیجیے۔

11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اختر شیرانی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. نظم "اے عشق کہیں لے چل" کا تجزیہ کیجیے۔
3. اختر شیرانی کی نظم نگاری کی امتیازی خوبیوں کو اجاگر کیجیے۔

11.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اختر شیرانی	ڈاکٹر یونس حسنی
2. انتخاب اختر شیرانی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
3. کلیات اختر شیرانی	گوپال متل
4. پھولوں کے گیت	اختر شیرانی

بلاک IV : اردو نظم 1936 کے بعد

اکائی 12: ترقی پسند تحریک اور اردو نظم

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 ترقی پسند نظم نگاری
12.2.1 ترقی پسند نظم نگاری کے موضوعات
12.2.2 چند اہم ترقی پسند شاعروں کی نظم نگاری
12.2.2.1 جوش ملیح آبادی
12.2.2.2 فیض احمد فیض
12.2.2.3 علی جواد زیدی
12.2.2.4 علی سردار جعفری
12.2.2.5 مخدوم محی الدین
12.2.2.6 اسرار الحق مجاز
12.2.2.7 جاں نثار اختر
12.2.2.8 احمد ندیم قاسمی
12.2.2.9 ساحر لدھیانوی
12.2.2.10 کیفی اعظمی
12.3 اکتسابی نتائج
12.4 کلیدی الفاظ
12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد دوسری سب سے بڑی تحریک ترقی پسند تحریک ہے ترقی پسند تحریک کو علی گڑھ تحریک سے زیادہ فعال اور طاقت ور تحریک مانا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی تحریک تھی جس نے نہ صرف ہندوستان کی اردو اور دوسری زبان میں لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا بلکہ پہلی بار دنیا کے تمام ادیبوں سے براہ راست رابطہ قائم کیا۔ 1936ء میں ترقی پسند تحریک کی باضابطہ داغ بیل پڑی۔ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی اولین تحریک تھی جس کا باقاعدہ منشور تھا۔ اس تحریک نے شعر و ادب کو شدت کے ساتھ متاثر کیا۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا نے ادبی روایت سے رشتہ قائم رکھا اور ملک و قوم کی خستہ حالی کی ترجمانی کی۔ اس تحریک نے دیگر اصناف سخن کی طرح اردو نظم کو بھی متاثر کیا۔ ترقی پسند نظم میں طبقاتی تقسیم، سرمایہ داروں کے مظالم، محنت کشوں کے استحصال، انسانی ہمدردی، مساوات اور امن عالم کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ترقی پسند شعرا کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی۔ وہ محرومیوں، ناانصافیوں، تشدد، سیاسی، سماجی قدروں اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے انسان کی عظمت کی بات کرتے ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ شعراء میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز اور جان نثار اختر شامل ہیں۔ ان شاعروں نے اردو نظم کو وسعت دی۔ موضوعات کے ساتھ ہیئت کے تجربات کیے اور غزل سے زیادہ، گیت، نظم معریٰ، آزاد نظم اور سانیٹ کی طرف توجہ کی۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ترقی پسند اردو نظم نگاری کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔
- ترقی پسند اردو نظم نگاری کے موضوعات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔
- اردو کے اہم ترقی پسند نظم نگار شعرا سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

12.2 ترقی پسند نظم نگاری

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ 1936ء سے ہندوستان کی آزادی تک کا زمانہ ترقی پسند رجحان کے عروج کا دور ہے۔ ان چند برسوں میں ترقی پسند فکر کے شعرا نے اردو نظم کو بے حد وسعت عطا کی اور انھوں نے اپنے فکر و فلسفہ کی بنیاد اشتراکی اصول و نظریہ پر

رکھی۔ انقلاب روس کے بعد ہندوستان میں بھی اشتراکی اصولوں کو فروغ ملا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کے شعرا نے مزدوروں اور کسانوں کو بیدار کیا اور انھیں مضبوط کیا تاکہ وہ استحصالی اور سامراجی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے اردو شاعری کے موضوع اور ہیئت دونوں میں تبدیلی واقع ہوئی کیوں کہ نیا موضوع، نیا آہنگ اور اظہار و بیان کا نیا پیمانہ بھی ساتھ لاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے نظم نگاروں نے سماجی زندگی کی صورت حال اور واردات کو نئی ہیئت، نیا اسلوب اور نیا آہنگ دیتے ہوئے ترتیب و توازن کا خاص خیال رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک کے اہم شعرا نے نظموں کی تخلیق میں جمالیاتی اقدار کا لحاظ بھی رکھا۔

ترقی پسند تحریک نے اردو نظم میں ہیئت کے تجربوں کی حوصلہ افزائی کی اور اس تحریک میں شامل شعرا نظم کی طرف اس لیے بھی متوجہ ہوئے کہ مسلسل اور مربوط خیالات و افکار کے لیے غزل کے مقابلے ہی نظم کا تسلسل زیادہ کارآمد تھا۔ ترقی پسند نظم اپنے فکری رجحان میں باغیانہ اور انقلابی خیالات کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کے تحت جو نظمیں لکھی گئیں وہ فرسودہ اور روایتی نظام معاشرت کے خلاف برسر پیکار دکھائی دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان نظموں کا لب و لہجہ پر زور اور بلند آہنگی کا حامل تھا۔ در حقیقت ترقی پسند شاعر معاشرے میں موجود بے اطمینانی اور عدم مساوات کے خلاف نعرۂ انقلاب لگانے کے ساتھ ساتھ سماج کے کچلے ہوئے طبقات کی زندگی میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ ترقی پسند تحریک کو مستحکم اور فروغ دینے میں جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، احسن جذبی اور جان نثار اختر کا اہم حصہ رہا ہے۔ ترقی پسند نظم نگاروں نے شاعری میں نئے موضوعات شامل کیے اور انھوں نے مقصدیت، افادیت، واقعیت، صداقت اور حقیقت پسندی کی ایک مضبوط اور نئی روایت کا آغاز کیا جو بعد میں آنے والے شعرا کے لیے مشعل راہ بنی۔ ان شعرا نے موضوع اور مضامین کو ہیئت، اسلوب اور فن پر فوقیت دی اور انھوں نے مقصدی اور شعوری عمل کے دوران کئی جگہوں پر شاعری کی جمالیاتی اقدار کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ترقی پسند قبیل کے شعرا نے اس اعتبار سے شاعری کو خطابت، صحافت اور پروپیگنڈہ کے قریب تر کھڑا کر دیا۔

ترقی پسند شعرا کی ایک خاصیت یہ بھی رہی ہے کہ انھوں نے فطرت، ماضی پرستی، الم پسندی اور تخیل پرستی کے محدود تصور کو پس پشت ڈال کر کسان اور زمیندار، مزدور اور سرمایہ دار، آجر اور اجیر، غلام اور مالک، بھوک، افلاس، بیماری، مساوات اور وسائل کی یکساں تقسیم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جس کی عمدہ مثالیں مجاز کی انقلابی نظمیں "سرمایہ داری" اور "انقلاب" ہیں جو کسانوں اور مزدوروں کے مسائل انقلاب، پیام آزادی اور نئے دور کا ترانہ سناتی نظر آتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے ہندوستانی زندگی کے بنیادی مسائل کو بھی موضوع سخن بنانے کی طرف توجہ دلائی اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندوستانی عوام کے بنیادی مسائل کو ادب اور شاعری میں لازمی طور پر جگہ دی جائے۔ اس لیے ترقی پسند تحریک سے متاثر بہت سے شاعروں نے وقتی اور ہنگامی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ متوسط درجے کے شعرا کے علاوہ بعض بہت بڑے اور اچھے شاعروں نے بھی وقتی اور ہنگامی موضوعات پر نظمیں لکھیں جن میں علی جواد زیدی، سردار جعفری اور مخدوم محی الدین کے نام شامل ہیں۔ ساتھ ترقی پسند شعرا میں ایک اور رجحان بھی ملتا ہے جس کے تحت شاعر اپنے محبوب سے یہ کہتا ہے

کہ وہ جس راستے پر چل رہا ہے اس میں عشق و محبت کی گنجائش نہیں ہے۔ ترقی پسند شعرا عشق و محبت کے گیتوں کی جگہ حب الوطنی اور آزادی کے ترانے گانا چاہتے ہیں۔ علی جواد زیدی کی نظم "میری راہ" سردار جعفری کی نظم "انتظار نہ کرنا" اور فیض احمد فیض کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" ہے۔ اسی کے ساتھ ایک رجحان یہ بھی ملتا ہے کہ وہ محبوب سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس آزادی کی جدو جہد میں شامل ہو کر ان کے شانہ بشانہ چلے۔ مجاز کی نظم "نوجوان خاتون سے خطاب" اس رجحان کی بہترین عکاس ہے جس کا ایک شعر بہت مشہور ہے:

تیرے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن　　　تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

بغاوت اور آزادی کی نظمیں لکھتے ہوئے اس زمانے کے کئی اہم شاعروں نے انقلاب کا خونی تصور پیش کیا تھا۔ مجاز کی نظم "انقلاب"، جاں نثار اختر کی نظم "ساقی"، سردار جعفری کی نظم "جوانی" اور "جنگ و انقلاب"، معین احسن جذبی کی نظم "دعوت جنگ"، مخدوم محی الدین کی نظم "موت کا گیت" اور "مشرق" وغیرہ جیسی نظموں میں خون آشامی اور ادبی دہشت انگیزی ملتی ہے۔ اسی لیے سجاد ظہیر نے اس رجحان کو روکنے کے لیے "اردو کی جدید انقلابی شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اس انداز کی نظموں کی کوتاہیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ انقلاب کا خونی تصور ہے اور ایک طرح کی ادبی دہشت گردی ہے۔ ایک انقلاب پرست نوجوان کے لیے جائز ہو تو ہو لیکن ایک اشتراکی شاعر کو اس سے دور رہنا چاہیے۔ انقلاب کے لیے جنگ میں حصہ لینے والے کے لیے ڈسپلن لازمی ہے اور اپنے پر قابو پانا ضروری ہے۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ اس آگ میں ہمیں کودنا ہے لیکن اسے گلزار بنانے کے لیے سجاد ظہیر کا مضمون بہت کارگر ثابت ہوا اور تمام اہم شاعروں نے یہی متوازن رویہ اختیار کیا۔

12.2.1 ترقی پسند نظم نگاری کے موضوعات:

ترقی پسند تحریک کا آغاز ایسے دور میں ہوا جب ملک کے عوام غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس وقت ہندوستانیوں کو سب سے اہم ضرورت آپسی اتحاد کی تھی اور انگریزی سامراج اس اتحاد کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس وقت ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ضرورت تھی جو ہندوستانی عوام کو ایک رکھ سکیں۔ اس ضرورت کے تحت انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور اس تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے مختلف قسم کی ہنگامی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ ان ہنگامی نظموں کے موضوعات مختلف النوع تھے۔ یہ موضوعات کچھ تو اندرونی تھے اور کچھ بیرونی۔ اندرونی موضوعات میں قومی لیڈروں کی شخصیتیں اور ان کے کارنامے، آزادی، غلامی، ہندو مسلم اتحاد، بھوک، افلاس، قحط، کارخانوں اور ملوں کے مزدوروں وغیرہ کے مسائل تھے۔ جہاں تک بیرونی موضوعات کا تعلق ہے ان میں کارل مارکس، لینن، لال جھنڈا، کمیونسٹ تحریک، اشتراکیت، روسی انقلاب وغیرہ شامل تھے۔ چند برسوں میں ان اندرونی اور بیرونی موضوعات پر اس قدر تیزی سے نظمیں لکھی گئیں کہ ان کا ایک دفتر تیار ہو گیا۔ ان نظموں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام کی تمام نظمیں دیکھا دیکھی اور فیشن کے طور پر کہی گئیں اور ان کے ذریعہ کمیونزم کا پرچار بھی دل کھول کر کیا گیا۔ ایسی نظموں میں فنی محاسن کم اور نعرہ بازی زیادہ ہے۔ یہ نظمیں تخیلی کس بل سے الگ بنے بنائے سانچے میں ڈھال کر نکالی گئیں۔

آگ، بجلی، خون، آندھی، طوفان، کل، کارخانہ، مزدور اور گولہ بارود جیسے گھن گرج والے الفاظ کی نمائندگی ایسی نظموں میں زیادہ کی گئی ہے لیکن اس سے قطع نظر اس عہد میں ایسی تخلیقات بھی پیش کی گئیں جن میں ایک رسیلا پن اور نرم ومانوس انداز بھی تھا اور ترقی پسندی کے مخصوص انداز بیان سے ہٹ کر فن کو فن کی حیثیت سے برتا گیا اور شعری محاسن کی پاسداری کی گئی۔

12.2.2 چند اہم ترقی پسند شاعروں کی نظم نگاری:

12.2.2.1 جوش ملیح آبادی:

جوش ملیح آبادی بیسویں صدی کی اردو نظم اور ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ ان کی نظمیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نظم میں محسوس اور غیر محسوس انداز میں اپنے زمانے کے رویوں اور اثرات کو قبول کیا ہے۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے "شعلہ و شبنم" اور "نقش و نگار" 1936ء میں شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں نظمیں فکر و فن کی پختگی اور تازگی کا ایسا نمونہ تھیں کہ ان کی شناخت غزل کے بجائے نظموں کی بدولت قائم ہوئی۔ جوش کی نظموں کے موضوعات آفاقیت پر مبنی ہوتے ہیں وہ انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کی بات کرتے ہیں۔ 1930ء میں انھوں نے جن موضوعات پر قلم کشائی کی ان کا اطلاق آج بھی ہورہا ہے۔ جوش کا تخلیقی سرمایہ اتنا وسیع اور اس میں اس قدر رنگارنگی اور تنوع ہے کہ کسی ایک نظم سے ان کے شعری اسلوب اور فن کی نمائندگی نہیں ہوسکتی۔ البتہ جوش نے رومانیت کا طویل سفر طے کرنے کے بعد ترقی پسند فکر کو منزل بنایا۔ ان کی نظمیں "جنگل کی شہزادی" اور "نعرہ شباب" میں اشتراکیت کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔ نعرہ وللکار کی گونج کم وبیش تمام ترقی پسند شعرا کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ کسی کے یہاں للکار دھیمے لہجے میں ہے اور کسی کے یہاں تیز و تند اور تلخ انداز میں ہے جس کا ایک نمونہ جوش کی نظم "نظام نو" میں ملاحظہ ہو:

کھیل اے نوع انسان ان سیہ راتوں سے کھیل　　　آج اگر تو ظلمتوں میں پا بہ جولاں ہے تو کیا
اور چندے ظلمت شام غریباں ہے تو کیا　　　مسکرانے کے لیے بے چین ہے صبح وطن

جوش نے ملک کو غلام بنانے والی قوتوں کو للکارا ہے اور اپنی انقلابی نظموں سے تحریک آزادی کو تازہ ولولہ دیا اور قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوش فرنگی نظام اور سامراجی طبقے سے نجات دلانے کے لیے میدان میں آتے ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے "شکست زنداں کا خواب"، "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب"، "بغاوت"، "ترانہ آزادی وطن"، "شریک زندگی سے خطاب"، "سجاد سے" اور "بیدار ہو بیدار" جیسی انقلابی نظمیں تخلیق کیں جو ترقی پسند نظریات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

12.2.2.2 فیض احمد فیض:

فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے دوسرے اہم شاعر ہیں جن کے یہاں ترقی پسند نظریے کا ادراک اور انقلابی خیالات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ فیض کا ابتدائی مجموعہ کلام "نقش فریادی" 1941ء میں شائع ہوا جس کی ابتدائی نظموں میں رومانیت کے اثرات غالب تھے۔ ترقی پسند ناقدین نے اس کو اتنی اہمیت نہ دی لیکن اس مجموعے میں موجود چند نظمیں "رقیب سے"، "بول"، "کتے"، "مجھ سے پہلی سی

محبت مری محبوب نہ مانگ"، "چند روز اور مری جان"، "تنہائی" اور "موضوع سخن" کو خاص طور پر پذیرائی نصیب ہوئی۔ ان کی نظم "صبح آزادی" بھی بہت مقبول ہوئی۔ فیض احمد فیض کی زیادہ تر نظمیں دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح مخصوص لفظیات اور نعرہ بازی کا شکار نہیں ہوتی بلکہ فہم و شعور، غنائیت اور متخیلہ کی آمیزش سے ایک نئی حسیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ "نقش فریادی" میں صرف نو مصرعوں پر مشتمل نظم "تنہائی" نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود تازگی کا احساس دلاتی ہے۔

اس کے علاوہ فیض ظلم و ناانصافی اور سامراج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں مگر ان کی شاعری میں دیگر شعرا کی طرح نفرت، دشمنی اور انتقام کا جوش نہیں ملتا بلکہ انھوں نے اس کی مذمت کے لیے بڑا مہذب لب و لہجہ اپنایا ہے۔ انھوں نے آزادی و جمہوریت کی بات کی ہے اور وہ غلامی کے عہد کو قید و بند، زنجیر و سلاسل اور مجبوری و محرومی کا دور قرار دیتے ہیں۔ نظم "چند روز اور مری جان" اسی نوع کی نظم ہے:

چند روز اور مری جاں! فقط چند ہی روز ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

فیض کے سینے میں انسان کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ اس درد کو اپنا درد خیال کرتے ہیں اور اپنی حسرتوں اور ناآسودہ خواہشوں کا خوب ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے ظلم کی چکی میں پسے ہوئے اور درد میں ڈوبے ہوئے انسان کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی نظم "ہم لوگ" میں ظلم و درد سے سسکتے اور تڑپتے ہوئے انسانوں کے چہرے نظر آتے ہیں۔ فیض نے نظم "موضوع سخن" میں ظلم و ناانصافی اور جہالت کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ فیض کی نظموں میں آزادی کا خواب بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظر آتا ہے اور وہ ہم عصر شعرا کو بھی آزادی کی فکر دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی مقبول نظم "بول" میں آزادی خیال اور آزادی اظہار کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ ان کی نظم میں آزادی اظہار کے اس پہلو پر نظر ڈالیں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے بول زباں اب تک تیری ہے

فیض کی اس نظم میں آہن گر کی دکان، سرخ آہن، تند شعلے، قفلوں کے دہانے، زنجیر کا دمان مزاحمتی علامات ہیں۔ یہ نظم اس وقت لکھی گئی جب تحریک آزادی عروج پر تھی۔ فیض کی نظموں میں استعمال ہونے والی علامات میں بغاوت کا رجحان، مزاحمت، قید و بند اور غلامی و آزادی کے تصورات کا اظہار ہے۔ ان کی نظموں میں عوام دوستی، سماجی شعور، آزادی کی کسک اور انسان کا درد پایا جاتا ہے۔ انھوں نے افسردگی، مایوسی، پستی، ناامیدی کے اندھیروں میں عزم اور حوصلہ مندی کا چراغ جلایا ہے۔ مجموعی طور پر فیض کا تعلق ترقی پسند شاعروں کے اس گروہ میں ہوتا ہے جنھوں نے تحریک کی انتہاپسندی کے دور میں بھی اعتدال کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ انھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھتے ہوئے انقلاب اور آزادی کے نغمے گانے کا عمل جاری رکھا۔

12.2.2.3 علی جواد زیدی:

علی جواد زیدی کا شمار ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے والے ان شاعروں میں ہوتا ہے جن کا تعلق پہلے رومانیت سے تھا۔ ترقی پسندوں کے قافلے میں شامل ہونے کے بعد انھوں نے انقلابی شاعری کی طرف توجہ دی۔ ان کی نظموں میں کلاسیکی رچاؤ اور توازن ملتا ہے۔

ان کی نظموں میں گیتوں جیسی تازگی اور مٹھاس پائی جاتی ہے۔ دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح انھوں نے بھی ہنگامی موضوعات پر نظمیں کہیں ہیں۔ ان کے یہاں رومان و انقلاب اور طرز قدیم کی آمیزش سے ان کی شاعری کا اپنا رنگ نکھرتا ہے۔ ان کی نظم "منزلیں" موضوع اور اظہار کے اعتبار سے دلکش ہے۔ زیدی نے اس نظم میں ہندوستانیوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ظاہری دلکشی ورعنائی دیکھ کر کہیں قدم ڈگمگانہ جائیں اور دار ورسن کی صعوبتیں تمہارے عزم کو متزلزل نہ کردیں۔ ان کی نظم "تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی" ایک مدت تک بہت مقبول رہی۔ یہاں عورت کا روایتی اور ترقی پسند تصور ایک دوسرے سے برسرپیکار محسوس ہوتا ہے۔

علی جواد زیدی کی ابتدائی دور کی بیشتر نظموں میں (جو 1930ء سے 1947ء تک محیط ہیں) تاریخ آزادی کے بے حد حساس لمحوں کی ترجمانی موجود ہے۔ دراصل یہ متوسط طبقہ کے ان تمام نوجوانوں کی جذباتی سرگزشت تھی جو جاگیردارانہ گھرانوں سے نکل کر تعلیم اور ادب کے راستے سے اشتراکی تحریکوں میں آئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اسے وہ زندگی کا مقصد مان لیتے ہیں اور اسی سے ہر شعبہ حیات کو وابستہ سمجھتے ہیں۔ علی جواد زیدی سماج میں پھیلے ظلم وجور، ناانصافی ونابرابری جیسے عناصر کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے عناصر کو بھی تلاش کرتے ہیں جن کے رشتے سماج کے بڑے بڑے مسائل سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی نظم "چند مناظر" ان کیفیات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ یہ نظم زندگی کے جن مناظر سے قاری کو روبرو کرتی ہے ان میں ٹوٹے جھونپڑے، تڑپتے بچے، قسمت کے جھوٹے قصے، مزدوروں کے زدد چہرے، اندھیری رات، شکستہ دل، بھکارن، خون کا پیاسا بھائی، شکاری ملاّ، جنگ کی طرف جاتی ہوئی دنیا، سر بیچنے والا مردِ مفلس، بے بس تہذیب، میدان جنگ کا بینڈ اور بیوہ کی فغاں سب کچھ پیش ہے۔ زیدی نے اس نظم میں بندھے ٹکے موضوع کو نہیں اپنایا بلکہ متنوع مناظر کو سمیٹ دیا ہے اور اس الزام کو باطل کر دیا کہ ترقی پسند شاعروں کے یہاں متنوع اور وسیع موضوعات نہیں ہیں۔ یہ نظم زیدیؔ کی شاہکار نظم ہے اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

میدان میں بینڈ بج رہا ہے — بیوہ کی فغاں سے درد لے کر
اور موت ترانے گا رہی ہے — انسان کی آہ سرد لے کر
دنیا سے وہ چل بسا سپاہی — افلاس کا روئے زرد لے کر

اور میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں

"دوراہے پر"، "جام بدست وجنازہ بدوش"، "گرفتاری کے بعد"، "جیل کی ایک رات"، "آغاز شباب" اور "ماں" ایسی نظمیں ہیں جن میں سیاسی زندگی کی آپ بیتی موجود ہے۔ اس کے علاوہ "آج بھی"، "وصیت"، "ہوا کے گیت"، "اہنسا کی لڑائی"، "پریم جگت"، "شیطانی سازش"، "اختتام قید"، "جیل کا اسپتال" وغیرہ ان کی سیاسی زندگی کی کامیاب نظمیں ہیں۔ "نعرہ امن"، "معمار آزادی"، "ماسکو کے محافظ"، "مادر ہندوستان"، "روسی سپاہیوں کو پیغام" اور "بہار پھر بھی بہار ہے" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں آزادی کی جدوجہد دکھائی دیتی ہے۔

اردو میں آزاد نظم ترقی پسندی کی دین ہے جس کی زبردست مخالفت بھی کی گئی لیکن ترقی پسندوں نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے

بہت سی کامیاب نظمیں لکھیں۔ علی جواد زیدیؔ نے بھی کئی آزاد نظمیں کہیں ہیں جن میں "کڑی دھوپ"، "دوست"، "دوستی"، عجیب تنہائی"، "چمنی کا دھنواں"، "لاش" اور "ہولی" ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔

12.2.2.4 علی سردار جعفری:

علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے اہم انقلابی شاعر ہیں۔ انھوں نے مارکسی نصب العین کو اپنا کر ادب کی تخلیق کی۔ ان کا طبقاتی شعور ان کی نظموں میں زور اور اثر بھرتا نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کے مجموعوں میں "خون کی لکیر"، "ایشیا جاگ اٹھا"، "امن کا ستارہ"، "پتھر کی دیوار"، "ایک خواب اور" شامل ہیں۔ ان کی نظموں میں جوش ملیح آبادی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ علی سردار جعفری کی نظمیں موضوع اور ہیئت کے حوالے سے بڑی اہم ہیں۔ ان میں کچھ ایسی ہی گھن گرج ہے جو جوش کی نظموں میں ملتی ہے۔ ان میں وہی جوش کا سا حوصلہ، مصمم ارادہ، امید کا پہلو اور باغیانہ انداز ملتا ہے۔ علی سردار جعفری کا شمار ان ترقی پسند شعرا میں کیا جاتا ہے جو سر تا پا بغاوت تھے۔ ان کا طبعی میلان ہر میدان میں اپنے وجود کو ثابت کرتا رہا خواہ ان کی شاعری کے موضوعات کی بات کیجیے، خواہ اسالیب وہیئت کا جائزہ لیجیے، خواہ ان کے خیالات کو دیکھیے، ان کا باغیانہ ذہن ہر جگہ موجود ملے گا۔ ان کی اس باغیانہ شاعری میں سرمایہ داری، سماجی نابرابری اور جبر کی طاقتوں کو ختم کرنے کا ایک تعمیری جذبہ کارفرما ہے۔ بغاوت کے اپنے تصور کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا　　　بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت رسم چنگیزی سے تہذیب تتاری سے　　　بغاوت جبرو استبداد سے سرمایہ داری سے

اس باغیانہ انداز کے ساتھ جب سردار جعفری شاعری کی قلمرو میں داخل ہوتے ہیں تو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور شعور کو اپنا ہمنا بنا کر بوسیدہ سماج کی دیواروں میں زلزلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں "جنگ اور انقلاب"، "انقلاب روس" اور تعمیر نو" بڑی اہم ہیں۔ ان میں آزادی اور خود مختاری کی نغمہ سرائی کی گئی ہے اور ظلم وبربریت کے خلاف عوام میں ہمت و حوصلہ پیدا کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں لوگوں کی کشمکشِ زیست اور امنگوں کی عکاسی کی ہے۔ ان کے کلام میں جہاں نعرہ بازی، للکار، انقلاب، احتجاج، بغاوت، توپوں اور ٹینکوں کی آواز سنائی دیتی ہے وہیں رومانیت کے میٹھے اور سریلے نغمے بھی گونجتے ہیں اور سماجی انصاف، مساوات اور خوش حالی و پلکوں پر سجائے ہوئے، خوابوں کے ہنوز تعبیر طلب ہونے کا احساس بھی ہے۔

علی سردار جعفری نے مزدور اور سرمایہ دار طبقے کا تقابلی جائزہ رومانوی فضا میں لیا ہے۔ مزدور لڑکیوں کی زبوں حالی کی تصویر اپنی ایک نظم "مزدور عورتیں" میں کھینچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بغاوت و انقلاب کے جوش سے پر درد، ظلم واستبداد کے خلاف احتجاجی نظمیں لکھیں۔ انھوں نے "نئی دنیا کو سلام" لکھ کر اردو شاعروں میں طویل نظم نگاری کے امکانات روشن کیے۔

12.2.2.5 مخدوم محی الدین:

مخدوم محی الدین کی نظموں میں ترقی پسند انقلابی شعرا کی سی گھن گرج نہیں ملتی، لیکن سماج کے فرسودہ رسم ورواج اور سرمایہ داری

پر بھرپور حملے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے چھوٹے بڑے سیاسی و سماجی مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ان کی نظموں میں ایک ایسی فنی جمالیات کا احساس ہوتا ہے جو اس سے قبل بالکل ناپید تھی۔ ان کے یہاں موضوعات اور ہیئت کا حسین تناسب ملتا ہے۔ ہنگامی موضوعات کے علاوہ ان کے یہاں عشقیہ اور رومانی نظموں کی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں خطابت، واعظانہ انداز، خشکی اور سخت لہجے سے شعوری طور پر اجتناب کیا ہے۔

مخدوم کی نظموں میں مشرقی تہذیب کا رچاؤ اور رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے معاصر ترقی پسند شعرا کی طرح آزاد ہیئت میں بھی نظم نگاری کی ہے۔ ان کی اس ہیئت میں لکھی گئی نظم "چارہ گر" میں مشرقی تہذیب کی پاکیزگی نمایاں ہے۔ مخدوم نے غریبوں کی جھونپڑی کی تاریکی کو اپنی آزاد نظم "اندھیرا" میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مخدوم کے یہاں سماجی امور، کسان، مزدور، انقلاب اور بغاوت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری میں تہذیبی عوامل و عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی دھرتی، موسم، کھیت، مندر، دہقان کی تان، لڑکیوں کا گاگر لیے ساگر کنارے جانا جیسے عوامل تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مخدوم کی نظم "حویلی" میں ایک عام انسان کی زندگی پر سرمایہ دار مسلط دکھایا گیا ہے اور شاہی خاندان کے عروج و زوال کی داستان رقم کی گئی ہے۔ مخدوم جب عظمت انسانیت کو کچلے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انھیں یہ سماج اور اس کا نظام ایک بوسیدہ حویلی کی طرح لگتا ہے:

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج

مخدوم محکومی و مجبوری کی زندگی کو ناپسند کرتے تھے ان میں حصول آزادی کے لیے بڑا جوش و جذبہ تھا۔ ان کی آزاد ہیئت کی نظم "جنگ آزادی" اس حوالے سے اہم ہے جس میں آزادی کی شمع روشن ہونے کی بشارت دیتے ہیں کہ جلد ہی آزادی کا سورج طلوع ہوگا اور فرنگی سامراج اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ مخدوم نے ہنگامی موضوعات پر بھی بڑی کامیاب اور دیرپا اثر رکھنے والی نظمیں کہی ہیں۔ خصوصاً قحط بنگال پر ان کی نظم "تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے" شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں آزادی اور تقسیم ہند کے موضوع پر ان کی نظم "چاند تاروں کا بن" موضوع کی گہرائی اور جذبہ و احساس کی شدت کے اعتبار سے فیض کی نظم "صبح آزادی" کے ہم پلہ مانی جاتی ہے۔ مخدومؔ ہنگامی موضوعات کے معاملے میں اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "قید" کے یہ مصرعے دیکھیے:

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لو

جاگ اٹھتی ہے مری شمع شبستان خیال
زندگانی کی ایک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پہ تردد کے نقوش
ان کی آنکھوں میں غم دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال

مخدوم نے غربت، افلاس اور غلامی سے عوام کو نجات دلانے کو بھی اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ وہ نئے نظام اور نئے رجحان کا خواب دیکھتے ہیں اور جمہوریت کے بغیر کسی نظام حکومت کو پسند نہیں کرتے اور اس آزادی کو بھی مکمل آزادی تصور نہیں کرتے جس میں مزدور حکمرانی نہ کرتے ہوں۔ وہ نظام کہنہ کو بدلنے کے خواہشمند ہیں اور نظام نو کے لیے پر عزم ہیں۔ اسی موضوع پر ان کی نظم "جہان نو" کے مصرعے ملاحظہ ہوں:

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو　　　ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسے جہان نو کا تو پروردگار بن

مخدوم نے اپنی نظموں میں نئے تجربے کرنے کی طرف کم توجہ کرتے ہوئے مروجہ ہیئتوں میں اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے نظموں میں عام فہم زبان، مروجہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی تشبیہات، استعارات اور محاوروں کا استعمال کیا ہے۔

12.2.2.6 اسرار الحق مجاز:

اسرار الحق مجاز ترقی پسند شعرا میں ہر دلعزیز رہے ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "آہنگ" کے نام سے کئی بار شائع ہو چکا ہے اور یہی مجموعہ "شب تاب" اور "ساز نو" کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔ آغاز میں مجاز رومانی شاعر تھے اور انقلاب کے بارے میں ان کا نظریہ محض رومانی تصورات یا عالم شباب کے معمولی واقعات سے فیضان لیتا تھا مگر جیسے جیسے ترقی پسند نظریے کا شعور بڑھتا گیا مجاز بھی آگے بڑھتے گئے۔ مجاز نے ابتدائی دور میں رومانی نظمیں کہیں جو نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئیں لیکن شعور میں پختگی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عصری حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے انھوں نے اپنی فکر کو ہندوستان کی تحریک آزادی سے جوڑ دیا۔ اس کے باوجود وہ اپنے انقلابی اور باغیانہ خیالات کا اظہار بھی ان ہی لفظیات کے ساتھ کرتے ہیں جو انھیں وراثت میں ملی تھیں۔ انھوں نے غلامی کے احساس کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ وہ وطن کے نوجوانوں کو فرسودہ نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی نظمیں "ایک جلاوطن کی واپسی" اور "اندھیری رات کا مسافر" نوجوان کے ابلتے ہوئے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی نظم "جلاوطن کی واپسی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اپنا پرچم کچھ اس انداز سے لہراتا ہے　　رنگ اغیار کے چہروں سے اڑا جاتا ہے
کوئی شاداں، کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے　　کون یہ ساحل مشرق پہ نظر آتا ہے

نے اپنی شاعری میں جمہوریت اور آزادی کی بات کی ہے۔ انھیں وطن سے بے حد محبت ہے۔ وہ ظلم و ناانصافی اور سامراج کے خلاف ہیں۔ ان کی نظم ''اندھیری رات کا مسافر'' کا نمونہ دیکھیے:

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے　　مری راہوں سے نور ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے، اہر من محشر بداماں ہے　　مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

مجاز کی بعض نظمیں حیات انسانی کے تلخ حقائق اور ہندوستانی طبقات کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظم ''اعتراف'' اور ''آوارہ'' اسی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ اسی طرح وہ فرسودہ نظام سے باغی اور بیزار بھی نظر آتے ہیں۔ وہ سرمایہ داروں اور اونچے طبقے کے فریب اور جھوٹے دعوؤں کو اپنی نظموں میں بے نقاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

12.2.2.7 جاں نثار اختر:

جاں نثار اختر کی شاعری کا خمیر غزل سے اٹھا تھا لیکن انھوں نے نظموں کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ انھوں نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا رومان سے کی لیکن ترقی پسند تحریک میں شامل ہو جانے کے بعد ان کی شاعری اور فکر میں انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ انھوں نے سنجیدہ موضوعات ساتھ ہنگامی اور وقتی کیفیات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنے ہم عصر اور پیشرو شاعروں سے خاصا اثر قبول کیا ہے۔ ''خانہ بدوش'' ان کی ایسی ہی نظموں میں سے ایک ہے جو جوش کا انداز لیے ہوئے ہے۔ جوشؔ کے طرز میں ان کی دوسری نظمیں ''میں ان کے گیت گاتا ہوں''، ''جہاں میں ہوں'' اور ''بگولہ'' ہیں لیکن جوش کے تتبع کے باوجود انھوں نے اعتدال کو برقرار رکھا۔ جوشؔ کے علاوہ انھوں نے فیض، جذبی، مجاز اور مخدومؔ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے ملک کی آزادی پر اپنے رد عمل کا اظہار کچھ دبی زبان میں کیا جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

میں تو یوں خوش تھا کہ آزاد ہوا میرا وطن　　میں تو یوں خوش تھا کہ چھوٹا وہ غلامی کا گہن
میں تو یوں خوش تھا کہ اب رات نے کھینچا دامن　　میں تو یوں خوش تھا کہ اب صبح ہوئی جلوہ افگن

12.2.2.8 احمد ندیم قاسمی:

ترقی پسند شاعروں میں جن شعرا نے اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی شامل ہے۔ ان کا تاریخی اور عمرانی شعور ان کی شاعری میں معاون رہا اور وہ عصری حالات سے باخبر رہتے ہوئے اپنے تجربات کا نچوڑ اپنی نظموں میں پیش کرتے رہے لیکن نعرے بازی سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ ان کی شاعری کا خمیر انسان دوستی اور حب الوطنی سے اٹھا ہے لہذا ان کی خوبصورت نظمیں انسان دوستی کا جذبہ جگاتی ہیں اور مستقبل کے سنہرے خوابوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ماورائی خیالات اور بعید از قیاس طرز اظہار سے انھیں نفرت ہے۔ وہ اپنی نظم ''میری شکست'' میں کہتے ہیں:

کوئی گداز نہیں خلد کے فسانوں میں — مری بہشت ہے تنکوں کے آشیانوں میں

بڑا سرور ہے انساں کی داستانوں میں — لبھا سکا فقط انسان کا مزاج مجھے

موضوعات کے انتخاب میں ندیم بہت محتاط ہیں۔ وہ روایتی تکلفات سے اجتناب کرتے ہوئے فنی اور جمالیاتی رکھ رکھاؤ کو خصوصی طور پر اپنی شاعری میں اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں پیچیدگی اور ابہام نہیں ہوتا اور وہ بڑے سلیقے سے اپنی بات سادہ زبان میں کہہ جاتے ہیں۔ ان کی نظم ''آزادی کے بعد'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:

زندگی عزم زندگی سے تہی — کارواں کے غبار میں گم ہے

زاہد کہنہ سال کی مانند — مقبروں کے شمار میں گم ہے

احمد ندیم قاسمی نے ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا اس لیے ان کی نظموں میں ایک افسانوی فضا نظر آتی ہے۔ افسانوں کی ہی طرح ان کی نظموں میں بھی پنجاب کے گاؤں اور کسانوں کی سرگرمیوں کے مناظر جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کی اس طرح کی نظموں میں ''جب آنکھ کھلی تو''، ''پرواز جنوں''، ''دیہات کی شہزادی'' اور ''نوکری پر جاتے ہوئے'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اور ان کی نظم ''کروٹیں'' اور ''راستے کا موڑ'' اشتراکی فکر و احساس کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔

12.2.2.9 ساحر لدھیانوی:

ساحر لدھیانوی ترقی پسند دور کے مقبول شاعر ہیں۔ وہ بھی کئی دوسرے شعرا کی طرح رومان سے انقلاب کی طرف بڑھے ہیں۔ ان کی ابتدائی نظموں میں حسن و محبت کا بڑا دلچسپ اور دلفریب بیان ہوتا تھا۔ انھوں نے محبت کے بارے میں بھی طبقاتی شعور کو سامنے رکھا اور بے باک محبت میں جو سماجی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں ان کا ذکر بڑے غم انگیز اور طنزیہ طریقے سے کیا ہے۔ ساحر انسانی عظمت کے شاعر ہیں ان کے نزدیک دنیا کی آسائشوں سے زیادہ اہم ناداروں اور غریبوں کی زندگی ہے۔ وہ بڑے حساس دل انسان ہیں، فاقہ کش لوگوں اور بچوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کی نظم ''مرے گیت'' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے — کہ شاید مرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے

مجھے ہنگامہ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے — مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے

انسان دوستی اور غریبوں کا دکھ درد ان کی نظموں میں بھی ہے لیکن بلند آہنگ اور تلخ لہجہ لیے ہوئے نہیں۔ وہ محض شعلہ نوائی یا نغمہ سرائی نہیں کرتے۔ نرم روی کے ساتھ ہر مسئلے کو انگیز ہیں۔ ان کی کامیاب نظموں میں ''پرچھائیاں''، ''چکلے''، ''بنگال''، ''فن کار''، ''جاگیر''، ''شکست زنداں''، ''لمحہ غنیمت''، ''خودکشی سے پہلے''، ''نور جہاں کے مزار پر''، ''کل اور آج''، ''مفاہمت'' اور ''لہو نذر دے رہی ہے حیات'' شامل ہیں۔ ہنگامی موضوعات پر جو نظمیں ساحر نے کہی ہیں ان میں بھی ایک الگ سی کیفیت ہے۔ ایسی ہی نظموں میں ان کی ایک نظم ''آج'' ہے جو انھوں نے تقسیم وطن کے نتیجے میں ابھرنے والے خاک و خون کے رقص، فرقہ وارانہ منافرت اور ہنگاموں کے تناظر میں لکھی تھی۔ اس نظم کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

میں تمہارا مغنی تمہارے لیے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامن چاک میں
گرد راہ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا ہے
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سر ہچکیاں بن گئے ہیں

ساحر کی بعض نظموں میں رومانیت اور ترقی پسندیت کا حسین امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ ان کی نظم "فن کار" ایسا ہی ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ انھوں نے اس نظم میں زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی عکاسی کرتے ہوئے کہا ہے کہ غربت انسان سے کیا کیا کراتی ہے۔ انسان کو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے کس طرح اپنے خوابوں اور اپنی خواہشوں کو بیچنا پڑتا ہے۔ شاعر رومان کے پس منظر میں ایک سچائی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میری محبت میں تجھے افلاس کی وجہ سے نہ اپنا سکا تو کسی زردار کا مقدر بن گئی۔ میں نے جو تیری یاد کے خاکے بنائے تھے وہ بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکا کیوں کہ میں نے روزی روٹی کے چکر میں انھیں بیچ دیا ہے۔ اس طرح ساحر کا رومانوی رجحان عشق کی دنیا سے سفر کرتے ہوئے کائنات اور سماج کا ترجمان بن جاتا ہے۔ اس اسلوب اور نظریہ کی حامل نظموں میں "تاج محل" اور "نور جہاں کا مزار" کافی اہم ہیں۔ ساحر نے "تاج محل" کے ذریعہ جاگیر دار اور سرمایہ دار کی مذمت کی ہے۔ ساحر کی طویل نظم رومان کے تصور اور رومانوی اسلوب سے معمور نظر آتی ہیں مگر اس میں ظلم و استبداد اور استحصال جیسے اہم ترقی پسندانہ پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے جیسے ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل	مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں، حسیں شاخیں	تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

برطانوی سامراج کے قابض ہونے سے ہندوستانی تہذیب پر اور بھی کئی اثرات مرتب ہوئے جنہیں تخیل کی پرواز دے کر ساحر نے اپنی نظم میں بیان کیا ہے۔ وہ اس اجڑی تہذیب پر افسردہ ہیں۔ ساحر نے "پرچھائیاں" میں کسانوں، مزدوروں، مفلسوں اور غریبوں کی بات بھی کی ہے اور ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے محبت، امن اور اعلیٰ اقدار کو فروغ دینے کی خواہش ظاہر کی ہے جو آزادی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ساحر لدھیانوی نے زیادہ تر انقلابی اور ترقی پسند نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی تشبیہیں حسین اور اشارے لطیف ہوتے ہیں۔

12.2.2.10 کیفی اعظمی:

کیفی اعظمی ایک صاف ستھرا اور پر جمال انداز لے کر ترقی پسند تحریک کے کارواں میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی نظمیں

داخلی اور جمالیاتی شاعری کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان کی توجہ غزل اور دیگر مروجہ اصناف کے مقابلے میں نظم کی طرف زیادہ رہی۔ ان میں تخلیقی اپج فطری تھی، اس لیے وہ ترقی پسند شاعروں میں اپنی علاحدہ شناخت بنانے اور اپنی تخلیقی قوت کو منوانے میں کامیاب ہوئے۔ تحریک سے باقاعدہ وابستگی کے بعد کیفی اعظمی کے طرز فکر میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ وہ بھی عصری تقاضوں اور نعرے بازی سے آلودہ فضا کے عین مطابق ہنگامی موضوعات کا انتخاب کرکے نظمیں کہنے لگے جس سے ان کی داخلیت پر خطابت اور خارجی عوامل کا عنصر غالب آگیا لیکن اس کے باوجود ان کے لہجے کی شستگی باقی رہی۔ اس عہد میں انھوں نے جو نظمیں کہیں ان میں ''گوریا کا نعرہ''، ''مژدہ''، ''قومی حکمراں''، ''فتح برلن'' وغیرہ اچھی نظمیں ہیں جن میں کیفی اعظمی کا انفرادی طرز اظہار نظر آتا ہے۔

کیفی اعظمی کے شعری مجموعہ ''آخر شب'' کی نظموں میں ان کے شخصی مسائل کے علاوہ انسانی ہمدردی اور بے لوث جوان مردی، حوصلہ، ہمت و جرائت اور خدمت خلق نمایاں ہے۔ تقسیم ملک کے کرب، انسانی فلاح و بہبود سے معمور نظموں میں ''نئے خاکے''، ''یلغار''، ''کرن''، ''سوویت یونین''، ''ہندوستان''، ''تلاش''، ''منظر خلوت''، ''احتیاط''، ''ملاقات''، ''ناقص بھرتی'' اور ''سروجنی نائیڈو'' شامل ہیں۔ کیفی کی ان نظموں کے مطالعہ سے انسانیت کے لیے ہمدردی اور خلوص و محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ پورے عالم کی مخلوق کا محافظ بن جاتا ہے۔

12.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاروں نے زندگی کی جدلیاتی اور مادی تحریک کو موضوع بنایا۔ شعرا نے اپنے افکار و خیالات اور خارجی عناصر کو شامل کرتے ہوئے معاشرتی واقعات و حالات پر قلم اٹھایا۔
- ترقی پسند نظریات کے حامل شعرا نے شاعری کا رشتہ بنی نوع انسان سے جوڑنے کو اپنا نصب العین بنایا اور شاعری کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرکے طبقاتی فرق، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کی کوششیں کیں اور ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل پر زور دیا۔
- ترقی پسند نظم نگاروں نے یکساں طور پر مزدوروں اور کسانوں کو بیدار کیا اور انھیں مضبوط کیا تاکہ وہ استحصالی اور سامراجی طاقتوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔ انھوں نے پسے ہوئے طبقے کا درد محسوس کیا اور ان میں ایک امنگ اور ولولہ پیدا کیا۔
- ترقی پسند تحریک کو مستحکم اور فروغ دینے میں جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر وغیرہ کا کردار زیادہ اہم رہا ہے۔
- ترقی پسند شعرا کی ایک خاصیت یہ بھی رہی ہے کہ انھوں نے فطرت، ماضی پرستی، الم پسندی اور تخیل پرستی کے محدود تصور کو پس پشت ڈال کر کسان اور زمیندار، مزدور اور سرمایہ دار، آجر اور اجیر، غلام اور مالک، بھوک، افلاس، بیماری، مساوات اور وسائل کی یکساں تقسیم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے

12.4 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
شدت	:	جوش وخروش
وسعت	:	پھیلاؤ، کشادگی
اطلاق	:	رواں کرنا، استعمال ہونا
ظلمت	:	تاریکی، اندھیرا
فغاں	:	بانگ، فریاد، شوروغل
افلاس	:	مفلسی، تنگدستی، غریبی
استبداد	:	ظلم وطاقت سے حکومت کرنا، خودمختاری
چارہ گر	:	دست گیر، چارہ ساز
انفاس	:	سانسیں، لمحات زندگی
شاہراہ	:	بڑااور کشادہ راستہ
غم دوش	:	غم اور مصیبت میں ساتھ دینے والا
فگن	:	ڈالنے والا، پھینکنے والا
بہشت	:	جنت، آرام کی جگہ
تلخ	:	کڑوا، بدذائقہ
لطیف	:	پاکیزہ، نازک، باریک
فلاح وبہبود	:	فائدہ اور بھلائی

12.5 نمونہ امتحانی سوالات

12.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. ترقی پسند تحریک کے نمائندہ نظم نگار کا نام کیا ہے؟
2. ترقی پسند تحریک کا وجود کس صدی میں ہوا؟
3. ترقی پسند اردو نظم کے اہم موضوعات کیا ہیں؟
4. مجاز کا پورا نام کیا ہے؟

5. "شعلہ و شبنم" کس کا شعری مجموعہ ہے؟

6. ’’آوارہ‘‘ کس شاعر کی نظم ہے؟

7. ’’چند روز اور مری جاں‘‘ کس کی نظم ہے؟

8. ’’بساط رقص‘‘ کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟

9. نظم ’’پرچھائیاں‘‘ کے شاعر کون ہیں؟

10. کیفی اعظمی کے شعری مجموعہ کا نام بتائیے۔

12.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ترقی پسند اردو نظم نگاری کے بارے میں لکھیے۔

2. ترقی پسند اردو نظم نگاری کے موضوعات سیر حاصل گفتگو کیجیے۔

3. ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

4. علی جواد زیدی کی نظم نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

5. فیض احمد فیض کی نظم نگاری پر مختصر نوٹ لکھیے۔

12.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. ترقی پسند تحریک اور اردو نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2. ترقی پسند تحریک کے نمائندہ نظم نگاروں پر تبصرہ کیجیے۔

3. جوش، فیض اور مخدوم کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

12.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اردو میں ترقی پسند تحریک	خلیل الرحمن اعظمی
2. اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی
3. ترقی پسند ادب	عزیز احمد

اکائی 13: فیض کی نظم نگاری: ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 حیات

13.3 ادبی کارنامے

13.4 نظم نگاری

13.4.1 اسلوب سخن

13.5 نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا متن

13.6 نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا تجزیہ

13.7 اکتسابی نتائج

13.8 کلیدی الفاظ

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

فیض احمد فیضؔ عصر جدید کے مقبول شاعر ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعر ہیں۔ فیض کی شاعری میں رومان و حقیقت کی دھوپ چھاؤں ابتدا سے انتہا تک موجود ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و محبت کی دل گداز داستانیں بھی ہیں اور بیزار نگاہوں کی تلخی بھی۔ ان میں حسن کی رنگینی میں کھو جانے کی جرات بھی ہے اور اجنبی ہو جانے کی تمنا بھی ہے۔ یہ اپنے عہد سے مایوس ہیں لیکن شکست خوردہ نہیں۔ ان کی شاعری میں تفکر آمیز تجسس ہے۔

اس اکائی میں فیض احمد فیض کے حالات زندگی، کارنامے، نظم نگاری کی خصوصیات اور منتخب نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- فیض احمد فیض کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں سے واقف ہو سکیں۔
- فیض احمد فیض کی نظم نگاری اور اسلوب سخن کے بارے میں جان سکیں۔
- نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا تجزیہ پیش کر سکیں۔

13.2 حیات

فیض احمد فیضؔ کا نام فیض احمد خاں تھا۔ پر دادا کا نام سربلند اور دادا کا نام صاحب زادہ خاں تھا۔ فیضؔ کی بہن بی بی گل کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں ایک راج پوت راجہ ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارن پور سے تھا۔ اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے والد کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ فیض کے والد کا نام سلطان بخش تھا لیکن انھوں نے خود اپنا نام بدل کر سلطان محمد خاں کر لیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ سلطان محمد خاں نے افغانستان میں 13 برس ملازمت کی اور امیر عبد الرحمن کی بھتیجی اور سردار محمد رفیع خاں کی بیٹی سائرہ خاں سے شادی کی لیکن شادی کے دو سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ سلطان محمد خاں شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی بھانجی ڈاکٹر مس ہملٹن نے اپنے ایک ناول میں ان کا ذکر کیا ہے۔ افغانستان سے آنے کے بعد سلطان محمد خاں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور سیال کوٹ کے مشہور بیرسٹر بن گئے۔ علامہ اقبالؔ' سر عبد القادر' ڈاکٹر ضیا الدین' علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا تھا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر' انجمن اسلامیہ سیال کوٹ کے صدر' اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبد الرحمن کی سوانح عمری انگریزی میں لکھی تھی۔ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے عدالت خاں کی صاحبزادی سلطان فاطمہ سے دوسری شادی کی۔ فیض ان ہی سے پیدا ہوئے۔ اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں فیض کہتے ہیں۔

> ”تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں 7 جنوری 1911ء اور کہیں 7 جنوری 1912ء درج ہے۔ سیال کوٹ کے دفتر بلدیہ کے ریکارڈ میں 13 فروری 1911ء تاریخ پیدائش درج ہے۔“

فیضؔ قصبہ قادر، ضلع سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے زمانے میں فیضؔ نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ فیض نے اپنی تعلیم کا آغاز 1915ء میں چار سال کی عمر میں قرآن پاک کے حفظ سے کیا۔ (صرف تین پارے حفظ کر سکے آنکھیں دکھنے لگیں تو حفظ کرنا چھوڑ دیا) 1916ء میں مولوی ابراہیم سیال کوٹی کے مکتب میں بٹھا دیے گئے جہاں انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ 1921ء میں لاہور کے ایک مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ 1927ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1929ء میں مرے کالج آف سیال کوٹ سے انٹر میڈیٹ بھی درجہ اول سے کامیاب کیا۔ 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور عربی میں بی۔ اے آنرز کیا۔ اس کے بعد 1933ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے اور 1934ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔ اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اس طرح فیض کا پورا تعلیمی کیریر فرسٹ کلاس ہے۔ والد کے کہنے پر آئی۔ سی ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے ۔ امتحان سے پہلے انھیں ہیضہ ہو گیا۔ اس لیے امتحان نہ دے سکے۔ 1934ء میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔ 1935 میں امرتسر کے مسلم اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔ اے۔ او) میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوا۔ 1940ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔

فیض احمد فیضؔ نے ایک انگریز خاتون مس ایلیس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ ایلیس جارج، کرسٹنا بیل کی چھوٹی بہن تھیں۔ کرسٹنا بیل ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی بیوی تھیں جو ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل تھے۔ شیخ عبداللہ نے مہاراجہ کشمیر کے محل میں ان کا نکاح پڑھوایا۔ فیضؔ کی شادی عجیب ڈھنگ سے کشمیر میں ہوئی۔ بارات میں صرف دو آدمی تھے۔ فیض کے بڑے بھائی طفیل احمد خاں اور فیضؔ کے ایک دوست نعیم۔ نکاح کے بعد بیگم و شیخ عبداللہ نے دلہا دلہن کی دعوت کی، دعوت کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں جوشؔ اور مجازؔ نے شرکت کی۔ تین دن قیام کے بعد فیض اور ان کی بیگم لاہور آ گئے۔ فیضؔ کے والد نے ایلس کو باضابطہ دلہن بنایا اور ان کا نام کلثوم رکھا۔ فیض کی اولادمیں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ 1942ء میں اور چھوٹی بیٹی منیرہ 1945ء میں پیدا ہوئیں۔

1942ء میں درس و تدریس کے پیشے کو خیر باد کہا اور فوج میں ملازمت اختیار کی۔ کیپٹن کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ وہ لاہور سے دہلی آ گئے۔ ان کا تعلق فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے تھا۔ 1943ء میں میجر اور 1944ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔ یہاں انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد روزنامہ '' امروز'' کے ایڈیٹر اور ہفت روزہ '' لیل و نہار'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔

قیام پاکستان کے تقریباً تین برس بعد 1951ء میں لیاقت علی خاں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ دوسرے فوجی افسر اور ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیت سجاد ظہیر بھی گرفتار ہو گئے۔ یہ کیس '' راول پنڈی سازش مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ فیضؔ نے چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔ تقریباً تین مہینے قید تنہائی کی سزا ہوئی۔ فیض کی بیشتر نظمیں ان

کے زمانہ قید کی یادگار ہیں۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے — ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زبان میں نے

20اپریل 1955ء کو قید سے رہا ہوئے۔ دوسری بار 1958ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل 1959ء میں رہائی ملی۔ اپریل 1959ء میں ہی فیض پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس خدمت پر وہ جون 1962ء تک فائز رہے۔ اس کے بعد وہ لندن چلے گئے۔ 1964ء میں فیس سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ستمبر 1968ء میں کراچی میں ادارہ یادگار غالب قائم کیا اور علامہ اقبالؔ پر فلم بنائی۔ 1972ء میں فیض پاکستانی قومی ادبی اکیڈیمی کے صدر مقرر ہوئے۔ 1979ء میں بیروت کے انگریزی رسالے ’’ لوٹس‘‘ کے ایڈیٹر بنے۔ 1981ء میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر جشن فیض منایا گیا۔1984ء میں لندن میں فیضؔ سمینار ہوا جس میں فیضؔ بذاتِ خود شریک ہوئے۔

19نومبر 1984ء کو ان پر دمّے کا شدید دورا پڑا۔ انھیں لاہور کے ماؤ ہاسپٹل میں داخل کیا گیا جہاں ایسٹ میڈیکل وارڈ میں 20 نومبر 1984ء بروز منگل دن میں ایک بج کر پندرہ منٹ پر ان کا انتقال ہو گیا۔ لاہور کے ماڈل ٹاون قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ فیض کی تقریباً پندرہ شعری و نثری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

شعری مجموعے:

1. نقش فریادی(2) (1941) دست صبا(3) (1952) زنداں نامہ(4) (1956) دست تہہ سنگ(5) (1965) سر وادی سینا(1971) (6) شام شہر یاراں(7) (1978) میرے دل میرے مسافر(8) (1981) کلام فیض(9) (1982) سارے سخن ہمارے(فیض کا تمام کلام ’’کلیات‘‘ کی صورت میں لندن سے شائع ہوا)(10) (1984) نسخہ ہائے وفا(سارے سخن ہمارے کا پاکستانی ایڈیشن(1984)

نثری مجموعے:

(1)میزان(تنقیدی مضامین) (2) 1962 صلیبیں میرے دریچے میں(خطوط)(3) 1971 متاع لوح و قلم(1973) (4)ہماری قومی ثقافت(5) (1976) مہ و سال آشنائی(6) (1980) سفر نامہ کیوبا(1974)

13.3 ادبی کارنامے

فیض تعلیم ختم کرنے کے بعد جب امرتسر آئے تو ان کی ملاقات پطرس بخاری، رشید جہاں، ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر محمود الظفر اور دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے ہوئی۔ فیضؔ اپنے پہلے عشق میں ناکام ہو کر بہت دل برداشتہ تھے۔ رشید جہاں نے اسے محسوس کیا اور کہا کہ یہ حادثہ

تمہاری ذاتِ واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے مگر یہ اتنا بڑا نہیں ہو سکتا کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔ انھوں نے فیضؔ کو پڑھنے کے لیے ایک کتاب دی جو کارل مارکس کی تھی۔ بقول فیضؔ انھوں نے اس کتاب کو پڑھا اور ان پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اشتراکی ادب کے مطالعے نے انھیں سوشلزم کی طرف مائل کیا۔ فیضؔ نے ان لوگوں کے ساتھ مل کر ریلوے اور ڈاک و تار کے مزدوروں کو منظم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد فیضؔ ٹریڈ یونین کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصہ لیا۔ فیضؔ نے جینوا اور سان فرانسسکو میں منعقدہ آئی۔ ایل۔ او کے اجلاس میں شرکت کی۔ فیضؔ نے اپنے ملکی مسائل کے علاوہ فلسطین مہاجرین اور افریقی عوام کو آزادی کی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ فیضؔ کا تعلق فلموں سے بھی رہا۔ انہوں نے دو فلموں کے لیے گانے اور مکالمے لکھے۔ ایک فلم " جاگو ہوا سویرا" جو 1959ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی اس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے۔

فیضؔ نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کیے 49-1948 تک سان فرانسسکو اور جینوا میں رہے۔ جولائی 1962ء سے جنوری 1964ء کے دوران انگلستان' روس' الجیریا' مصر' لبنان اور ہنگری کا سفر کیا۔ 1958ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس تاشقند میں ہوئی جس میں فیضؔ صاحب نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔

فیضؔ کو فوجی ملازمت کے دوران 1946ء میں ایم۔بی۔ای کا خطاب ملا۔ 1962ء میں فیضؔ کو پہلا لینن انعام ملا۔ فیضؔ پہلے ایشیائی شاعر تھے جنھیں یہ اعزاز دیا گیا اس سے فیضؔ کو نہ صرف بین الاقوامی شہرت ملی بلکہ اردو زبان کا وقار بھی بلند ہوا۔

13.4 نظم نگاری

1928ء میں جب فیضؔ بی۔اے کے پہلے سال میں تھے شعر کہنے لگے تھے۔ مرے کالج سیال کوٹ کے لکچرر محمد سلیم چشتی جو اقبالؔ کے ہم عصر تھے' بی۔اے کے طلبا کو اردو پڑھاتے تھے۔ چشتی صاحب نے ایک گروپ " اخوان الصفا" کے نام سے بنایا تھا جس کے زیر اہتمام ہر ماہ کالج میں ایک محفل شعر منعقد کی جاتی تھی۔ اس کے پہلے مشاعرے کے لیے یہ مصرع طرح تجویز کیا گیا تھا۔

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا

نومبر 1928ء کے پہلے ہفتے میں منعقد ہونے والی اس پہلی محفل میں فیضؔ نے پہلی بار غزل پڑھی۔

لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلا دے وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

یہ شعر کافی مقبول ہوا۔ ان کی پہلی نظم " میرے معصوم قاتل" گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین' دسمبر 1929ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ فیضؔ کا پہلا شعری مجموعہ " نقش فریادی" 1941ء میں شائع ہوا۔ اس میں فیضؔ نے دیباچے میں اعتراف کیا:

”اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے ۔شاید اس میں دو چار نظمیں قابل برداشت ہیں لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں شائع کروانا ممکن نہیں تھا۔ اصولاً مجھے انتظار کرنا چاہیے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا۔“

لیکن یہ بات فیضؔ نے اپنے انکسار کی وجہ سے کہی تھی۔ ان کا پہلا مجموعہ کافی مقبول ہوا۔ اس پر انھوں نے ن۔م۔راشد سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ راشدؔ نے لکھا تھا:

”نقش فریادی ایک ایسے شاعر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔“

ن۔م۔راشدؔ کا یہ جملہ فیضؔ کی شاعری کا ”سر نامہ“ ثابت ہوا۔

فیض کی شاعری میں رومان و حقیقت کی دھوپ چھاؤں ابتدا سے انتہا تک موجود ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و محبت کی دل گداز داستانیں بھی ہیں اور بیزار نگاہوں کی تلخی بھی۔ ان میں حسن کی رنگینی میں کھو جانے کی جرات بھی ہے اور اجنبی ہو جانے کی تمنا بھی ہے۔ یہ اپنے عہد سے مایوس ہیں لیکن شکست خوردہ نہیں۔ ان کی شاعری میں تفکر آمیز تجسس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ غلامی کا یہ اندھیرا چند روزہ ہے۔ اس کے لیے وہ ہر ستم سہنے کے لیے تیار ہیں۔ فیضؔ کے مزاج میں رومانیت ہے۔ یہ رومانیت انھیں خالص انقلابی بننے سے روکتی ہے۔ ان کی انقلابیت میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے اور اسی لیے وہ رومان اور حقیقت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ فیضؔ نے اپنی زندگی میں محبت کی تھی اور ناکام ہوئے تھے۔ ان کا محبوب ان کی مختلف نظموں اور غزلوں سے جھلکتا رہا۔

فیضؔ کی نظموں میں یہ محبوب بار بار نظر آتا ہے لیکن یہ خیالی اور تصوراتی محبوب نہیں ہے بلکہ جیتا جاگتا محبوب ہے جس سے انھوں نے بے پناہ پیار کیا تھا۔ یہ محبوب متوسط طبقے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ کسی اونچے گھرانے سے متعلق ہے۔ فیضؔ انتظار کرواتے نہیں بلکہ انتظار کرتے ہیں۔ فیضؔ کی ابتدائی شاعری میں تنہائی اور انتظار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیضؔ کی روح تنہائی کا شکار ہے۔ وہ گرد و پیش کے ماحول کو اکتائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اُن کا دل اچاٹ ہے' وہ پرانی زوال پذیر قدروں سے مایوس ہیں۔ انھیں انتظار ہے۔ اپنے محبوب کا' کسی رنگین آنچل کا' گھنے درختوں پہ سوئی ہوئی چاندنی کا اور عہد نو کا جس پر ان کا یقین ہے۔ ان کی تنہائی لمحہ بہ لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہیں۔ یہ نظمیں اپنا ایک انفرادی وجود رکھتے ہوئے بھی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ نقش فریادی کی پہلی نظم ”خدا وہ وقت نہ لائے“ میں بھی انتظار ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں:

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے

تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے

خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے

کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے

اور آخر میں

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ بیقرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اس نظم میں فیضؔ اپنے محبوب کو آنے والے وقت کا خوف بھی دلاتے ہیں اور اپنے دل کی بے قراری کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں فراق اور جدائی کا سوز گھلاوٹ اور لذت ہے۔ فیضؔ کے انتظار میں درد کی کسک ہے' امید کی ٹیسیں ہیں۔ فیضؔ کی شاعری میں تنہائی اور انتظار مختلف روپ اختیار کرتے ہیں۔

ان نظموں کی ایک خاص فضا ہے۔ ایک غم انگیز خامشی ہے۔ فیضؔ کی شاعری کا سارا حسن فضا سے جھلکتا ہے۔ وہ ایک ایسی فضا کی تعمیر کرتے ہیں جہاں مصرعوں کی معنویت اہم نہیں رہ جاتی۔ اس فضا میں الفاظ موم کی طرح پگھل کر بہنے لگتے ہیں۔ ایک سناٹا سا محسوس ہوتا ہے اور تنہائی روح کی گہرائیوں میں اترتی محسوس ہوتی ہے اور سارا وجود سر تا پا انتظار بن جاتا ہے۔ فیضؔ نے دو نظمیں "تنہائی" اور " انتظار" کے عنوان سے لکھی ہیں۔

نظم " انتظار" میں وہی اشتیاق ہے جو ہر شاعر کو اپنی محبوبہ کا ہوتا ہے۔ اس نظم میں وہ کوئی خاص فضا نہیں بنا سکے۔ صرف اپنے عام احساسات کا اظہار کرتے ہیں:

جو حسرتیں تیرے غم کی کفیل ہیں پیاری ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں

طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

نظم " تنہائی" معنوی اور فنی اعتبار سے فیضؔ کی اہم نظم ہے۔ یہ نظم داخلیت کا اظہار ہے۔ یہ نظم آرتھر سائمن کی Broken Trust یا ہارڈی کی نظم The Broken Appointment کی یاد دلاتی ہے۔ شاعر کا سارا وجود سمٹ کر انتظار کے نقطے پر مرکوز ہے۔ خفیف سی خفیف آہٹ پر وہ چونک اٹھتا ہے۔ اسے اپنے محبوب کے قدموں کی آہٹ کا دھوکا ہوتا ہے۔ امید و بیم کی کیفیت ہے۔ امید کی لو ٹمٹما رہی ہے۔ پھر وہ بھڑک اٹھتی ہے اور پھر بجھ جاتی ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں

راہرو ہو گا کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر

اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ

گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

نظم کے پہلے مصرعے میں شاعر کا وجود ساری دنیا سے بے خبر ہے۔ وہ ہم کلامی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسے خیال آتا ہے کہ کوئی راہرو ہو گا جو کہیں اور چلا جائے گا۔ پھر انتظار کی شدت مایوسی میں بدلتی جاتی ہے۔ مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ رات ڈھل چکی ہے۔ تاروں کا غبار بکھرنے لگا ہے۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے ہیں۔ اسے یقین ہوتا جارہا ہے کہ اب کوئی آنے والا نہیں ہے اس لیے وہ شمعیں گل کرنے ' مے و مینا و ایاغ بڑھا دینے اور بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کی التجا کرتا ہے۔ کوئی نہیں کوئی نہیں کی تکرار انتہائی مایوسی کا اظہار بن جاتی ہے۔ یہ نظم کسی بھڑکتی ہوئی شمع کے بجھنے کی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ سارے حواس کو بیدار کرتی ہے۔ پہلے قوت شامہ بیدار ہوتی ہے۔ ہر آہٹ پر کان لگے ہوئے ہیں۔ پھر بصارت کی حس کو چھوتی ہے رات ' تاروں کا غبار ' چراغ... پھر مذوقی حس کو جگاتی ہے ' مے ' مینا و ایاغ سے... پھر بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کا عمل لمسی احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح یہ ساری حسیں انتظار سے مایوسی کی طرف گامزن ہوتی ہیں۔

بعض نقادوں نے اسے جہان نو کا انتظار قرار دیا ہے۔ ن۔ م۔ راشد نے تاروں کے بکھرے ہوئے غبار اور ایوانوں کے لڑکھڑاتے چراغ کا مطلب تہذیب کا بکھرتا شیرازہ لیا ہے۔ لیکن یہ مطالب دور از کار معلوم ہوتے ہیں۔

فیض ؔ اپنے عہد کی حقیقت کا سامنا کرتے ہیں اور خوابوں کی شکست کے المیے کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ رومانی افسردگی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہلکی سی کسک ' میٹھا میٹھا درد پُر لطف تڑپ اور محبوب کی چاہت میں شدت ہے۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہاتے ہیں اور محبوب کے تغافل کے باوجود اسے چاہتے اور دعائیں دیتے ہیں:

راتوں کی خموشی میں

چھپ کر کبھی رولینا

مجبور جوانی کے

ملبوس کو دھولینا

جذبات کی وسعت کو

سجدوں سے بسالینا

بھولی ہوئی یادوں کو

سینے سے لگالینا

(انتہائے کار)

فیضؔ کی رومانی شاعری عشق کی مدہوشیوں اور جسم کی لذت کوشیوں کا بیان نہیں ہے۔ فیضؔ کے ہاں وصل کی سرشاری نہیں بلکہ جدائی کی خاموش تڑپ ہے۔ یہ شاعری ایک ایسے شخص کے آنسووں و آہوں کی داستان ہے جسے اس بات کا احساس کھائے جارہاہے کہ زندگی چندروزہ ہے اور شباب اس سے بھی زیادہ چندروزہ ہے:

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے　　　دو گھڑی اور ہے بہار شباب

(سرودِ شبانہ)

''سرودِ شبانہ'' ۔''تہہ نجوم'' ۔'' یاس'' اور'' ایک منظر'' فیضؔ کی فن کاری اور مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان نظموں میں ایک پراسرار خاموشی اور معنی خیز سرگوشی ہے۔ پرسکون اور خواب آور مناظر شاعر کی روح کی طرح بوجھل اور نڈھال ہیں۔ لیکن ان مناظر کی افسردگی اور اضمحلال میں سرگوشیاں سنائی پڑتی ہیں۔ ان نظموں میں شاہراہوں کا تجسس ہے اور یہی نظمیں اس عبوری دور کی نشانی ہیں جہاں شاعر' شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بنتاہے۔ ان نظموں کا حسن وسکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔'' سرودِ شبانہ'' میں شاعر نہ صرف عالم خود فراموشی میں ہے بلکہ اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اپنے گردوپیش کے منظر سے ہم آہنگ ہے۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر

چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

کہکشاں نیم وانگاہوں سے

کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز

سازِ دل کے خموش تاروں سے

چھن رہا ہے خمار کیف آگیں

آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں

نظم " انجام" میں:

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں

اداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں

پھر اوٹ لے کے دامن ابر بہار کی

دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

(مرگِ سوزِ محبت)

ان نظموں میں منظر نگاری کے باوجود جس اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے بے حد بلند ہے۔" مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو"، " تہہ نجوم" "استفہامیہ اور تین منظر بھی جذبات کی مصوری کی عمدہ مثالیں ہیں۔" مرگ سوز محبت" میں ایک کشمکش کے بعد وہ اعلان کرتے ہیں کہ:

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق　　　اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

"میرے ندیم" "استفہامیہ نظم ہے۔ وہ سوالیہ نشان قائم کرتے جاتے ہیں۔ شاعر حیرت زدہ ہے کہ وہ احساسات، وہ آرزوئیں کیا ہوئیں جن سے شعر کی دنیا آباد تھی۔ جن سے فکر و عمل رنگین تھی جس کے نور سے مہ و انجم شاداب تھے۔ جن سے جنونِ عشق کی ہمت جواں تھی۔ 'میرے ندیم' تجسس پر ختم ہوتی ہے۔ وہ اگلی محبتوں کے مزار پر چراغاں کر کے دبے پاؤں نکل جاتے ہیں:

چلو کہ چل کے چراغاں کر دیں دیارِ حبیب　　　ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

فیضؔ کی شاعری ایک ایسی فضا میں پہنچاتی ہے جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کی تنہائی، بے یقینی، جانبازی، بے جہتی سبھی کچھ تھا۔ یہ بڑی غم گسار فضا تھی۔ 'میرے ندیم' ہی وہ نظم ہے جہاں فیضؔ شاعرِ محبت سے شاعرِ انسان بن جاتے ہیں۔ اب تک ان کی نگاہوں نے بقول۔ ن۔ م راشد:

" صرف حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی خواب سے چور اور لذت سے سرشار تصویریں ہی دیکھی تھیں لیکن اب وہ ان مناظر کی طرف بڑھتا ہے جو تلخ ہیں جن میں ملبوس کی سرسراہٹ اور

خواب کی ضیاپاشیاں نہیں بلکہ زندگی کی تڑپ اور پکار ہے۔ ‘

بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کے بعد نئے دروازے دوسری شاہراہ پر کھلتے ہیں۔ وہ شاہراہیں جہاں رنگین و حریری ملبوسات ہیں، نہ کیف شراب نہ خمارِ خواب سے لبریز آنکھیں نہ رخساروں کے عشرت آلود غازے نہ سرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیا‘ نہ مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں نہ مخملی باہیں اور جھلکتے ہوئے آنچل ہیں۔ یہ شاہراہ بدنما اور ٹھوس ہے۔ یہاں خاک و خون میں لتھڑے ہوئے اور نہائے ہوئے جسم‘ بازاروں میں مزدوروں کا بکتا ہوا گوشت‘ بھوک اگانے والے کھیت‘ ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب‘ آرزوؤں کی مقتل گاہیں‘ اجنبی ہاتھوں کا بے نام ستم‘ دلوں کی بے سود تڑپ اور جسموں کی مایوس پکار ہے۔

اس نئے دور کی پہلی نظم ”مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“ ہے۔ شاعر اپنی ناسمجھی کا اعتراف کرتا ہے کہ اس نے محبوب کے وجود کو‘ محبوب کی صورت کو اور اس کی آنکھوں کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ اپنے محبوب کا حصول ہی اس کی منزل تھی لیکن اسے احساس ہو چلا ہے کہ:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا　　　راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اب وہ زندگی کی بدنما حقیقتوں سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے　　　پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے　　　اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجیے

شاعر اب اطلس و کمخواب سے خون‘ پیپ‘ امراض اور ناسوروں کی دنیا میں آتا ہے۔ نظم ”کیا کیجیے“ شاعر کی مجبوری کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ ناگزیر ہے۔ وہ حسن کا قدرداں ہے۔ وہ دنیا کی تلخ حقیقتوں سے گھبرا کر بند کواڑوں پر دستک دیتا ہے۔ وہ موت و زیست کی صف آرائی‘ شہر کی فراواں مخلوق کے باوجود کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں اور جسم کے دل آویز خطوط بھی نہیں بھولتا۔ وہ شام کی سلگتی ہوئی اداسی میں چشمۂ مہتاب سے دھلی ہوئی رات کا حسن فراموش نہیں کرتا۔ وہ سوچتا ہے:

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی　　　وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر

رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار　　　صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

......

جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں　　　ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

پھر وہ عالم خیال سے افکار کی دنیا میں آتا ہے اور صدیوں سے آدم و حوا پہ جو گزر رہی ہے اسے سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے:

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق — کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جو بن جن کا — کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

پھر وہ گھبرا کر حسن و عشق کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتا ہے:

یہ بھی ہیں' ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے — لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے دل آویز خطوط! — آپ ہی کہیے' کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

......

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں — طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

(موضوع سخن)

"چند روز اور مری جاں فقط چند روز" ان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اس نظم میں انھیں ظلم و ستم کا شعور ہے جو ہندوستان کی سیاسی تحریکوں پر ڈھایا گیا۔ انھیں یقین ہے کہ ظلم کی یہ زنجیر ٹوٹ کر بکھر جائے گی:

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں — اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم — آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

بے شمار زخموں اور ناکامیوں کے باوجود فیض کو ایک نئی صبح کی آمد کا پورا یقین ہے۔" اے دل بے تاب ٹھہر" میں ان کی امیدیں قوی ہو جاتی ہیں۔

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر — صبح ہونے کو ہے اے دل بے تاب ٹھہر
جلد یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی — یہ گراں باری آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی' چھنکتی ہی رہے

یہ فیضؔ کی شاعری کی نئی آواز ہے جو نئی سمت کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن یہ آواز نہ تو کرخت ہے اور نہ ہی اس میں گھن گرج ہے۔ فیضؔ نے اپنے دل میں مچلتے ہوئے انقلابی نعروں کو شگفتگی اور نرمی عطا کی۔ یہ نرمی اور گداز اس لیے پیدا ہوا کہ غم محبت نے ان کی فکر کو غم حیات سے روشناس کروایا۔ انفرادی محبت کی حدیں اجتماعی درد سے جاملتی ہیں۔ فیضؔ نے رقیب کو ایک نئے معنی دیے۔ وہ رقیب میں درد مشترک تلاش کرتے ہیں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے — جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی — یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا — سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

فیضؔ راولپنڈی سازش کیس کے تحت 9 مارچ 1951ء کو گرفتار ہوئے اور اپریل 1955ء تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' ان ہی دنوں کی یادگار ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں فکر کی گہرائی اور فن کا کمال ہے۔ جیل کے اندر کی دنیا 'تنہائی' باہر کی دنیا کا تصور ایک نیا شعور پیدا کرتا ہے۔ فیضؔ ابتدا میں سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں تھے اور تین مہینے قید تنہائی میں کاٹے۔ کاغذ' قلم' دوات' کتابیں' رسائل' اخبار' خطوط کسی چیز کی اجازت نہیں تھی۔ بڑی اذیت کا دور تھا۔ لیکن فیضؔ کے یہاں کوئی تلخی نہیں آئی۔

13.4.1 اسلوب سخن:

فیضؔ کی شاعری میں عاشق و مجاہد کی کشمکش ہے۔ ان کی شاعری روایت و اجتہاد کی بہترین مثال ہے۔ فیضؔ نے پرانی علامتوں کو نئی معنویت دی ہے۔ صیاد' اہل قفس' گلچیں' قاتل' مقتول' اہل ستم' دار و رسن' شام و سحر اور وصل و ہجر کا استعمال انھوں نے خاص سماجی تناظر میں کیا اور نئے مفاہیم کے ترجمان بن گئے۔ فیضؔ نے جو پیکر تراشے ہیں وہ ان کے منفرد طرز ادا کی غمازی کرتے ہیں۔ زبان کے نئے سانچے انھوں نے اردو شاعری کو دیے ہیں۔ "بے صبر خواب گاہیں"، "اجنبی بہاریں"، "ترسی ہوئی شب"، "بیزار قدم"، "ہونٹوں کے سراب"، "ناکام نگاہیں"، "خوابیدہ راحتیں"، "منتظر راہیں"، "جھلسی ہوئی ویرانی"، "بے خواب کواڑ"، "درد کے فاصلے" وغیرہ۔ فیضؔ کے پاس بے پناہ تراکیب ہیں۔ فیضؔ کے یہاں بے شمار خوبصورت تشبیہات ملتی ہیں چند مثالیں دیکھیے:

سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح   یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

......

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے   شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے

......

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی   جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

......

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم   جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اسلوب کے اعتبار سے فیضؔ کی شاعری قدیم و جدید میلانات کا دلکش آمیزہ ہے۔ قدیم شاعری سے جہاں انھوں نے گھلاوٹ' جذباتی کسک' انسان دوستی' نغمگی اور فنی رچاؤ لیے وہیں عالمی ادب کے جدید رجحانات اور انگریزی رومانی شاعری کے اثرات بھی قبول کیے۔ فیض کی شاعری فلسفے کے بوجھ تلے دبی ہوئی نہیں ہے لیکن اس پر ایک مخصوص نظریے کی مہر لگی ہے۔ ان کی موضوعاتی شاعری میں

تلخی حیات اور تلخی حالات کا ذکر ہے لیکن جھنجھلاہٹ اور زندگی سے بے زاری کا احساس نہیں ملتا۔ فیض کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اورا عتدال پسندی ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے ایک بحرانی دور میں انفرادیت بر قرار رکھی۔ فیض کی شاعری میں ان کے عہد کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس میں ان کی ذات اور اس عہد کا شعور موجود ہے۔ عصری حسیت اور عرفان ذات دونوں نے فیض کی شاعری کو تقویت بخشی ہے۔ اسی میں ان کی انفرادیت ہے اور فیض کا فن پوری نسل کو متاثر کرتا ہے۔ فیض کے یہاں خارجی زندگی کے تجربے شخصی واردات بن کر اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بشارت سحر اور نوید بہار کا تصور ملتا ہے۔ فیض انسانیت کے درخشاں مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ فیض کہتے ہیں:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

13.5 نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا متن

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی
جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی تیرے حُسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جاملے
قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

13.6 نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا تجزیہ:

فیض احمد فیضؔ کی یہ مشہور نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" ان کے شعری مجموعے "زنداں نامہ" میں شامل ہے۔ فیضؔ کا یہ شعری مجموعہ ان کی قید سے رہائی 1955ء کے بعد شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل تمام نظمیں اور غزلیں جیل میں قید کے دوران لکھی گئی ہیں۔ ان میں انہوں نے جیل کے تجربات اور ذہنی وارداتوں کو بھی بیان کیا ہے۔

"زنداں نامہ" میں فیض کی بہت سی یادگار غزلیں اور نظمیں شامل ہیں لیکن ان کی نمائندہ نظموں میں "ملاقات، اے حبیب عنبر دست، اے روشنیوں کے شہر، آجاؤ افریقا اور "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" اہمیت کی حامل ہیں۔

نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" فیضؔ نے جولیس اور ایتھل روزن برگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ بعض ناقدین نے اس نظم کو جولیس اور ایتھل روزن برگ کا "نغمہ مرگ" قرار دیا ہے۔

جولیس اور ایتھل روزن برگ میاں بیوی تھے اور دونوں امریکی یہودی تھے اور کمیونزم کے نظریات سے متاثر تھے۔ امریکہ میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ دونوں دوسری عالمی جنگ کے دوران روس کے لیے جاسوسی کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ دونوں آخر وقت تک اس الزام کی تردید کرتے رہے لیکن امریکی عدالت نے دونوں کو 1953 میں موت کی سزا سنائی اور انھیں نیویارک میں موت کی سزا دی گئی۔ دنیا بھر کے کمیونسٹ حلقوں میں ان کی موت کا غم منایا گیا۔

فیض احمد فیضؔ ان دنوں جیل میں بند تھے۔ جیل میں جولیس اور ایتھل روزن برگ کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب ان کو ملی۔ وہ اس حادثے سے بے حد متاثر ہوئے اور 15 مئی 1954ء میں انہوں نے اپنی معرکۃ الآرا نظم جس کا پہلا مصرعہ: "ہم جو تاریک راہوں میں

مارے گئے" لکھی۔

اس نظم میں شاعری کے فن کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مصرعوں میں ایک خاص غنائیت اور آہنگ ہے۔ نظم کا انداز رمزیہ ہے۔ استعاروں کا استعمال نہایت عمدگی سے کیا گیا ہے۔ نظم میں سلاست وروانی پائی جاتی ہے۔

یہ فیض احمد فیضؔ کی پسندیدہ نظموں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ یہ جولیس اور ایتھل روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن اس میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ یہ نظم ان سارے شہیدوں اور سرفروشوں کے نام ہے جو اپنے وطن کی آزادی کیلئے شہید ہوئے۔ اس نظم میں رومانی عنصر بھی پایا جاتا ہے لیکن انقلابی کیفیت پوری آب وتاب کے ساتھ ملتی ہے۔

فیضؔ کی شاعری کا مرکز و محور محبت ہے خواہ وہ بنی نوع انسان سے ہو یا وطن سے ہو یا انقلاب سے۔ فیضؔ کو اس انقلاب سے جس کا وہ خواب دیکھتے ہیں ایسی ہی محبت ہے جیسے عاشق کو اپنے محبوب سے ہوتی ہے۔ یہ محبت ایسے ہی بے چین رکھتی تھی جیسے عاشق کو محبوب کی الفت بے قرار رکھتی ہے۔ وہ انقلابی تحریک کے ناگفتہ بہ حالات کا کرب سہتے ہیں اور اپنے اشعار میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ وطن کی سربلندی کی فکر انہیں بے تاب کیے رکھتی ہے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم　　دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم　　نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے　　تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی　　تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

مندرجہ بالا مصرعوں میں فیض بظاہر محبوب سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرے گلاب جیسے ہونٹوں کی محبت ہم کو پھانسی کے پھندے تک لے گئی اور باوجود اس کے ہم منتظر تھے کہ تو روشنی کا سامان فراہم کرے گا لیکن ہم نیم تاریک قید خانوں میں ڈال دیئے گئے۔ مگر ہمیں کوئی غم نہیں ہے کیوں کہ ہمارے سولی پر چڑھا دیئے جانے سے تیرے ہونٹوں کی سرخی اور دوبالا ہوگئی۔ تیری زلفیں مست آندھی کی طرح لہرانے لگیں اور تیرے ہاتھوں کے زیور اور روشنی بخشنے لگے۔

فیضؔ نے ان مصرعوں میں صنائع وبدائع کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ پہلے مصرعے میں محبوب کے ہونٹوں کو پھول سے تشبیہ دی ہے اور اسی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں ٹہنی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم　　ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم　　اپنا غم تھا گواہی تیرے حُسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم　　ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیضؔ کہتے ہیں کہ انقلاب کی جد وجہد میں جب مشکلات پیش آئیں تو ہم رکے نہیں بلکہ جہاں ممکن ہو سکا منزل کی طرف گامزن

رہے اگرچہ ہمارے دل غموں سے چور تھے لیکن لبوں پر انقلاب کے نغمے گاتے رہے۔ ہماری ذمہ داری تھی محبوب کی خوبیوں کو اجاگر کرتے رہنالہٰذا ہم اس پر مرتے دم تک باقی رہے اور انقلاب کی اچھائیاں لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

فیض نے لب و رخسار، گل و بلبل، قفس و زندان، دار و رسن اور شمع و پروانہ جیسی روایتی علامتوں کو زمانے کی ضرورت کے اعتبار سے وہ سیاسی معنی عطا کیے جو ان علامتوں کی پہچان بن گئے۔ فیض نے ان علامتوں کے ذریعہ ایک نیا مکتب شاعری قائم کیا، جہاں عشقیہ علامتوں کو سیاسی معنی عطا کر کے جدت پیدا کی ہے۔ ذیل کے اشعار میں عشق اور سیاست کے حسین امتزاج ملاحظہ ہو :

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی — تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے — ہجر کی قتل گاہوں سے سب جاملے

فیض کہتے ہیں کہ اے محبوب (انقلاب) ہماری لاکھ تدبیر کے باوجود جیسا ہم نے سوچا تھا تجھے حاصل نہیں کیا تو کوئی بات نہیں تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہم نے تجھے پانے کی تدبیر کی تھی لیکن کوئی شکوہ نہیں ہے کہ ہمارے حصے میں ہجر کی قتل گاہیں نصیب ہوئیں۔

فیض کو امریکی جوڑے جولیس اور ایتھل روز نبرگ کے آہنی عزم اور ایثار و قربانی اور اپنے اصولوں سے بغاوت نہ کرنے کے جذبے نے متاثر کیا۔ حالانکہ جب انہوں نے یہ نظم لکھی تو وہ منٹگمری جیل میں بند تھے اور خود ان کے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی تھی لیکن اپنی موت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جولیس اور ایتھل روز نبرگ کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے کہتے ہیں:

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم — اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم — مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم — جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

لیکن وہ دن دور نہیں جب انہیں قتل گاہوں سے ہمارے افکار و نظریات کے علم لے کر عشاق کے قافلے رواں دواں ہوں گے تب ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے نظر آئیں گے۔ ہم نے جان تو گنوا دی لیکن تیری دلبری، حسن و جمال اور خوبیوں کا چرچا ساری دنیا میں عام کر دیا اس طرح ہماری قربانی رائگاں نہیں گئی۔

عشقیہ واردات کو دوسرے سماجی اور سیاسی مسائل سے متعلق کر کے پیش کرنا فیض کا کمال ہے۔ فیض کی شاعری رومان کے قالب میں سیاستِ دوراں کا منظر نامہ ہے۔

13.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- فیض کا پورا نام فیض احمد خاں تھا۔ وہ 13 فروری 1911ء کو قصبہ قادر ضلع سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔

- فیض نے انگریزی اور عربی میں ایم۔اے کیا۔ درس و تدریس سے وابستہ رہے پھر فوج میں ملازمت اختیار کی۔
- انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز، امروز، ہفت روزہ لیل ونہار کے چیف ایڈیٹر رہے۔
- فیض کا انتقال 20نومبر 1984ء کو ہوا۔
- ان کی ادبی خدمات میں "نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ، سر وادی سینا، شام شہریاراں، میرے دل، میرے مسافر، نثری مضامین، خطوط کے مجموعے اور سفر نامے شامل ہیں۔
- فیض کی شاعری کی ابتدا1928 سے ہوئی۔ ان کی پہلی نظم "میرے معصوم قاتل" ہے۔
- فیض نے ابتدا میں رومانی شاعری کی لیکن جلد ہی حقیقت کی طرف راغب ہوئے۔
- فیض نے قید کے زمانے میں بہترین شاعری کی۔ "نثار میں تیری گلیوں پہ، یاد، اے روشنیوں کے شہر، ملاقات، دریچہ، درد آئے گا دبے پاؤں، وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے" یادگار نظمیں ہیں۔
- نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" فیضؔ نے جولیس اور ایتھل روزن برگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔
- بعض ناقدین نے اس نظم کو جولیس اور ایتھل روزن برگ کا "نغمہ مرگ" قرار دیا ہے۔
- فیض انقلاب سے ایسے ہی محبت کرتے ہیں جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب سے کرتا ہے۔
- فیض نے اس نظم میں شاعری کے فن کی تمام خوبیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مصرعوں میں ایک خاص غنائیت اور آہنگ پیدا کیا ہے۔ نظم کا انداز رمزیہ ہے۔ استعاروں کا استعمال نہایت عمدگی سے کیا گیا ہے۔ نظم میں سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔

13.8 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
دار	:	سولی
لالی	:	سرخی
دمکنا	:	چمکنا
قندیل	:	ایک خاص طرح کا چراغ
بھرم	:	لاج، عزت

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. فیض کا پورا نام کیا ہے؟

2. فیض کس ضلع میں پیدا ہوئے؟

3. فیض کے والد کا نام کیا تھا؟

4. فیض احمد فیضؔ کس تحریک سے وابستہ تھے؟

5. فیض کو پہلا کون سا انعام ملا؟

6. فیض کی نظم ""ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کس مجموعے میں شامل ہے؟

7. "نقش فریادی" کس کا شعری مجموعہ ہے؟

8. فیض نے کب سے شعر کہنا شروع کیا؟

9. فیض کی پہلی نظم کا نام بتائیے؟

10. "فیض احمد فیضؔ۔ تنقیدی جائزہ" کس کی تصنیف ہے؟

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. فیض کی نظموں کے موضوعات کیا کیا ہیں، بیان کیجیے۔

2. فیض نے زندان میں کون کون سی نظمیں لکھیں، مختصر تعارف پیش کیجیے۔

3. فیض کے اسلوب کی خوبیاں تحریر کیجیے۔

4. نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا مرکزی خیال کیا ہے؟ اختصار سے قلم بند کیجیے۔

5. فیض کی شاعری کی خصوصیات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. فیض احمد فیضؔ کی حیات اور کارناموں پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2. فیض احمد فیضؔ کی نظم نگاری کا جائزہ لیجیے۔

3. نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کا تجزیہ پیش کیجیے۔

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. فیض احمد فیضؔ: تنقیدی جائزہ	خلیق انجم
2. فیض احمد فیضؔ: عکس اور جہتیں	شاہد ماہلی
3. فیض نمبر، فن اور شخصیت	صابر دت (مرتب)
4. فیض نمبر، شبستان، دہلی	

اکائی 14: مخدوم کی نظم نگاری: چاند تاروں کا بن

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 مخدوم محی الدین کے حالات زندگی

14.3 مخدوم محی الدین کے ادبی کارنامے

14.4 مخدوم محی الدین کی نظم نگاری

14.4.1 عشقیہ و رومانی شاعری

14.4.2 سماجی و انقلابی شاعری

14.5 نظم "چاند تاروں کا بن" کا متن

14.5.1 نظم "چاند تاروں کا بن" کا تجزیہ

14.6 اکتسابی نتائج

14.7 کلیدی الفاظ

14.8 نمونہ امتحانی سوالات

14.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

مخدومؔ محی الدین اردو کے مقبول اور عظیم شاعر تھے۔ مخدومؔ ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعروں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے جاگیر دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کی۔ اس اکائی میں آپ مخدوم محی الدین کے حالات زندگی، ان کے ادبی کارنامے اور نظم "چاند تاروں کا بن" کے متن کے ساتھ اس کے تجزیے کا بھی مطالعہ کریں گے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مخدوم محی الدین کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- مخدوم محی الدین کے ادبی کارنامے پر روشنی ڈال سکیں۔
- مخدوم کی نظم نگاری پر تبصرہ کر سکیں۔
- نظم "چاند تاروں کا بن" کے متن کی قرات کر سکیں۔
- نظم "چاند تاروں کا بن" کے تجزیے کا مطالعہ کر سکیں۔

14.2 مخدوم محی الدین کے حالات زندگی

ابو سعید محمد مخدوم محی الدین خذری 4 فبروری 1908 کو قصبۂ اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ مخدوم کی والدہ کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش موسیٰ ندی کے مشہور طغیانی کے سال ہوئی اور اس مصیبت کے وقت ان کی عمر کم و بیش آٹھ ماہ کی تھی۔ یہ یادگار طغیانی ستمبر 1908ء میں آئی تھی۔ مخدومؔ کے خاندان کا سلسلہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے صحابہ میں سے ایک حضرت ابو سعید خذری سے ملتا ہے۔ مخدومؔ کے ددھیالی اجداد میں سے ایک صاحب رشید الدین' شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ اعظم گڈھ سے نقل وطن کر کے حیدرآباد میں ہمیشہ کے لیے سکونت پذیر ہوگئے۔ مخدومؔ کے پر دادا مخدوم الدین حیدرآباد کی مکہ مسجد میں مشہور قاری تھے۔ مخدومؔ کے نانا سید جعفر علی 1857 کی قومی جنگ آزادی کے دوران دہلی سے دکن منتقل ہوگئے اور ضلع میدک میں سکونت اختیار کی۔

مخدومؔ کے والد غوث محی الدین تعلقہ اندول میں اہلکار تحصیل تھے۔ مخدومؔ ابھی چار برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی دوسری شادی کر دی گئی۔ ان کے چچا بشیر الدین نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ مخدومؔ کے چچا نے مخدوم کو یہ بات نہیں بتائی کہ ان کی ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ مخدوم کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کی ماں زندہ ہے یا مر گئیں۔ حیدرآباد آنے کے بعد انھیں پتہ چلا کہ ان کی ماں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ان کے بطن سے ان کی ایک بہن بھی ہے۔ مخدومؔ والدہ کو اپنے گھر لے آئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ مخدومؔ کے چچا نہایت دین دار اور خدا ترس انسان تھے۔ مخدومؔ کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ مسجد میں خواندگی کے ابتدائی مرحلے سے گزرنے کے بعد اپنے دادا کی رہنمائی میں مخدومؔ نے قران شریف' سعدی کی گلستان و بوستان پڑھیں۔

مخدوم نے ابتدائی تعلیم اندول کے اسکول اور دھرم ونت اسکول حیدرآباد سے حاصل کی۔ 1929ء میں سنگاریڈی ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اسی سال چیلہ پورہ (حیدرآباد) کے شبینہ اسکول سے منشی کا امتحان امتیازی نشان سے پاس کیا۔ مخدومؔ کے چچا کی خواہش تھی کہ مخدومؔ مولوی بنیں مگر ان کی توقع کے خلاف مخدومؔ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لے لیا لیکن حاضری کی کمی کی وجہ سے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ایک سال ضائع کر کے مخدومؔ نے 1936ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اس کے بعد مخدومؔ نے اپنے

رشتہ دار پر اپنے اخراجات کا مزید بوجھ ڈالے بغیر گھر چھوڑ دیا۔ وہ ٹیوشن کرنے لگے۔ سڑکوں پر اخبار بیچتے' مقبول اداکاروں کی تصویریں بیچتے اور اپنا گزارہ کر لیتے۔ رات اکثر مسجد میں گزارتے۔ مخدوم کی شادی 22 اگست 1933ء کو ان کی چچازاد بہن رابعہ بیگم سے ہوئی۔ جن سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔

1934ء میں مخدوم نے بی۔ اے اور 1936ء میں ایم۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کی تکمیل کے بعد وہ دفتر دیوانی ملکی ومال میں تھرڈ گریڈ کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ 1939ء میں مخدوم کا تقرر سٹی کالج میں بحیثیت استاد ہوا۔

1941ء میں انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1940ء میں مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری چنے گئے تھے۔ 1943ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ تشکیل مخدوم کی رہنمائی میں عمل میں آئی۔ 1945ء میں انھوں نے ایک کل ہند کانفرنس کا اہتمام کیا۔ جو بے حد کامیاب رہی۔ 1942ء سے 1946ء تک کا زمانہ ریاست حیدرآباد میں ایک طوفانی دور تھا۔ مخدوم خود کو انقلابی سرگرمیوں کے لیے وقف کر چکے تھے وہ ٹریڈ یونینوں کے ذریعے مزدوروں کو متحد کرنے لگے۔ انھوں نے راج بہادر گوڑ' کے ایل مہندرا' حیدر حسن' جواد رضوی اور غلام حیدر کے ساتھ مل کر اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ 16 اگست 1946ء کو کل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت مخدوم محی الدین روپوش تھے' کیوں کہ ان کی گرفتاری کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ مخدوم کی غیر قانونی سرگرمیاں 1951ء تک جاری رہیں۔

حصول آزادی کے بعد ملک میں پہلی بار عام انتخابات 1952ء میں منعقد ہوئے۔ مخدوم اسمبلی اور پارلیمنٹ دونوں کے لیے امیدوار تھے۔ اپنی مقبولیت کے باوجود وہ الیکشن ہار گئے۔ 1956ء میں وہ قانون ساز کونسل کے امیدوار بنے اور مجلس قانون ساز آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے 1952ء سے 1955ء تک مخدوم نے چین' سوویت یونین' مشرقی یورپ کے ممالک اور آفریقہ کا دورہ کیا۔ اکتوبر 1968ء میں مخدوم نے سوویت یونین کا سفر کیا اور تاشقند' سمرقند اور بخارا کی بھی سیر کی۔

24 اگست 1969ء کو ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ وہ ان دنوں دلی میں تھے۔ 25 اگست 1969 کی شام کو آٹھ بج کر بارہ منٹ پر مخدوم کا انتقال ہو گیا۔ مخدوم کی میت دلی سے حیدرآباد لائی گئی۔ 26 اگست 1969ء کو ان کی تدفین حضرت شاہ خاموش کے قبرستان میں ہوئی۔

مخدوم کا پہلا شعری مجموعہ "سرخ سویرا" 1944ء میں اور گل تر 1961ء میں شائع ہوا۔ انتخاب کلام مخدوم (1939) ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد، انتخاب کلام مخدوم (1952) انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ' مخدوم اور کلامِ مخدوم (1972) کتب پرنٹرز وپبلشرز کراچی نے اور بساط رقص (1966) (جس میں سرخ سویرا اور گل تر کی نظموں کے علاوہ کچھ نئی نظمیں شامل ہیں) جشن مخدوم کمیٹی حیدرآباد نے شائع کیا۔

14.3 مخدوم محی الدین کے ادبی کارنامے

1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد ہی حیدرآباد میں بھی نوجوان' ادیبوں کا ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا جو باقاعدہ

انجمن میں شامل تو نہیں تھے لیکن اس کے اغراض و مقاصد سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان ادیبوں کی محفلیں نامور شاعر سروجنی نائیڈو کے مکان گولڈن تھریشولڈ (عابڈز) میں ہوا کرتی تھیں۔ ادیبوں کے اس گروہ کے روح رواں مخدوم محی الدین تھے۔ سروجنی نائیڈو ان نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ مخدوم کے ساتھ سوریہ (سروجنی نائیڈو کے فرزند) سبط حسن، اختر حسین رائے پوری، جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ۔ عالم خوندمیری، مانک لال گپتا، جواد رضوی اور اونکار پرشاد شامل تھے۔ یہ لوگ "کامریڈ اسوسی ایشن" میں شامل ہو گئے۔

کمیونسٹوں کی کوششوں سے تلنگانہ کے دیہاتوں میں بغاوت بھڑک اٹھی تھی۔ مخدومؔ اس تلنگانہ تحریک کے ہیرو تھے۔ حیدرآباد کے ہندوستان سے الحاق کے بعد بغاوت کی یہ آگ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہو گئی۔ مخدومؔ مسلح جدوجہد جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ وہ چین کی طرح آزادی حاصل کرنے کے حامی تھے۔ مخدومؔ کو مہینوں روپوش ہونا پڑا۔ 1951ء میں مخدوم، راج بہادر گوڑ اور دوسرے کمیونسٹ قائدین گرفتار کر لیے گئے۔ 1952ء میں لوک سبھا کے پہلے انتخابات کے پیش نظر تلنگانے میں مسلح بغاوت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ جنوری 1952ء میں مخدوم قید سے رہا ہوئے اور انتخابات میں حصہ لیا۔ وہ الیکشن ہار گئے۔ بعد میں ضمنی انتخابات میں مجلس قانون ساز کے لیے نلگنڈے کے حلقہ حضور نگر سے منتخب کر لیے گئے۔

1953ء میں انھیں عالمی ٹریڈ یونین فیڈریشن بھیجا گیا جس کا مستقر ویانا تھا۔ جہاں انھیں ممتاز سماجی اور سیاسی کارکنوں، امن کے مجاہدوں، شاعروں، ادیبوں، اسکالروں اور مختلف سیاسی جماعتوں اور سماجی طبقات کے نمائندوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ انھوں نے سوویٹ یونین، چین، مشرقی یورپ کے ممالک اور متعدد افریقی ممالک کا دورہ کیا۔ 1954ء میں مخدوم کل ہند ٹریڈ یونین کانگریس کے کلکتہ میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کے لیے ہندوستان واپس آئے۔ اس اجلاس میں انھیں کل ہند ٹریڈ یونین کانگریس کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مخدومؔ کو سارے ہندوستان کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ 1957ء میں مخدوم محی الدین پھر ضلع میدک سے پارلیمنٹ کے لیے چناؤ میں امیدوار تھے۔ مگر منتخب نہ ہو سکے۔ وہ ریاست کی مجلسِ قانون ساز کے لیے منتخب ہوئے اور اپنے انتقال تک کمیونسٹ اراکین اسمبلی کے قائد اور قائدِ حزب اختلاف کی حیثیت سے کارگزار رہے۔

14.4 نظم نگاری کی خصوصیات

14.4.1 عشقیہ و رومانی شاعری:

مخدوم کی شاعری کی ابتدا 1923ء کے لگ بھگ ہوئی جب وہ جامعہ عثمانیہ میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ مخدوم فطری شاعر تھے، ان کا فن اکتسابی نہیں وجدانی تھا۔ انھوں نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی۔ علم عروض سے باقاعدہ واقفیت حاصل نہیں کی۔ ان کی پہلی نظم " پیلا دوشالہ " ہے۔ مخدوم کی یہ نظم کافی مقبول ہوئی۔ پہلی مطبوعہ نظم " طور " ہے جو رسالہ " ایوان " (مدیر مجنوں گورکھپوری) میں 1933ء میں شائع ہوئی۔ مخدوم کے ابتدائی کلام پر جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

مخدوم کی ابتدائی شعری تخلیقات میں ان کی غنائی نظمیں " تلنگن "، " انتظار "، " ساگر کے کنارے "، " لمحہ رخصت "، " جوانی "، " وہ "، " آتش کدہ اور پشیمانی قابل ذکر ہیں۔ " ساگر کے کنارے " میں شاعر نے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے ایک گاؤں کی منظر کشی کی ہے " تلنگن " میں مخدومؔ نے گاؤں کی کم عمر حسینہ کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ اس لڑکی کو " دختر پاکیزگی " اور " دشت کی خود رو کلی " کہتے ہیں۔

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی

اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو ' گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا' بانکی تلنگن گائے جا

دختر پاکیزگی' نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خود رو کلی تہذیب نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در

اس نظم میں گاؤں کی لڑکی کے لیے اور گاؤں کے باشندوں کے لیے ایک احترام کا جذبہ نظر آتا ہے۔ان نظموں سے محسوس ہوتا ہے کہ مخدوم ؔکا محبوب خیالی نہیں ارضی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے شاعر نے واقعی محبت کے درد کو محسوس کیا ہے۔ نظم " لمحہ رخصت" میں مخدوم ؔکا محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب سے بالکل مختلف ہے جو ستانے اور تڑپانے کے گر جانتا ہے۔

مخدوم ؔکے محبوب میں معصوم کیف ہے جسمانی رغبت نہیں ہے۔ فطری تقاضے ہیں' بے اعتدالی نہیں ہے۔اسی طرح انتظار یا عالم ہجر میں نہ آہوں کا دھواں ہے اور نہ فغاں کے شعلے ہیں۔ یہاں بھی ضبط ہے' تحمل ہے۔ یہ ضبط و تحمل اسی وقت آسکتا ہے جب شاعر کو اپنی محبت پر بھرپور اعتماد ہو۔

نظم " آتش کدہ" میں شاعر خود مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔اس میں خودداری ہے۔ وہ اپنی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ بڑی حد تک نرگسیت (خود پسندی) کا شکار نظر آتا ہے۔ لیکن یہ محبوب زمین سے جڑا ہوا حقیقی انسان ہے۔ مخدوم ؔکی رومانی نظمیں ان کے صحت مند ذہن کی پیداوار ہیں۔یہ وہ عاشق ہے جس کی ٹھنڈی سانس پر نوآغاز کلیاں اور خوشبودار پھول ملول ہو جاتے ہیں۔ رات کی تنہائیوں میں یہی عاشق اپنی محبوبہ کا بت بنا کر پوجتا ہے اور فردوسِ خیال میں گیتوں کے جال بنتا ہے۔

سرخ سویرا میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور انقلابی بھی۔ لیکن مخدوم ؔکی رومانی شاعری کی عمدہ مثالیں اس شعری مجموعے میں ملتی ہیں۔ غنائی نظموں میں "وہ"، "جوانی"، "ٹوٹے ہوئے تارے"، " آسمانی لوریاں"، "پچھلے پہر چاند سے"، "یاد ہے" اور "زلف چلیپا" اہم ہیں۔

مخدوم ؔکی رومانی نظموں میں ایک طوفانی محبت کا جوش ہے۔واقعات کے پس منظر کی تصویر کشی بھی ہے' خارجی دنیا اور نظموں کے کرداروں کی داخلی کیفیت کی کشمکش بھی ہے۔ محبوب کی نگاہوں کی بجلیاں' تبسم کی مٹھاس' موسیقی کی تانیں اور بدن کو جلانے والی آگ بھی ہے لیکن یہ اردو شاعری کے اس رومانی رجحان سے مختلف ہے جس کی نمائندگی اختر شیرانی جیسے رومانی شعرا کرتے تھے۔ مخدوم ؔکی نظموں میں

محبوب سے گفتگو اور راز و نیاز کا اظہار راست نہ سہی سرگوشیوں میں ہے' وہ اپنے دل کی بات کہہ جاتے ہیں اور دونوں اسی سماج کا کردار نظر آتے ہیں۔ نظم " انتظار" تک آتے آتے مخدومؔ کی نظموں کا رومانی رنگ دھیما پڑتا جاتا ہے۔ نظم کی نغمگی محبوبہ کے انتظار میں بے چین انسان کے جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ مخدومؔ کے یہاں دل گرفتگی اور ایک طرح سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم کا مشہور شعر ہے۔

رات بھر دیدۂ نم ناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

نظم " برسات" میں مناظر قدرت کی تصویر کشی نہیں ہے۔ وہ تنہائی سے چھٹکارا پانے 'زندگی کی لذتوں اور احباب کی محفلوں کی طرف لوٹنے کی آرزو کر رہا ہے وہ دوراہے پر کھڑا سوچ رہا ہے کہ رہبانیت کی طرف جاؤں یا عشق و عشرت کی طرف۔ وہ اعلیٰ مقصد کی تکمیل کو ترجیح دیتا ہے۔ جو اس نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ سرخ سویرا کی اشاعت کے سترہ برس بعد مخدوم کا دوسرا مجموعہ کلام " گل تر" اگست 1961ء میں شائع ہوا۔

مجموعہ " گل تر" میں اپنے افکار کے نتائج اخذ کرتے ہوئے اور ناکام امیدوں پر افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے مخدوم پھر محبت کے موضوع کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ مگر اب ذہنی پختگی اور دانش مندی' ان کو شاعری اور کائنات' تخلیق اور زندگی کے نامیاتی تعلق کو ہمیشہ نظر میں رکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

مخدومؔ کی رومانیت اب اونچی سطح کی تھی۔ محبت اب انفرادی جذبہ یا دو شخصیتوں کا ملاپ نہیں تھی بلکہ مخدومؔ نے محبت کی ہمہ گیری اور عالم گیریت کو محسوس کر لیا تھا۔ اور محبت کو سارے عالم پر محیط جذبہ سمجھنے لگے تھے۔

نظم " چارہ گر" انھوں نے اپنے سماجی شعور کی پختگی کی اس منزل پر پہنچ کر لکھی جہاں وہ اپنے ذہنی ارتقا سے مطمئن ہو کر زندگی اور کائنات کے متعلق اپنے شعور کی گہرائیوں سے خیالات کے موتی چن چن کر لا سکتے تھے۔ اس نظم کا موضوع وہی ازلی و ابدی واقعہ محبت ہے جو ہر دور میں ہر نظام و معاشرے میں موجود رہا ہے۔ ازل تا ابد دو بدن پیار کی آگ میں جل رہے ہیں۔ پیار حرف وفا ہے۔ پیار ان کا خدا ہے۔ پیار چاہنے والوں کی چتا ہے۔ سماج اور معاشرہ کوئی بھی ان کو بچا نہ سکا۔ کوئی ایسا چارہ گر پیدا نہ ہو سکا جس کی زنبیل میں نسخہ کیمیائے محبت ہو اور جو علاج و مداوائے الفت جانتا ہو۔ محبت کی یہی ہمہ گیری' جاں سپردگی اور بے نفسی اس کو جدوجہد کے مماثل بناتی ہے۔

"آج کی رات نہ جا" میں مخدوم لمحۂ موجود میں' جینے اور اس سے بھرپور لطف اٹھانے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ زندگی کو اس کے روشن اور تاریک پہلوؤں کے ساتھ قبول کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے

آج کی رات نہ جا

مخدوم کہتے ہیں کہ زندگی زندہ رہنے اور مسکرانے کے لیے ہے۔ اس نظم کی فضا رومانی ہے اور شاعر نے زندگی کے حقیقی تجربوں کو اشعار میں ڈھالا ہے۔

مخدوم کی نظم "رقص" بھی محبت سے منسوب ہے۔ اس نظم میں سرشاری اور مستی کی کیفیت ہے۔ اس کا خاص وصف ترنم ہے۔ آزاد نظم کے فارم میں کہی جانے والی اس نظم میں ترنم اور رواں بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں لفظوں کی تکرار سے جھنکار پیدا ہوتی ہے اور ایک صوتی آہنگ ہے جو موسیقیت پیدا کرتا ہے۔ اس نظم کا تمام تر حسن ایمائیت' اشاریت' علامت اور اختصار میں ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں مخدوم نے تین الفاظ کا استعمال کیا ہے یعنی روپ' رنگ اور راگ پھر ان لفظوں کی تجسیم کی ہے۔ روپ اور رنگ کو چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوئی اور سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیوں سے مشکّل کیا گیا اور راگ تیسرے منظر میں مہکتے بدن' لچکتی کمر اور بہکتے قدم سے تشکیل پا رہا ہے۔ مخدوم نے نئی اور اچھوتی تراکیب کا استعمال کیا۔ "صدائے تیشہ" اور "بساط رقص" کی تراکیب اردو شاعری کی عمدہ تراکیب میں سے ہیں۔ (مخدوم نے اپنے کلیات کا نام "بساط رقص" اسی نظم سے لیا تھا)

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہ کن کی جیت ہو

نظم دعا پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں ہندو دیومالا کا خدائے محبت - کام دیو - بھی ہے اور مشرق وسطیٰ کی رزمیہ شاعری کا عاشق ہیر و فرہاد بھی ہے۔ مخدوم ایک انفرادی جذبۂ محبت کے اظہار کو ایک عالمی اور ابدی مفہوم دے کر اسے آفاقی تصور عطا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ احساس کی رات' سناٹا' جانِ غزل' خواہشیں' وصال اور وقت بے درد مسیحا" کا موضوع بھی محبت ہے۔ مخدوم نے اندرا دھن راج گیر جی کی دو نظموں کا انگریزی سے ترجمہ کیا لیکن یہ دراصل اندرا دھن راج گیر جی کی نظموں کے موضوعات پر لکھی گئیں طبع زاد نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں "فاصلے" اور "ہم دونوں" ہیں۔

نظم "احساس کی رات" میں ایک خوف ہے کہ وہ کہیں محبت سے محروم نہ ہو جائے کیوں کہ ہوس کی یلغار ہے' دھماکے اور بگولے ہیں۔ اسے خوف ہے کہ شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگین قشقہ اور رنگ جبیں کہیں اڑ نہ جائے۔ نقش و فامٹ نہ جائے اور یہ بجتا ہوا ساز چپ نہ ہو جائے۔ اس نظم کی فضا افسردہ ہے۔ وسوسے اور خدشات ہیں لیکن آرزو بھی ہے۔

میرے دل اور دھڑک
شاخِ گل
اور مہک اور مہک اور مہک

"احساس کی رات" کا آغاز ایک اندیشے سے ہوتا ہے
مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات

نظم "وقت بے درد مسیحا" میں مخدوم نے اسی موضوع کو آگے بڑھایا ہے اور بڑی حد تک "چارہ گر" کے سوالوں کا جواب دیا ہے۔

مخدومؔ اپنی آخری رومانی نظموں میں ایک تشکیک اور افسردگی کا شکار ہو گئے تھے۔ نظم " فریاد " میں روحانی اکیلے پن کی شکایت ہے۔ایک دوسرے کو سمجھ نہ پانے کا گلہ ہے۔وہ محبت کے قائل تھے۔محبت پر ان کا ایقان مضبوط ہوتا گیا۔ نظم " لخت جگر " میں لکھتے ہیں۔

محبت کو تم لاکھ پھینک کر آؤ گہرے کنویں میں
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر
کبھی گھپ اندھیرے کی پگلی ہنسی بن کر
پیچھا کرے گی

بساط رقص کی آخری دو نظموں " واسوخت " اور " رُت " کا لہجہ مایوسی میں ڈوبا ہوا ہے۔

شاعر جو اپنی ابتدائی نظموں میں اعتماد وفا اور اعتماد محبت کی ترجمانی کرتا ہے وہ استفہامیہ لب و لہجہ اختیار کرتا ہے۔شکوک و شبہات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بیش تر مسائل رجائی انداز میں سلجھانا چاہتا ہے لیکن ایک اضطراب ایک بے چینی ہے مگر وہ ضبط کا دامن کہیں نہیں چھوڑتا۔

اس کیفیت کو شاذ تمکنت اس طرح واضح کرتے ہیں

" مخدوم کی شاعری کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(1)تراشیدم (2)پرستیدم (3)شکستم

'طور' سے ' جز تیری آنکھوں تک' شاعر تراشیدم اور پرستیدم کے دل نواز مراحل سے گزرتا رہا جہاں اس نے چاہا اور چاہا گیا۔بساط رقص کی آخری نظموں " واسوخت " اور " رت " کا لہجہ یکسر بدلا ہوا ہے جسے ہم شکستم سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن سراسر غنائی نظموں میں بھی مخدومؔ کے خیالات کا عکس صاف نظر جھلکتا ہے اور ایک ترقی پسند شاعر پورے وجود کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

14.4.2 سماجی و انقلابی شاعری:

مخدومؔ کی ابتدائی تخلیقات میں سماجی موضوعات شامل ہو گئے۔ان کی پہلی سیاسی نظم " جنگ " ہے۔ جس کو سبط حسن نے فاشزم کے خلاف اردو کی پہلی صدائے احتجاج قرار دیا۔1935 میں جرمنی نے حبشہ کے خلاف غاصبانہ جنگ چھیڑ دی تھی۔ساری دنیا کی جمہوریت پسند طاقتوں نے اس حملے کی مذمت کی تھی۔ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ 1936ء لکھنؤ میں اس حملے کے خلاف قرارداد منظور کی گئی تھی اور حبشہ کے عوام اور ان کی جدوجہد آزادی کی حمایت کی گئی تھی۔ نظم "جنگ" اخبار"پیام"(مدیر قاضی عبدالغفار) کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھی۔اس سے قبل پہلے صفحے پر صرف میر عثمان علی خاں کا کلام ہی شائع ہوا کرتا تھا۔اس نظم میں مخدومؔ نے تباہی و بربادی کی تصویر کھینچی ہے۔

" جنگ " کی تخلیق کے بعد مخدومؔ سماجی و سیاسی موضوعات کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ہسپانیہ کی جنگ کے پس منظر میں مخدومؔ نے نظم " دھواں " لکھی۔

دھواں کے کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے نظم "اندھیرا" لکھی جو مخدومؔ کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ مخدومؔ نے ' دھواں ' کے ہی موضوع کو آگے بڑھایاہے۔ شاعر ویرانی اور فسطائیت کے ہاتھوں پھیلی ہوئی تباہی ' بربادی اور موت کی دہشت ناک تصویر کھینچتا ہے۔ اسے ساری دنیا دہشت زدہ نظر آتی ہے۔ پوری نظم ایک تصویر معلوم ہوتی ہے۔

مخدومؔ نے یہ نظم کسی مخصوص جنگ کے خلاف نہیں لکھی تھی بلکہ جنگ کے خلاف ابدی صدائے احتجاج بلند کیا تھا۔ اس نظم کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ شاعر نے کسی مخصوص واقعے 'کسی مخصوص ملک اور عوام کو موضوع نہیں بنایا بلکہ آزادی کے متوالے سبھی مجاہدوں کی آرزوؤں کی عکاسی کی ہے۔ "اندھیرا" مخدومؔ کی بہت ہی مقبول نظم " جنگ آزادی " کا پیش خیمہ تھی۔ " جنگ آزادی " نے مزدوروں اور محنت کشوں میں ایک انقلابی ترانے کی حیثیت اختیار کرلی تھی ۔ یہ انقلاب صرف ہندوستان کے محنت کش اور مزدوروں کی آرزوؤں اور خوابوں کا گہوارہ نہیں تھا کیوں کہ مخدومؔ کسی خاص نسل و قوم سے مخاطب نہیں ہیں بلکہ ایک عالم گیر انسانیت کے علم بردار بن جاتے ہیں۔

یہ جنگ ہے جنگ آزادی

آزادی کے پرچم کے تلے

اس جنگ میں ہندوستانی عوام اکیلے نہیں ہیں۔ متعدد ملکوں کے باشندے مظلوم ہندوستانی عوام کے ساتھ بین الاقوامی یگانگت کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔

دسری جنگ عظیم کے زمانے میں روس پر جرمنی کے حملے سے پہلے مخدومؔ نے نظم " سپاہی " لکھی۔ ہندوستان برطانوی حکومت کے زیر اثر تھا اور عوام کی مرضی کے خلاف ہندوستانی سپاہیوں کو عالمی جنگ میں دھکیلا جارہا تھا۔ ہندوستانی نوجوانوں پر ایک تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔ مخدومؔ محی الدین نے ہندوستانی سپاہی کو مخاطب کرکے نظم " سپاہی " لکھی جو غیروں کے مفاد کی حفاظت کے لیے جنگ پر روانہ ہورہا تھا۔

جانے والے سپاہی سے پوچھو

وہ کہاں جارہاہے

قوم کی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور سپاہی کو وہ آنے والے واقعات کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس کی ماں یا بیوی بے سہارا ہورہی ہے' خاندان کی پرورش کرنے والے کے بغیر بچے بھوکے سونے پر مجبور ہورہے ہیں۔ موت کا اندیشہ ہے۔ مخدومؔ موت کی تجسیم میں قاری کے پورے حواس بیدار کرتے ہیں۔ چِتا کا تصور ' لاش جلنے کی بو ' زندگی کا چلاّنا... محاذ جنگ پر جاتے ہوئے سپاہی کو پیش آنے والے واقعات جہاں سہمے ہوئے تارے ' دریائے خوں میں غرق جوانی اور ایسی عورتیں ہیں جن کی زندگی میں سناٹا ہے اور تنہائی جن کا مقدر ہے۔

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آرہی ہے
زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو

مخدوم کی شاعری میں زوال آمادہ معاشرے میں غیر منصفانہ نظام کی مذمت اور انسانوں پر مسلط کردہ جنگ کے خلاف نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ مخدومؔ کی ایسی نظمیں جن میں ان کا سماجی شعور واضح ہے' ان میں 'حویلی' ۔'مشرق' ۔' باغی' اور تلنگانہ قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کی عوام غیر ملکی ظالموں کے علاوہ خود اپنے زمیں داروں' راجاؤں' نوابوں' سرمایہ داروں اور سود خوروں کے جبر و تشدد کا شکار تھے۔ ترقی یافتہ مغرب اور گہری نیند میں ڈوبے ہوئے مشرق کے درمیان ایک واضح فرق ہے۔ جب تک مشرق کو اپنے استحصال اور پسماندگی کا احساس نہ دلایا جائے وہ آزادی حاصل نہیں کرسکتے۔ مخدوم نظم " مشرق " میں نہ صرف تلخ افکار کا اظہار کرتے ہیں بلکہ 'نیا آدم' کا تصور بھی دیتے ہیں۔

مخدومؔ کہتے ہیں مشرق' مغربی چیلوں کا لقمہ ہے' ایک قبرستان ہے' ایک بھٹکتی روح ہے' ماضی کا ایک بے رنگ و بے روح خول ہے' ایک بے آواز ڈھول ہے' ایک مسلسل رات ہے جس کی کوئی صبح نہیں ہے۔ مخدومؔ کو یہاں مسلسل غلامی' بھوک' غریبی' بے روزگاری' ظلم واستبداد' زندگی کی قدامت اور بجھا ہوا پن نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا' نیا آدم بنایا جائے گا

مخدومؔ نے اس خیال کو زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنی نظم ' جہاں نو' میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مستقبل اس تاریک ماضی سے مختلف ہوگا۔ وہ ایک نئی دنیا کا تصور پیش کرتے ہیں۔

'حویلی' مخدومؔ کی اہم نظم ہے۔' حویلی' جاگیر دارانہ نظام کی علامت ہے۔ ایک فرسودہ سماج کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ حویلی رہزنوں کا قصرِ شوریٰ اور قاتلوں کی خواب گاہ ہے۔ اس کی چھت کے نیچے جرائم پناہ لیتے ہیں۔ اور انصاف پر کھکھلا کر ہنستے ہیں اور گناہ پر خوشیاں مناتے ہیں۔

حویلی کے آس پاس گداؤں اور بے نواوں کے گروہ' برہنہ پا اور اپاہجوں' بد قسمت کنگالوں کا ہجوم ملتا ہے جن کے دل کچلے ہوئے ہیں۔ شاعر خدائے دو جہاں سے کہتا ہے کہ ذرا اپنے شاہکار یعنی انسان کا حشر دیکھ کہ کس طرح اس کی قلب ماہیت ہوگئی کہ ملبوس دین بھی معاشرے کے کوڑھ کے دھبے چھپا نہیں سکتا۔ شاعر اس جہان نو سے جو اپنے جلو میں بجلیاں اور زلزلے لے کے آرہا ہے خواہش کرتا ہے کہ وہ ایسا نغمہ چھیڑ دے جس سے زندگی مسکرائے اور کہتا ہے۔

آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

جوش ملیح آبادی نے جنھیں " شاعر انقلاب " کہا جاتا ہے اپنی شاعری میں گرج، بجلی، تلوار، تیر، آگ، شعلے اور تباہی جیسے الفاظ استعمال کیے تھے۔ جن کا اثر ان کے بعد والے رومانی شاعروں نے بھی قبول کیا۔ اس دور میں ایسی نظمیں لکھی گئیں جن میں فرسودہ نظام کو ڈھا دینے کی ترغیب دی گئی اور اس کا متبادل کوئی نظام نو پیش نہیں کیا گیا۔ مخدومؔ کی ابتدائی نظموں میں بھی یہ رجحان ملتا ہے جس کا واضح اظہار انھوں نے نظم " باغی " میں کیا۔

سماجی ناانصافی کے خلاف مخدومؔ کی ایک خوبصورت نظم " زلف چلیپا " ہے۔" زلف چلیپا" مخدوم کی شاعری کا ایک موڑ ہے۔ یہ نظم ان کی ابتدائی نظموں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ مخدومؔ نے راست خطابت کی بجائے استعاراتی زبان کا استعمال کیا ہے۔"زلف چلیپا" کی برہمی کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہندوستان میں عیسائیوں (انگریزوں) کے اقتدار کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ سرمایہ داری کے ہاتھوں فرقِ گیتی پر رکھے کانٹوں کے تاج کا استعارہ یہ بتاتا ہے کہ ہندوستانی عوام پر ظلم کرنے والے کہاں سے آئے۔ مخدوم صاف لفظوں میں ہندو، مسلمان اور عیسائی پر کیے گئے ظلم کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مندروں، معبدوں اور کلیساؤں میں موت سے اشارہ کرتے ہیں۔

ہندوستان کی سرزمین کو وہ ایسی زمین جہاں ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے، جہاں علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے، رام و لچھمن کی زمین، کرشن کی، گوتم کی زمین، محمدؐ کی زمین، ابن مریم کی زمیں کہتے ہیں۔

مخدوم نے موضوعاتی نظمیں قحط بنگال پر " بنگال " تلنگانہ تحریک پر " تلنگانہ " لکھی۔ نظم " بنگال " میں انھوں نے نہ صرف قحطِ بنگال کی بھیانک تصویر پیش کی بلکہ انھوں نے عوام کو بلالحاظ مذہب و ملت متحد ہو جانے کی دعوت دی۔

1951ء میں مخدوم کو سنٹرل جیل حیدرآباد میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ مخدومؔ نے جیل میں نظم " قید " لکھی۔ ' قید ' میں رات کی خاموشی اور تنہائی ہے ظلم و جور کی شکایت کرنے والا شاعر شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی آواز سنتا ہے۔ اس کا دماغ چونک اٹھتا ہے۔ شبستان خیال جاگ اٹھتی ہے۔ اسے گزری ہوئی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ وہ جیل سے باہر سانس لینے والے سینکڑوں عوام کی غمگین آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے، جو جورِ شاہی اور جبر سیاست سے نڈھال ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہی عوام ایک دن دھماکہ بن جائیں گے۔ تب سلطانی رہے گی نہ قیصری رہے گی اور نہ تخت شاہی... آخری مصرعے میں اس کی اپنی سوزشِ غم کا پتہ چلتا ہے۔ نظم ہم کلامی سے شروع ہوتی ہے اور ہم کلامی پر ختم ہوتی ہے۔

مجھے غم ہے کہ میرا گنج گراں مایۂ عمر

نذر زنداں ہوا

نذر آزادئ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا؟

1958ء میں مخدومؔ نے مشہور نظم " چاند تاروں کا بن " لکھی۔ ہندوستانی معاشرے کے تاریخی ارتقا کے تین دور انھوں نے

علامتی انداز میں پیش کیے۔" چاند تاروں کا بن" اردو کی سیاسی وانقلابی شاعری کی ایک بے حد عمدہ مثال ہے۔ اس میں جذبۂ فکر اور نظریہ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک ایک لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ مخدومؔ نے موضوع کو جس ضبط' وقار احتیاط اور آہنگ کے ساتھ برتا ہے آزادی کے موضوع پر لکھی گئی نظموں میں یہ سب سے عمدہ نظم ہے۔ اس نظم میں مخدوم کی سیاسی وعوامی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔

"سناٹا" مخدوم کی مختصر لیکن پر اثر نظم ہے۔ شاعر گردو پیش کے ماحول میں کوئی ہلچل کوئی دھڑکن محسوس نہیں کرتا۔ لوگ کاروباری ذہن کے ہوگئے ہیں۔ شاعر زندگی میں اضطراب، تڑپ، سچا جذبہ اور کوئی نصب العین چاہتا ہے اس لیے وہ کہتا ہے۔

کوئی رخسار تو چمکے کوئی بجلی تو گرے

گل تر کے بعد "بساطِ رقص" کلیات کی صورت میں دسمبر 1966ء میں شائع ہوا۔ بساط رقص کی اشاعت کے تین برس بعد تک مخدوم بقید حیات رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے " دُرّہ موت"، "مارٹن لوتھر کنگ"، "چپ نہ رہو"، "ملاقات" لکھیں۔ "درہ موت" کا ذیلی عنوان " ویت نام کے پس منظر میں" ہے۔

مخدومؔ کو کبھی ویت نام جانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن انھوں نے اس نظم میں تباہی وبربادی کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے جیسے انھوں نے خود مشاہدہ کیا ہو۔ وہ بالراست امریکی سپاہیوں کی درندگی کے بارے میں نہیں کہتے' سمندر پار سے آنے والوں کی مذمت نہیں کرتے قاری خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ اس ہری بھری وادی کو درہ موت میں کس نے تبدیل کیا' درہ موت کے فوراً بعد انھوں نے مختصر سی نظم " مارٹن لوتھر کنگ" لکھی۔ مخدوم نے علامت اور استعاروں سے کام لیے بغیر صحافتی انداز میں قاتلوں کی مذمت کی ہے۔

" چپ نہ رہو" کانگو کے قائد وزیر اعظم اور آزاد آفریقہ کی علامت پیٹرس لوممبا کے قتل پر لکھی گئی نظم ہے۔ اس کا اختتام بھی احتجاج پر ہوتا ہے۔

مخدومؔ محنت ومحبت کے شاعر ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں: صدائے تیشہ کامراں ہو' کوہکن کی جیت ہو

14.5 نظم "چاند تاروں کا بن" کا متن

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مردوزن

مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خار زارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا
کچھ امامان صد مکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

14.5.1 نظم چاند تاروں کا بن کا تجزیہ:

نظم "چاند تاروں کا بن" مخدوم محی الدین نے 1958ء میں لکھی۔ یہ آزاد نظم کی ہیئت میں لکھی گئی ہے جو چار بندوں پر مشتمل

ہے ان کی اس نظم میں موضوع کی تلخی کے باوجود اسلوب میں نغمگی اور غنائیت پائی جاتی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے ملک سے بیرونی قابض قوت یعنی کہ انگریزوں کو نکالنے اور دیسی راجاؤں سے چھٹکارا پانے کا تصور پیش کیا ہے۔ مخدوم محی الدین نے نظم میں ذیلی عنوان ''آزادی سے پہلے' بعد اور آگے '' دیا ہے اور ہندوستانی معاشرے کے تاریخی ارتقا کے تین ادوار کے بارے میں علامتی انداز میں اظہار کیا ہے۔ پیرائے اظہار کی وجہ سے ایک اچھوتی اور متاثر کن نظم ہے۔ نظم کا لہجہ انقلابی اور پر جوش نہیں ہے۔ مخدومؔ نے روایتی نعرہ بازی سے کام نہیں لیا۔ مخدومؔ ترقی پسندوں کے کارواں میں شامل تھے۔ لیکن اپنے منفرد انداز کی بنا پر سب سے الگ تھلگ تھے۔ ان کی آواز منفرد تھی چاند تاروں کا بن اس کی روشن مثال ہے۔

مجاہدین آزادی موم کی طرح پگھل پگھل کر وطن کے اندھیرے کو روشنی میں بدل دینے کی کوشش کرتے رہے۔ آزادی کے دیوانوں نے سختیاں برداشت کیں' تشنگی تھی مگر تشنگی میں بھی سرشار تھے۔ مرد وزن پیاسی آنکھوں سے آزادی کا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن خوابوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا' مستیاں' مدہوشیاں اور بانکپن سب ختم ہو گئے۔

دوسرے حصے میں وہ کہتے ہیں رات کے اندھیرے میں جو بدن دہک رہے تھے جگمگا رہے تھے وہ اجالا ہوتے ہی صبح دم دیوار غم بن گئے کیوں کہ رات کی شہ رگوں میں اچھلتا لہو جوئے خون بن گیا۔ مخدومؔ کا اشارہ قیامت خیز فسادات کی طرف ہے۔ جو حصول آزادی کے مرحلے پر اور بعد دیکھے گئے۔ دیوارِ غم تقسیم کے المیے کی علامت ہے۔ خار زارِ الم بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ رات نے جاتے جاتے خون کی ندیاں بہا دیں۔ وہ خون جو رات کی شہ رگوں میں اچھل رہا تھا۔ یعنی جدوجہد آزادی کا جوش وخروش غلط سمت مڑ گیا۔ اور یہ سب کچھ امامانِ صد مکر وفن نے کیا۔ جن کی سانسوں میں سانپ کی زہریلی پھنکار تھی۔ جن کے سینوں میں نفرت کا کالا دھواں تھا۔ انھوں نے اپنی نوک زبان سے نور سحر کا خوں پی لیا۔

آخری بند میں شاعر ماضی سے حال میں لوٹ آتا ہے۔ اب جو کیفیت ہے اس میں رات کی تلچھٹیں بھی ہیں۔ اندھیرا ابھی ہے اور کچھ اجالا بھی ہے۔ اندھیرا پوری طرح سے ختم نہیں ہوا۔ یہ اندھیرا روس میں طلوع اشتراکیت کے بعد بھی نظر آتا ہے۔ آفریقہ' ایشیا اور لاطینی امریکہ کے بیسوں ممالک میں آزادی پانے کے بعد بھی ہے۔ مخدومؔ جدوجہد کو مکمل نہیں سمجھتے۔ انسانوں کو اپنے دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلنا ہے۔ مخدومؔ کے سامنے ایک سفر اور مسلسل سفر ہے۔

مخدومؔ کی اس نظم کا حسن اس کی رمزیت میں چھپا ہوا ہے۔ اگر عنوان کے نیچے قوسین میں آزادی سے پہلے بعد اور آگے لکھا نہ ہوتا تو اس نظم کو سیاسی کہنا بھی مشکل ہوتا۔

نظم کا عنوان '' چاند تاروں کا بن'' یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ رات کی سیاہی میں چاند تاروں کی جھرمٹ روشنی کی علامت ہے۔ روشنی ظلمت سے بر سر پیکار ہے۔ پوری نظم میں صرف ایک جگہ لفظ وطن کا استعمال کیا گیا ورنہ پوری نظم علامتی ہے۔ پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے' جوئے خوں' افعی کی پھنکار' نفرت کا کالا دھواں' خون نور سحر' رات کی تلچھٹیں خوبصورت اچھوتی ترکیبیں ہیں۔

شعریت اور غنائیت کے اعتبار سے بھی یہ ایک اہم نظم ہے۔ پہلے تین مصرعوں میں تن' وطن' بن ان تینوں مصرعوں کے ہم

وزن و ہم قافیہ ارکان نے ایک فضا قائم کر دی ہے۔ چوتھے مصرعے میں سوال ہے۔

تشنگی تھی مگر

پہلا بند آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے تین مصرعے ہم قافیہ 'آخری دو مصرعوں میں بھی شاعر نے نون پر ختم ہونے والے قافیے باندھے ہیں۔

اس کے بعد والے بند کا پہلا مصرعہ حرفِ نون کے قافیے پر ختم ہوتا ہے۔

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

پھر دم، غم، الم اور اس کے ساتھ ردیف " بن گئے " سے خوبصورت صوتی آہنگ بنتا ہے۔ تیسرے بند کا پہلا مصرعہ پھر نون پر ختم ہوتا ہے۔

کچھ امامانِ صد فکر و فن

اس بند میں بھی دھواں، زماں کے قوافی صوتی آہنگ میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس بند کا آخری مصرعہ " خونِ نور سحر پی گئے" پورے بند کو سمیٹ لیتا ہے۔ آخری بند نغمگی، ترنم، صورت و آہنگ کی بہترین مثال ہے۔ نون اور نون غنہ کے استعمال سے اس نظم میں غنایت عروج پر نظر آتی ہے۔

اس نظم کا اختتام " چلو" پر ہوتا ہے یعنی حرکت و عمل کی ترغیب پر نظم ختم ہوتی ہے۔

14.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مخدوم کا پورا نام مخدوم محی الدین خذری ہے۔ وہ 1908 میں قصبہ اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ مخدوم نے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔
- مخدوم نے ابتدا میں سخت جدوجہد کی۔ مخدوم ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ انھوں نے شاہی کے خلاف جدوجہد کی، تلنگانہ تحریک میں عملاً حصہ لیا۔ انھوں نے سویت یونین، چین، مشرقی یورپ کے ممالک کا دورہ کیا۔ مخدوم کا انتقال 25 اگست 1969 کو ہوا۔
- مخدوم کی شاعری کی ابتدا 1923 میں ہوئی۔ ان کی پہلی مطبوعہ نظم "طور" ہے۔ ابتدا میں مخدوم نے عشقیہ و رومانی شاعری کی۔ ان کی غنائی نظموں میں تلنگن، انتظار، ساغر کے کنارے، لمحہ رخصت، جوانی، وہ آتش کدہ اور پشیمانی اہم ہیں۔
- ان نظموں میں مخدوم کا محبوب تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ یہ محبوب اردو شاعری کے روایتی محبوب سے مختلف ہے جو ستانے اور تڑپانے کی ادائیں جانتا ہے۔ بلکہ مخدوم کا محبوب کم سن و معصوم ہے۔ مخدوم نے اس دور کے رومانی مزاج سے ہٹ کر شاعری کی۔ شعری مجموعے "سرخ سویرا" میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور انقلابی بھی۔

- شعری مجموعے " گل تر" میں بھی رومانی نظمیں ملتی ہیں۔ جن میں چارہ گر، رقص، فاصلے، ہم دونوں، احساس کی رات وغیرہ اہم ہیں۔ ان نظموں میں شاعر شک وشبہات کا اظہار کرتا ہے اور استفہامیہ لہجہ اختیار کرتا ہے۔
- مخدوم کی پہلی سیاسی نظم "جنگ" ہے۔اس کے بعد انھوں نے دھواں اور اندھیرا جیسی نظمیں لکھیں۔ جن میں انھوں نے جنگ کے خلاف ابدی صدائے احتجاج بلند کیا تھا۔
- نظم " جنگ آزادی" نے مزدوروں اور محنت کشوں میں ایک نقلابی ترانے کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ جن نظموں میں مخدوم کا سماجی شعور واضح ہے وہ حویلی، مشرق، باغی اور تلنگانہ ہیں۔
- نظم " مشرق" میں وہ نیا آدم کا تصور دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ " زلف چلیپا" سے انھوں نے راست خطابت کے بجائے استعاراتی زبان کا استعمال کیا۔
- چاند تاروں کا بن، قید، سناٹا، درہ موت، ملاقات، چپ نہ رہو ان کی اہم نظمیں ہیں۔ ان ہی نظموں کی وجہ سے مخدوم کو محنت ومحبت کا شاعر کہا جاتا ہے۔
- نظم " چاند تاروں کا بن" ہندوستانی معاشعرے کے تاریخی ارتقا کے تین ادوار کا علامتی اظہار ہے۔ چار بندوں پر مشتمل یہ نظم 1958 میں لکھی گئی جو آزاد نظم کی ہیئت میں ہے۔

14.7 کلیدی الفاظ

الفاظ		معنی
تشنگی	:	پیاس
منتظر	:	انتظار کرنے والا
تل چھٹیں	:	تل میں (نیچے) بچی ہوئی شئے
جوئے خوں	:	خون کی نہر
خارزار	:	کانٹوں بھرا میدان
خندقیں	:	گڑھے
خورشید	:	سورج
دارورسن	:	سولی اور رسی

14.8 نمونہ امتحانی سوالات

14.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مخدوم محی الدین کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

2. مخدوم محی الدین کا پورا نام کیا تھا؟

3. مخدوم کے والد کا کیا نام تھا؟

4. مخدوم محی الدین کی شادی کس سنہ میں ہوئی؟

5. مخدوم کا تقرر بحیثیت لکچرر کس کالج میں ہوا؟

6. مخدوم کے پہلے شعری مجموعے کا نام کیا ہے؟

7. نظم " چاند تاروں کا بن " کس سنہ میں لکھی گئی؟

8. نظم " چاند تاروں کا بن " کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟

9. نظم چاند تاروں کا بن " کتنے بندوں پر مشتمل ہے؟

10. مخدوم محی الدین کا انتقال کب ہوا؟

14.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مخدوم محی الدین کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
2. مخدوم کی عشقیہ ورومانی شاعری پر مضمون لکھیے۔
3. مخدوم کی سماجی وانقلابی شاعری پر تبصرہ کیجیے۔
4. نظم " چاند تاروں کا بن " کے کسی دو بند کی تشریح کیجیے۔
5. نظم " چاند تاروں کا بن " کا خلاصہ پیش کیجیے۔

14.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مخدوم محی الدین کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. مخدوم محی الدین کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. نظم " چاند تاروں کا بن " کا تجزیہ پیش کیجیے۔

14.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مخدوم ایک مطالعہ	داؤد اشرف
2. مخدوم محی الدین: حیات اور کارنامے	شاذ تمکنت
3. عمر گذشتہ کی کتاب	ظفر الحسن
4. رسالہ "صبا"	مخدوم نمبر 1966
5. رسالہ " نیا آدم"	مخدوم نمبر 1970

اکائی 15: حلقہ ارباب ذوق اور اردو نظم

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا

15.3 جدید نظم نگاری کا فروغ اور حلقہ ارباب ذوق

15.4 حلقہ ارباب ذوق کا نظریہ

15.5 میراجی

15.6 ن۔م۔راشد

15.7 حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے اہم شعرا

15.8 اکتسابی نتائج

15.9 کلیدی الفاظ

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

حلقۂ ارباب ذوق کا قیام 1939ء میں عمل میں آیا۔ ترقی پسند تحریک 1936ء میں شروع ہوئی۔ ابتدا میں کئی سال تک دونوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ سالہا سال تک ترقی پسند ادیب اور شاعر، حلقے کے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ابتدائی چند اجلاسوں تک حلقۂ ارباب ذوق کا نام "بزم داستاں گویاں" رہا۔ ابتدا میں کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں تھا۔ صرف چند ادیب دوست آپس میں مل کر بیٹھنا

چاہتے تھے تاکہ ”اپنے اپنے ادب پارے“ ایک دوسرے کو سنا کر اس پر تبادلۂ خیال کریں۔ 41-1940ء میں حلقے کے ممبروں میں بیدی ' ہنس راج رہبر ' کنہیالال کپور اور بیگم محمود شامل تھے۔ میراجی نے ترقی پسند تحریک کے نقطہ نظر ” فن برائے زندگی “ سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا تھا” فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ برائے حیات کا دُم چھلا کیسا؟“۔ حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین میں یہ ایک بنیادی اختلاف تھا۔ حلقے کے ارباب ” ادب برائے ادب ' کو اہمیت دیتے تھے اور ترقی پسند مصنفین ”ادب برائے زندگی “کو۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ یہ اختلاف بڑھتا گیا۔ حلقۂ ارباب ذوق کی نظم نگاری بنیادی طور پر ”ادب برائے ادب“ کے نظریے کی حامل ہے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس کے قابل ہو جائیں گے کہ:

- حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔
- جدید نظم نگاری کے فروغ میں حلقہ ارباب ذوق کے کردار پر روشنی ڈال سکیں۔
- حلقہ ارباب ذوق کے نظریے کی وضاحت کر سکیں۔
- میراجی اور ن۔م۔راشد کی شاعری پر اظہار خیال کر سکیں۔
- حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے اہم شعرا کے کلام پر تبصرہ کر سکیں۔

15.2 حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا

حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا اتفاقی طور پر ہوئی۔ چند ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں نے یہ طے کیا کہ وہ مل بیٹھیں گے اور اپنی تخلیقات ایک دوسرے کو سنائیں گے۔ نصیر احمد جامعی اور شیر محمد اختر حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے تھے۔ پہلا جلسہ ” بزم داستان گویاں “ کے نام سے 1939ء میں منعقد کیا گیا۔ لیکن چند ہی مہینے بعد 1939ء ہی میں ”بزم داستان گویاں “ کا نام بدل کر ”حلقۂ ارباب ذوق“ کر دیا گیا۔ بزم داستان گویاں میں ظاہر ہے کہ صرف مختصر کہانیاں یا افسانوی ادب ہی پڑھا جاسکتا تھا لیکن یہ بزم جب بزم داستان گویاں سے ”حلقۂ ارباب ذوق“ بنی تو اس کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور اس میں ہر قسم کی ادبی تخلیق اور تنقید جگہ پانے لگی۔ حلقۂ ارباب ذوق اور زیادہ فعال اس وقت ہوا جب میراجی اس میں شامل ہوئے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ حلقہ 'میراجی کی شخصیت سے زیادہ متاثر ہوا یا ان کی شاعری سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں حلقے پر اثر انداز ہوئیں۔ کیوں کہ میراجی صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ نقاد بھی بہت اچھے تھے۔ حلقے کو زیادہ متحرک بنانے میں ان کی مختلف تجاویز

نے بہت بڑا حصہ ادا کیا۔ میراجی نے حلقے میں شرکت کے فوری بعد یہ تجویز پیش کی کہ حلقے میں جو تخلیقات پیش کی جائیں اس کی صرف تعریف و تحسین ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ جو خامیاں اور کوتاہیاں ہوں ان کی بھی نشان دہی کرنی چاہیے۔ یہ تجویز بڑی موثر ثابت ہوئی اور حلقہ اس پر عمل پیرا ہوا۔

15.3 جدید نظم نگاری کا فروغ اور حلقہ ارباب ذوق

حلقۂ ارباب ذوق نے میراجی کی سرکردگی میں نظم نگاری کو خاص طور پر فروغ دیا۔ جدید نظم اس وقت بہت مقبول ہو رہی تھی اور جدید نظموں کے انتخاب بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جا رہے تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق نے جدید نظموں کا ایک انتخاب " 1941 کی بہترین نظمیں" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں چوبیس (24) نظمیں تھیں۔ یہ صرف جدید شعرا کی نظموں کا انتخاب تھا۔ اس لیے اس میں کل 24 نظموں کو شامل کیا گیا۔ اس میں ترقی پسند شعرا کی بھی نظمیں شامل تھیں اور حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کی بھی۔ اس کے مرتب میراجی تھے۔ ذیل میں چند مشہور نظموں کے عنوانات اور شعرا کے نام پیش کیے جا رہے ہیں، جو اس میں شامل تھے :

"ازلی مسرتوں کی ازلی منزل" (احمد ندیم قاسمی) " انتباہ" (فیض احمد فیض) " خودکشی" (ن۔م۔راشد) " تو گر واپس نہ آئی " (جوش) "جواب تغافل " (عدمؔ) " ننھا قاصد " (اختر شیرانی) " ڈرائنگ روم " (سلام مچھلی شہری) " تیرے ہی بچے 'تیرے ہی بالے (مطلّبیؔ فرید آبادی) " انوکھا پیار " (مخمور جالندھری) "دسہرا اشنان " (شاد عارفی) " دھوبی کا گھاٹ " (میراجی) " نقش پا" (اختر الایمان) " جنت کی سیر " (مہدی علی خان) " رقص " (یوسف ظفر) " خاکے " (وشوامتر عادل)۔

کتابی صورت میں آنے سے پہلے یہ جدید نظمیں اس زمانے کے اہم اور موقر ادبی رسالوں میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان رسالوں میں "ساقی" (دہلی) " نگار " (لکھنو) " جامعہ " (دہلی) " ادب لطیف " (لاہور) "ہمایوں (لاہور) " ادبی دنیا (لاہور) "داستان " (لاہور) جیسے رسالے شامل تھے۔

15.4 حلقہ ارباب ذوق کا نظریہ

رسالوں میں ان نظموں کی اشاعت کے بعد کتابی صورت میں ان نظموں کا فروخت ہو جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ نظمیں اس زمانے میں کتنی مقبول تھیں۔ "1941 کی بہترین نظمیں " کے ابتدائیہ میں اس کے مرتب میراجی نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے کے مصنفین اور شعرا کو وہ " کل والے " اور ترقی پسند مصنفین کو " آج والے " کہتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ترقی پسند مصنفین اپنے سے پہلے کے مصنفین کو فن برائے فن کا قائل سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کے ادب کو زندگی سے تعلق نہ رکھنے والا کہتے ہیں

اور جس ادب کا زندگی سے تعلق نہ ہو وہ مفید نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند اپنے ادب کو " فن برائے زندگی " پر کاربند بتاتے ہیں اور اسے مفید قرار دیتے ہیں۔

میراجی کا استدلال یہ ہے کہ کوئی بھی " فن " اسی وقت " فن " کہلائے گا جب کہ وہ فنی تقاضوں اور فنی قدروں پر پورا اترے گا۔ جب وہ فنی قدروں کو پورا نہ کرے تو اسے فن نہیں کہا جاسکتا۔ اور جب وہ فن نہیں ٹھہر تا تو پھر اسے " فن برائے حیات " کہنا بالکل لغو بات ہے۔ وہ اسی دیباچہ میں اپنے آپ کو یعنی حلقۂ ارباب ذوق کو صحیح معنوں میں ترقی پسند کہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک " صحیح اور صحت مند ترقی پسندی مختصر لفظوں میں ' خیال افروزی کا دوسرا نام ہے۔" وہ آخر میں اس انتخاب میں شامل تمام نظموں کو ترقی پسند قرار دیتے ہیں' خواہ وہ ترقی پسند شعرا کی ہوں یا حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والوں کی ہوں یا کسی اور کی وہ لکھتے ہیں :

> "نثر اور نظم دونوں میں اصناف سخن کے متعلق اب تک حلقۂ ارباب ذوق کا نقطہ نظر یہی رہا ہے اور اس نقطۂ نظر کی وسعت بہ آسانی زندگی سے وہ ہم آہنگی حاصل کر سکی ہے جس کا اظہار آج کی نظموں کا انتخاب بھی ہے۔"

حلقۂ ارباب ذوق کا یہ انتخاب ان کی غیر جانبداری اور انصاف پسندی کا مظہر ہے۔ کیوں کہ انہوں نے باوجود نظریاتی اختلاف کے ترقی پسند شاعروں کی نظموں کو پیش کیا۔ حلقے کے جلسوں میں بھی تنقید بے لاگ اور غیر جانبدارانہ ہوتی تھی۔ موضوع کے تعلق سے جہاں تنقید ہوتی تھی وہیں ہئیت کے تجربے کیے جاتے تھے اور ان کی کامیابی اور ناکامی کا محاسبہ بھی کیا جاتا تھا۔ اسی طرح عروض اور قافیے پر بھی حلقے میں بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

"1941 کی بہترین نظمیں " کی پذیرائی ادبی حلقوں میں بہت حوصلہ افزا رہی۔

1942ء میں پھر ایک انتخاب منظر عام پر آیا۔ اس انتخاب میں بھی حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کے علاوہ ترقی پسند شاعروں کی بھی بہت سی نظمیں ملتی ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

" فرار" (ڈی۔ ایم۔ تاثیر) " زنجیر " (ن۔ م۔ راشد) " اندھیر نگری "(شاد عارفی) " بھگوان " (عبدالمجید بھٹی) " برفانی چوٹیوں سے گزرتے ہوئے سپاہیوں کا راگ " (حفیظ جالندھری) " تفاوت راہ "(میراجی) " فریاد " (مسعود پرویز) " خواب گراں " (قیوم نظر) " شکاری " (احمد ندیم قاسمی) " بے بسی " (انجم رومانی) " بسنت " (شاد عارفی) " تصور کے دھندلکے میں " (احتشام حسین) " فیصلہ " (اختر الایمان) " بھینٹ " (سلام مچھلی شہری) " سکھ میں دکھ " (مختار صدیقی) " کلرک " (مسعود قریشی) " آدرش " (میراجی) " فریب مجاز " (ماہر القادری) " آخری سجدہ " (احمد ندیم قاسمی) " ساون کا سپنا "(مسعود پرویز) " رسوائی " (مختار صدیقی)

" موت " (یوسف ظفر)" محلے " (اختر الایمان) " فردوس گوش "(یوسف ظفر)" طوائف " (معین احسن جذبی) "برسات " (ضیا جالندھری) " بھوکی جوانیاں "(مخمور جالندھری) " ساتھی "(مجید امجد) " سونے سے پہلے " (تصدق حسین خالد)" سرراہ(مکین احسن کلیم) " جوانی " (قیوم نظر)" تسلی "(طالب شیرازی) " شہنائی " (فکر تونسوی) " سویرا "(محمد صفدر)

1942ء کی نظموں کے انتخاب کے تعلق سے مرتبین نے حلقۂ ارباب ذوق کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ " جدلیاتی فلسفہ ' سیاسی کشمکش ' جنسی فشار " ان نظموں کا موضوع ہے ۔ اور یہ کہ ان تمام باتوں سے " پیدا شدہ مسائل " لاشعوری دھندلکے سے ابھر کر شاعروں کی مخصوص انفرادیت میں ڈھل رہے ہیں ۔ "

جدید نظموں میں نسوانی مسائل کو بھی پیش کیا گیا تھا۔ ابتدا میں نسوانی تعلیم ' پردہ اور نئی تہذیب کے تقاضوں کو پیش کیا گیا۔ بعد میں نسوانی آزادی اور سیاسی زندگی میں عورتوں کی شرکت اور ضرورت کو بیان کیا گیا۔ سماجی زندگی کی پابندیوں اور جکڑبندیوں کا حل حلقے کے شعرا نہ تو سماج سے بغاوت کو قرار دیتے ہیں نہ ہی اشتراکیت کو وہ نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کے پاس رومانیت ملتی ہے یعنی وہ ایک ایسی دنیا کی تمنا کرتے ہیں جو ان مسائل سے پاک ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پُر آشوب زمانے کی وجہ سے وہ داخلیت اور جنسیت میں پناہ لے رہے ہیں ' خاص طور پر میراجی کی نظم " تفاوت راہ " ۔ مختار صدیقی کی نظم " سکھ میں دکھ " ۔ انجم رومانی کی " بے بسی " اور تصدق حسین خالد کی نظم " سونے سے پہلے " میں جنسیت اور داخلیت بے حد ہے۔

15.5 میراجی

میراجی کی نظم " تفاوت راہ " میں اشاریت اور ابہام بھی حد سے زیادہ ہے۔ یہاں اس نظم کا کچھ حصہ پیش کیا جارہا ہے:

اس زمانے میں کہ جنگل تھا یہ باغ
گلے بانوں نے ستاروں سے لگایا تھا سراغ
بھولے رستوں کا' جو بے دھیانی میں کھو جاتے ہیں
ایک اک لمحہ ستاروں ہی کا دھیان آتا ہے
ہر ستارہ مجھے لے جاتا ہے
اسی چوپال کے بے نام کنارے کی طرف
جس میں بیٹھے ہوئے انسان یوں ہی بے مصرف

میری ناکامی ترے نام کی رسوائی ہے

تلخ باتوں میں ہر اک رات بسر کرتے ہیں

بھولا ہوا رستہ کسی ڈوبی ہوئی کشتی کی طرح سطح پر اک پل میں ابھر آتا ہے

آنکھ میں اشک چھلکتے ہیں مگر اشکوں میں

وہ چمن ' وہ مکاں اور وہ روزن--------تینوں

گھلتے رنگوں کی طرح عکس بنا کرتے ہیں

ایک انساں کا جو تقدیر کی بے راہی سے

کبھی مالی ' کبھی عاشق تھا' کبھی دیہاتی

گلے بانی میں جسے یاد جب آئے ماضی

بنسری اپنی بجاتے ہوئے رو دیتا ہے

یہ نظم کافی طویل ہے۔اس نظم میں ابہام اس قدر ہے کہ نظم ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے۔اس نظم کو سمجھنے کے لیے "کئی لوگ سر جوڑ کر بھی بیٹھے" وہ بھی کسی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔خود میراجی سے جب مفہوم بتانے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے جو مفہوم بتایا وہ نظم کے الفاظ سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

میراجی نہ صرف حلقۂ ارباب ذوق کے روح رواں تھے بلکہ حلقے کے سب سے زیادہ نمائندہ شاعر بھی تھے۔وہ ہندوستانی ماحول اور ہندوستان کو جس انداز میں پیش کرتے ہیں وہ کسی اور اُردو شاعر کے ہاں نہیں ملتا گو کہ ان کی نظم "تفاوت راہ" میں بڑا ابہام اور اشاریت ہے' لیکن اس نظم کی پوری فضا خالص ہندوستانی ہے۔میراجی کے کلام کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو انہیں اُردو شاعری میں منفرد بناتی ہے۔

میراجی کی شاعری کی اس خصوصیت کے ساتھ ان کی شاعری کی بعض ایسی خصوصیات رہی ہیں' جن پر اعتراض ہوا ہے۔ایک تو وہ جنسی احساس اور جذبات کا برملا اظہار کرتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ بعض اخلاقی اقدار کا پاس ولحاظ نہیں کرتے۔ان کی ایک نظم "حرامی" ہے جس میں ناجائز تعلقات کو سراہا گیا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں نے اسی وجہ سے حلقۂ ارباب ذوق کے ادبا و شعرا کو "ہئیت پرست' ابہام پرست اور جنس پرست ادیب" کہا ہے۔سردار جعفری نے 1951ء میں جب اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" لکھی تو حلقہ ارباب ذوق "سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ" اس زمانے میں ایک ایسے گروہ نے سر اٹھایا ہے جو ہئیت پرست' ابہام پرست اور جنس پرست ہے۔اس گروہ کے مشہور نمائندے میراجی'

یوسف ظفرؔ، ممتاز مفتی اور مختار صدیقی وغیرہ ہیں۔ یہ وہ ذہین اور ہوشیار لوگ ہیں جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر رہے اور شعور کے بجائے تحت الشعور پر اور معنویت اور مواد کو چھوڑ کر ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے ہیں۔ یہ لوگ کھلم کھلا ترقی پسند تحریک کے مخالف ہیں۔"

سردار جعفری نے حلقۂ ارباب ذوق کی سخت مذمت کرتے ہوئے بھی حلقے کی بعض خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے حلقۂ ارباب ذوق سے تعلق رکھنے والوں کو " ذہین " کہا اور زیادہ منظم ثابت کیا۔ سردار جعفری نے حلقے کے لوگوں کو ہیئت، ابہام اور جنس پرست کہا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اس حلقے کی بنیاد یہ ہے کہ " ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں۔" سردار جعفری نے حلقے کی رومانیت کو " مجہول اور گندی " قرار دیا اور حلقے کو " جاگیر دار اور بورژوا انحطاط کی گندگی کا بدرو" کہا۔ یوں ترقی پسندوں اور حلقے کے مصنفین کے درمیان شدید اختلاف قائم ہو گیا۔" فن برائے فن" اور" فن برائے زندگی " کا یہ نظریاتی اختلاف کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

15.6 ن۔م۔راشد

حلقۂ ارباب ذوق پر لاکھ اعتراضات کیے جائیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حلقے نے اُردو ادب کو اور خاص طور پر اُردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ جدید اُردو نظم کو ایک خاص موڑ دینے میں میراجی کے ساتھ ن۔م۔ راشد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ایک خاص دور میں آزاد نظم کو اُردو میں استحکام اور وقار بخشنے میں انہوں نے جو کام کیا وہ حد درجہ اہم ہے۔ ن۔م۔ راشد کی شاعری میں ' ندرت ' کے ساتھ 'جدت' بھی ملتی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون "ہیئت کی تلاش میں " لکھتے ہیں :

> " ہر ندرت اس قابل نہیں کہ اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیا جائے۔ جب تک ندرت کے ساتھ جدت بھی شامل نہ ہو وہ محض تکنیک کی بے جان نمائش بن کر رہ جاتی ہے۔ شاعری کی ترقی محض خلا میں قلابازیاں لگانے سے نہیں ہو سکتی بلکہ پرانے اور نئے اسکولوں کو آپس میں سمو کر نئی تخلیق کرنے سے ہوتی ہے۔"

پرانے اور نئے اسکولوں کو ملا کر نئی تخلیق کرنے کی ن۔م۔ راشد نے صرف بات ہی نہیں کہی ہے بلکہ اپنی شاعری میں انہوں نے ان دونوں اسکولوں کو سمو کر اپنی شاعری میں "ندرت" کے ساتھ " جدت" بھی پیدا کی ہے جس کی روشن مثال ان کی نظم " اسرافیل کی موت" ہے۔ اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں :

مرگِ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
مرگ اسرافیل سے

اس جہاں میں بند آوازوں کا رزق

مطربوں کا رزق اور سازوں کا رزق

اب مغنی کس طرح گائے گا اور گائے گا کیا

سننے والوں کے دلوں کا تار چپ

اب کوئی رقاص' کیا تھرکے گا لہرائے گا کیا

بزم کے فرش و در و دیوار چپ

اب خطیب شہر فرمائے گا کیا

مسجدوں کے آستان و گنبد و مینار چپ

فکر کا صیاد اپنا دام پھیلائے گا کیا

طائرانِ منزل و کہسار چپ

مندرجہ بالا نظم کی ہیئتی ترتیب یہ بتاتی ہے کہ یہ آزاد نظم ہے لیکن اس کے باوجود اس میں پابند نظم کا انداز بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ ہر مصرعے میں ایک سوال ملتا ہے اور دوسرے مصرعے میں جواب ہے۔ سوال کے مصرعوں میں ایک ہی ردیف و قافیہ ملتا ہے اور جواب میں بھی اس کا التزام رکھا گیا ہے۔ یوں اس نظم میں جدید و قدیم اسکولوں کو سمویا گیا ہے اور جدت کے ساتھ ندرت بھی پیدا کی گئی ہے ۔راشد کی نظموں میں اس طرح سے " دونوں اسکولوں کو آپس میں سمو کر نئی تخلیق " کی گئی ہے۔ ان کے کلام میں ہئیتی تجربوں کے ساتھ فکر و نظر میں ندرت بھی ملتی ہے۔ اوران کی فکر کا ایک منفرد انداز ہے۔ ان کی نظموں میں زور بیان بھی ملتا ہے۔ یہ تمام باتیں ان کو اُردو شاعری میں ایک خاص مقام عطا کرتی ہیں۔

15.7 حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے اہم شعرا

مختار صدیقی : مختار صدیقی حلقہ ارباب ذوق کے اہم شاعروں میں شامل ہیں۔ ان کی نظم " بازیافتہ " میں ایک ایسی عورت کو موضوع بنایا گیا ہے جو فرقہ وارانہ فساد کے دوران اغوا کرلی گئی تھی اور اب اس ہنگامے سے متاثر ہو کر یک و تنہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بچ گئی لیکن سوال یہ ہے کہ اب اس کی زندگی کی ناؤ کو کھینے والا کون ہو گا۔ یعنی اس کا ناخدا کون ہو گا؟ حلقۂ ارباب ذوق کے ایک اجلاس میں یہ

بات زیر بحث آئی تھی کہ فرقہ وارانہ فسادات میں جو عورتیں متاثر ہوتی ہیں ان کو سماج میں ایک باعزت مقام دلانے میں ادیبوں کو بھی اپنا زور قلم صرف کرنا چاہیے۔ مختار صدیقی نے اپنی درج ذیل نظم میں اسی مسئلہ کے حل کی طرف سماج کو متوجہ کیا ہے:

اچھا خاصا سبک سا نقشہ

چہرہ پیلا لباس سادہ

ماحول سے جیسے تھک چکی ہو

تنہا تنہا' بلا ارادہ

آنکھیں جو کبھی رسیلی ہوں گی

اب ان کی اداسیوں کی تہہ میں

کیا کیا نہ تھے جاں گسل خانے

ہم آپ تو بے سنیں ہی سہمیں

طوفان میں جو ناؤ کھو گئی تھی

پھر آن لگی ہے اس کنارے

یوں تو ہے خدا کا شکر واجب

لیکن کسے نہ خدا پکارے

یوسف ظفر: یوسف ظفر بھی حلقۂ ارباب ذوق کے اہم شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کا انداز بہت منفرد ہے۔ ان کے کلام میں جذبات کی شدت اور گرمی ملتی ہے۔ بعض وقت ان کی شاعری میں علامات اور اشارات مبہم ہوتے ہیں لیکن بعض وقت وہ بہت صاف اور واضح انداز میں اپنا مافی الضمیر پیش کرتے ہیں۔ اس بیان کی تصدیق ان کی نظم "زندان" کے ان اشعار سے ہوتی ہے:

اب مرا عزم ہے فولاد کی مضبوط چٹان

اب یہاں کانچ کی تلواریں نہیں رہ سکتیں

اب میں خود آگ ہوں ہر شے کو جلا سکتا ہوں

مجھ سے اب ہاتھ اٹھالو کہ میں جا سکتا ہوں

(زندان)

یوسف ظفر کے کلام میں زندگی کے مختلف مسائل اور ان مسائل سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات ملتے ہیں۔ وہ عام الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ان میں نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔

قیوم نظر: قیوم نظر بھی حلقۂ ارباب ذوق کے سربرآوردہ شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں داخلی واردات کو معنی خیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ گو ان کی شاعری کا محور و مرکز داخلی دنیا ہے لیکن وہ خارجی دنیا کے حالات اور ماحول کو داخلی احساسات میں تبدیل کر کے بیان کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم " اپنی کہانی" ہے اس نظم میں ہندوستان کی غلامی کے دور کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ہندوستان کی گویا قید کا زمانہ ہے۔ آزادی اگر حاصل نہ ہو تو زندگی قید ہی ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں ہندوستان کے لیے شیر کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ شیر جو قید میں رکھا گیا ہے۔ یہ قیدی شیر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان قید کی دیواروں کو گرادے گا اور لوہے کی سلاخوں کو توڑ ڈالے گا۔ نظم میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نظم کے چند شعر یہاں پیش کیے جارہے ہیں :

تنگ و تاریک ہے اب روزن زنداں کی طرح
تلخی جبر میں لپٹا ہوا پامال کچھار
جس میں وہ بھورا سا اک ڈھیر پڑا ہو جیسے
اس کی آنکھوں میں ایک اترا ہے احساس کا خون
سرد لوہے کی سلاخیں ...... یہ گراں دیواریں
توڑ ہی ڈالے گا اب ٹھان چکا ہو جیسے

(اپنی کہانی)

اس نظم میں ابہام اور اشاریت ملتی ہے۔ ترقی پسند مصنفین کو اسی ابہام اور اشاریت پر اعتراض تھا۔

ضیا جالندھری: حلقۂ ارباب ذوق کے ایک اور اہم شاعر ضیا جالندھری ہیں۔ وہ زندگی کے اس پہلو کو خاص طور پر موضوع سخن بناتے ہیں جو حزن و یاس سے مملو ہے۔ چوں کہ ان کے انداز فکر میں قنوطیت ہے اس وجہ سے وہ زندگی کے خوش گوار پہلوؤں کو وقتی اور ناپائیدار سمجھ کر اس کی طرف التفات نہیں کرتے البتہ وہ غم اور ملال کو جاوداں سمجھتے ہیں اس لیے اپنی شاعری میں ان ہی کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان ساری کیفیات کو حسن کارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ضیا کی شاعری میں جو درد و کرب کی کیفیت ہے اس کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں :

"یوں لگتا ہے جیسے یہ شاعر اپنے ہی کرب کی آگ میں جل کر کندن ہو گیا ہے اور اس کا داخلی نظام لمحے کے آشوب کی ماہیت کو پوری طرح پا گیا ہے۔ آغاز کار ہی میں اس کے سامنے روایتی عارفانہ تصورات کا ایک ڈھیر موجود تھا اور وہ چاہتا تو محض ہاتھ بڑھا کر اس سے اپنی پسند کی چیز اٹھا سکتا تھا... آخر آخر میں اس جزو اور کل' قطرہ اور بحر کا راز منکشف ہوا تو قیاس کہتا ہے کہ وہ اس واردات سے خود گزرا ہے۔" (نظم جدید کی کروٹیں۔ صفحہ 171)

ضیا جالندھری نے بڑے شاعروں کے کلام کا مطالعہ تو کیا لیکن ان کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اپنے ہی تجربات اور واردات کو قلم بند کیا۔ ان کی ایک نظم "آنسو" کے چند اشعار سے ان کی شاعرانہ انفرادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

سنو سنو آنسوؤں کی آواز سارے عالم پہ چھا رہی ہے
مگر میں کب سے ترس رہا ہوں
کہ میری پتھرائی خشک آنکھوں سے بھی کچھ آنسو
ابھرتی لہروں کی طرح ابھریں
اور ان کی حدت میں ڈھل کے بہہ جائے میرے سینے کا درد سنگیں

دل پر جب غم کی گھٹا اس طرح چھائی ہوئی ہوتی ہے جو کھلتی ہے نہ برستی ہے۔ ایسی ہی کیفیت کو ضیا نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح حلقۂ ارباب ذوق کے مختلف شاعروں نے اُردو شاعری کے دامن کو وسیع کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔

15.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- حلقۂ ارباب ذوق 1939ء میں قائم ہوا۔ ابتدا میں حلقۂ ارباب ذوق کا نام "بزم داستان گویاں" تھا۔
- ابتدا میں کوئی خاص مقصد اس حلقے میں پیش نظر نہیں تھا۔ چند احباب اپنی تخلیقات ایک دوسرے کو سنانے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ چند ہی نشستوں کے بعد "بزم داستان گویاں" کی جگہ ان احباب نے "حلقۂ ارباب ذوق" کا نام اختیار کیا۔
- میراجی کے حلقے میں شامل ہونے سے حلقے کی سرگرمیوں میں نئی جان پڑ گئی اور وہ بہت جلد اس حلقے کے روحِ رواں بن گئے۔
- میراجی بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن وہ نقاد بھی بہت اچھے تھے۔ میراجی کی شمولیت سے حلقے میں شعری تخلیقات پر خاص طور پر

توجہ کی گئی۔

- 1941ء میں حلقے نے جدید نظموں کا انتخاب " 194ء کی بہترین نظمیں" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس انتخاب کی ادبی حلقوں میں اتنی پذیرائی ہوئی کہ سالہاسال تک سال کے ختم پر جدید منتخب نظمیں شائع ہونے لگیں۔
- 1941ء ہی کی بہترین نظموں کے انتخاب میں حلقے نے اپنا نظریۂ ادب پیش کیا۔ اس میں میرا جی نے ترقی پسند مصنفین کے " ادب برائے زندگی "یا " فن برائے زندگی " کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ " فن برائے فن" یا "ادب برائے ادب" کے بغیر فن یا ادب پیدا نہیں ہو سکتا تو پھر اس کو ادب یا فن برائے زندگی کہنا بالکل ہی بے بنیاد بات ہے۔
- میرا جی حلقۂ اربابِ ذوق کے سب سے نمائندہ شاعر تھے۔ وہ اُردو نظم نگاری میں اپنا ایک منفرد انداز رکھتے ہیں۔ سردار جعفری نے حلقہ کے دوسرے شاعروں کے لیے خاص طور پر میرا جی کی شاعری کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں " ہئیت پرست ' ابہام پرست اور جنس پرست" قرار دیا تھا۔
- اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا جی کی شاعری میں یہ تمام باتیں ملتی ہیں لیکن یہ تمام باتیں منفی قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔
- ہئیت کی شاعری میں بڑی اہمیت ہے کہ جب تک کوئی ہئیت اختیار نہ کی جائے شاعری ممکن نہیں۔ اسی طرح ہئیت کے تجربے شاعری میں ہمیشہ کیے گئے ہیں اور خود ترقی پسندوں نے بھی یہ تجربے کیے ہیں۔
- ابہام کی اہمیت ادب اور شاعری میں بے حد ہے۔ تشبیہ ' استعارے اور علامتیں سب شاعری اور ادب کی لازمی شرطیں ہیں۔
- جنسیت بھی شاعری میں ہمیشہ سے رہی ہے لیکن اس سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ باتیں حد سے زیادہ ہوں تو قابلِ اعتراض بن جاتی ہیں۔
- میرا جی کی شاعری میں بھی یہ باتیں بعض وقت ضرورت سے زیادہ ملتی ہیں۔ اس کے باوجود میرا جی کی شاعری میں ایک خاص طرح کی جاذبیت ملتی ہے۔
- ن۔م۔راشد حلقۂ اربابِ ذوق کے بے حد اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے اُردو نظم نگاری کو ایک خاص موڑ دیا۔
- آزاد نظم کو وقار اور استحکام دینے میں ن۔م۔راشد کی اہمیت ہمیشہ اُردو شاعری میں رہے گی۔
- وہ "ندرت" کے ساتھ " جدت" کو شاعری میں ضروری سمجھتے ہیں اور اسی پر کاربند بھی رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر انگیزی بھی ملتی ہے۔ ان کے پاس ہئیت کے نئے تجربے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً" اسرافیل کی موت" میں انہوں نے آزاد نظم اور پابند نظم کے عناصر کو ملا کر ایک نیا تجربہ کیا۔

- وہ اُردو شاعری اور خاص طور پر اُردو نظم نگاری میں بہت ہی ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔
- حلقۂ اربابِ ذوق کے دوسرے اہم شاعروں میں مختار صدیقی ' یوسف ظفر' قیوم نظر اور ضیا جالندھری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

15.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
موقر	:	توقیر والا، عزت والا
حلقہ	:	گروہ۔ گھیرا
بزم داستاں گویاں	:	داستان بیان کرنے والوں کا گروہ
شمولیت	:	شامل ہونا
حزن و یاس	:	رنج و مایوسی
مملو	:	پُر، بھرا ہوا
قلابازی	:	کرتب دکھانا
مغنی	:	گانے والا
صیاد	:	شکاری
تفاوت	:	مختلف، جداگانہ
صحرا	:	بیاباں، جنگل

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. حلقہ اربابِ ذوق کا قیام کس سن میں ہوا؟
2. حلقہ اربابِ ذوق کا ابتدا میں کیا نام تھا؟
3. حلقہ اربابِ ذوق کے بانیوں میں سے کسی ایک نام بتایئے؟
4. "خودکشی" کس کی نظم ہے؟
5. مختار صدیقی کا تعلق کس حلقہ سے تھا؟

6. یوسف ظفر کی کسی ایک نظم کا نام بتایئے؟
7. لاشعور کا نظریہ کس نے پیش کیا؟
8. یونس جاوید کی کتاب کا نام بتایئے؟
9. "ایران میں اجنبی" کس شاعر کا شعری مجموعہ ہے؟
10. اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کس کی تصنیف ہے؟

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. میراجی کی نظموں کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. ضیاجالندھری کے کلام کی انفرادیت بیان کیجیے۔
3. حلقہ ارباب ذوق کا نظریہ ادب کیا تھا؟
4. ن۔م۔راشد کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
5. حلقہ ارباب ذوق کے دو شعرا کے بارے میں لکھیے۔

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا کب اور کیوں کر ہوئی؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ چند شعرا کی شاعری پر روشنی ڈالیے۔
3. حلقہ ارباب ذوق کا نظریہ ادب کیا تھا۔ بیان کیجیے۔

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. حلقہ ارباب ذوق	یونس جاوید
2. ترقی پسند ادب	سردار جعفری
3. نظم جدید کی کروٹیں	وزیر آغا
4. ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	یعقوب یاور
5. اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
6. ایران میں اجنبی	ن۔م۔راشد
7. سرشام	ضیاجالندھری

اکائی : 16 اختر الایمان: یادیں،
ن۔م۔راشد: زنجیر، میراجی: کلرک کا نغمہ محبت

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 اختر الایمان

16.2.1 اختر الایمان کے حالات زندگی اور نظم نگاری

16.2.2 نظم 'یادیں' کا متن اور تنقیدی جائزہ

16.3 ن۔م۔راشد

16.3.1 ن۔م۔راشد کے حالات زندگی اور نظم نگاری

16.3.2 نظم ' زنجیر کا متن اور تنقیدی جائزہ

16.4 میراجی

16.4.1 میراجی کے حالات زندگی اور نظم نگاری

16.4.2 نظم ' کلرک کا نغمہ محبت' کا متن اور تنقیدی جائزہ

16.5 اکتسابی نتائج

16.6 کلیدی الفاظ

16.7 نمونہ امتحانی سوالات

16.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

بیسویں صدی کے ربع اول اور ترقی پسند تحریک سے پہلے جن شعرا نے اردو نظم نگاری میں موضوع اور اسلوب کا اضافہ کیا ان میں جوشؔ، اختر شیرانی، حفیظؔ جالندھری، عظمت اللہ خاں وغیرہ کا نام اہم ہے۔ جوش نے عشق، فطرت، وطنیت اور جدوجہد آزادی کو اپنا موضوع بنایا۔ اختر شیرانی نے مغرب کی تقلید میں رومانیت کا آغاز کیا اور کلاسیکی شاعری کے تصورات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ حفیظ جالندھری نے شاہ نامہ اسلام لکھ کر اردو نظم کے آہنگ میں ایک نئی وسعت پیدا کی۔ 1936 کے بعد ترقی پسندوں نے محنت کش عوام کے مسائل کو نظم کا موضوع بنایا اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف احتجاج میں نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد نفسیاتی موضوعات نے نظم کی ہیئت میں تبدیلیاں پیدا کیں اور بے قافیہ، معرا اور آزاد نظم وجود میں آئی۔ 1930 سے نظموں کی لفظیات میں تبدیلی رونما ہوئی اور الفاظ اپنے نئے معنی میں استعمال ہونے لگے۔ اس طرح مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے نظم رفتہ رفتہ ایسے دور میں داخل ہوئی جہاں اختر الایمان، ن۔م۔راشد اور میراجی نے اس کی ہیئت، لفظیات اور موضوعات میں حیرت انگیز تبدیلیاں کیں۔ اس اکائی میں ہم انہیں تینوں شعرا کے حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی نظم نگاری کا مطالعہ کریں گے۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- میراجی حالات زندگی کو سمجھ سکیں۔
- ن۔م۔راشد کے تخلیقی سفر سے روشناس ہو سکیں۔
- میراجی کی نظم نگاری کا جائزہ لے سکیں۔
- شامل نصاب نظموں کا مطالعہ کریں اور ان کا تنقیدی جائزہ لے سکیں۔

16.2 اختر الایمان

16.2.1 اختر الایمان کے حالات زندگی اور نظم نگاری:

اختر الایمان کے بزرگ خود کو راجپوت لکھتے تھے۔ ان کے دادا کا نام اقبال راؤ تھا اور لوگ انہیں بالے راؤ کہتے تھے۔ وہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے اور گڑھوال میں ان کی دوکان تھی۔ دادا کے انتقال کے بعد اختر الایمان کے چچا نے دوکان پر قبضہ کر لیا۔ اختر الایمان کے والد فتح محمد گھر چھوڑ کر سہارنپور چلے گئے۔ وہ عربی جانتے تھے اور حافظ قرآن تھے۔ فارسی اور ہندی میں بھی ملکہ تھا، طب کی بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے درویشانہ خانہ بدوشوں کی زندگی گزاری۔ مسجد میں امامت کے ساتھ مکتب میں پڑھاتے تھے اور اکثر مسجد کے حجرے میں ہی سوتے تھے۔

اختر الایمان 12 نومبر 1915 کو قلعہ پتھر گڑھ (بجیب آباد) ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام سلیمن تھا۔ ان کے بچپن کا دور خانہ بدوشوں کی طرح گزرا۔ والد امامت کے سلسلے میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے تھے۔ جب والد امامت چھوڑ کر مدرسہ کے لیے چندہ لینے جانے لگے تو اختر الایمان کو سگھ مدرسے میں چھوڑ دیا۔ اسی مدرسے میں ایک ڈیڑھ سال میں اختر الایمان نے اٹھارہ بیس پارے حفظ کیے۔ اس کے بعد وہ سگھ بستی میں آ گئے۔ یہاں سے ڈیڑھ کلومیٹر دور ایک قصبہ بوڑیا میں سرکاری مڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ مالی قلت کی وجہ سے والد نے دودھ بیچنے کا کام شروع کیا۔ اختر الایمان اسکول جاتے وقت دودھ حلوائی کی دوکان پر پہنچاتے تھے۔ لیکن جب اختر الایمان کو والد کی دوسری شادی کو پتہ چلا تو انہوں نے اپنی والدہ کو بتا دیا جس کے نتیجے میں دونوں میں جھگڑا ہوا اور والد نے گاؤں آنا کم کر دیا۔ اسی اثنا مین آوارہ گردی کی وجہ سے اختر الایمان کا نام اسکول سے کاٹ دیا گیا اور گائے بھینسوں کو چرانا ان کا معمول بن گیا۔ دوبارہ والدین کے درمیان علاحدگی ہونے کی وجہ سے اختر الایمان نجیب آباد اور پھر وہاں سے دہلی آ گئے جہاں ان کے چچا نے انہیں ایک یتیم خانے میں ڈال دیا جو ایک مکتب بھی تھا۔ خورشید الاسلام بھی اسی موئید الاسلام میں پڑھتے تھے اور اختر الایمان کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا اورل رہا ہے۔ اس میں دو اساتذہ (عبد الصمد، عبد الواحد) کا بڑا حصہ تھا۔ 1932 میں موئید الاسلام سے لاتعلق ہو گئے اور واپس چچا کے گھر میں آ گئے۔ اس کے بعد فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اس داخلے سے قبل اختر الایمان غزلیں کہہ لیا کرتے تھے لیکن بعد میں غزل چھوڑ کر نظم لکھنا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں 'گور غریباں' لکھی جو مدرسے کی میگزین میں شائع ہوئی۔ 1937 میں میٹرک کے بعد اس اسکول سے بھی تعلق ختم ہو گیا۔

اس کے بعد اینگلو عربک کالج دہلی میں کسی طرح داخلہ ہوا اور وہ یہاں کے سماجی اور رفاحی کاموں میں حصہ لینے لگے۔ اسی دوران محلہ بارہ دری شیر افگن خان میں بالغان کے لیے ایک ایوننگ اسکول کھول دیا۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین ہر مہینے آ جایا کرتے تھے۔ اینگلو عربک کالج میں تعلیم کے دوران والد رشتہ طے کر دیا اور 1939 میں شادی ہو گئی۔ لیکن دو سال بعد طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد ان کے کئی معاشقے پروان چڑھے۔

اینگلو عربک کالج سے بی اے کرنے کے بعد ایم اے میں داخلہ نہ مل سکا۔ پھر 1941 میں ساغر نظامی کی سفارش پر چالیس روپے کے عوض 'ایشیا' کی ادارت کے سلسلے میں میرٹھ چلے گئے اور میرٹھ یونیورسٹی میں ایم اے (فارسی) میں داخلہ لے لیا لیکن میرٹھ میں دل نہیں لگا اور پانچ ماہ بعد دہلی واپس آ گئے اور دلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے۔ اس وقت وہاں میراجی، کرشن چندر، منٹو، ن۔م۔راشد، مجاز بھی کام کر رہے تھے۔ کچھ وجوہات کی بنیاد رپ ریڈیو سے تعلق ختم ہونے کے بعد علی گڑھ آ گئے۔ ایم۔اے اردو میں داخلہ لیا اور پہلا سال امتیاز کے ساتھ مکمل کیا، لیکن آمدنی کا مستقل ذریعہ نہ ملنے کی وجہ سے علی گڑھ چھوڑ دیا۔ 1944 میں حیدرآباد گئے اور وہاں سے پونے آ گئے۔ اسی دوران ان کا مجموعہ "گرداب" شائع ہو چکا تھا۔ پونے میں شالیمار اسٹوڈیو میں کام کے دوران انہوں نے غلامی، میرا جیسی فلمیں لکھیں۔ شالیمار اسٹوڈیو میں چار سال کام کرنے کے بعد اختر الایمان دہلی واپس آ گئے۔ 3 مئی 1947 کو سلطانہ منصوری سے نکاح ہو گیا لیکن وداعی نہ ہوئی اور فساد کے دوران جب ان کی بہن پاکستان چلی گئی تو وہ اختر الایمانک کے پاس پونے چلی گئی۔ ستمبر 1949 میں انہیں کمیونسٹ جلسوں

کے اہتمام کے الزام میں گرفتار ہو کر ایک ماہ جیل میں رہنا پڑا۔

1967 میں پہلی مرتبہ بیرون ملک بیروت گئے۔ وہاں سے دمشق گئے۔ بیروت سے ماسکو، لندن، پیرس اور قاہرہ ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔ 1970 میں فلم 'چاندی سونا' کی شوٹنگ کے سلسلے میں ماریشش گئے۔ فلم 'سفاری' کے سلسلے میں کینیا، تنزانیہ، یوگنڈ جانے کا موقع ملا۔ فلم 'اپرادھ' کی شوٹنگ کے لیے جرمنی گئے اور پھر برلن، جینیوا اور روم ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔ 1980 میں مشاعرے کے سلسلے میں نیویارک، لان جائنس، سان فرانسیسکو، ڈزنی لینڈ اور شکاگو جانا پڑا۔ واپسی میں فرانکفورڈ، قاہرہ، دبئ اور کراچی میں تھوڑے تھوڑے دن قیام کیا۔ 1983 میں کینیڈا، مانٹریال، ٹورنٹو، شکاگو، 1985 میں اپنے ستر سالہ جشن کے سلسلے میں بیوی کے ساتھ ٹورنٹو گئے۔ واپسی میں ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک میں قیام کیا۔ اسی سال بہادر شاہ ظفر کل ہند ایوارڈ دیا گیا۔ اپریل 1986 میں بوسٹن گئے۔ جنوری 1986 میں انہیں اچانک دل کی شکایت شروع ہوئی اور بمبئی میں کئی ماہ تک زیر علاج رہنے کے بعد بوسٹن گئے اور وہاں سے آپریشن کرا کے بمبئی واپس آئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی بہت سی مصروفیات ترک کر دیں۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ ڈھائی سال تک ڈائلسس پر رہے۔ ہفتے میں دو بار ڈائلسس کرانے کی وجہ سے ان کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ اسی دوران انہوں نے عجلت میں اپنی خود نوشت مکمل کی، شاید وہ کچھ اور بھی لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ پھر بھی آنے جانے والے ہر شخص سے ملاقات کا سلسلہ جاری رکھا اور حتیٰ کہ 9 مارچ 1996 کو داعی اجل نے انہیں آ دبوچا اور وہ اس آباد خرابے کو چھوڑ کر عالم ارواح میں چلے گئے۔ انہیں باندرہ اور کھار اسٹیشن کے درمیان ایک قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ان کی قبر کے کتبے پر انہیں کی نظم کے یہ دو مصرعے کندہ ہیں:

اس مسافت میں رہ رہ کے لپٹی تھی جو
میں نے وہ خاک بھی پاؤں سے جھاڑ دی

اختر الایمان کے شعری مجموعوں کے دیباچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی نظم نگاری کے سلسلے کو حالی، آزاد اور بجنوری سے جوڑتے ہیں۔ ان کی نظموں کے موضوعات اور مرکزی خیال پر خاطر خواہ توجہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیالات اور عقیدے کے اعتبار سے ترقی پسند ہی تھے۔ وہ اپنی نظموں میں معاشرے پر طنز کرتے ہیں اور شعر کو معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اختر الایمان کی شاعری کا خمیر اسی دور سے اٹھتا ہے جس دور میں ترقی پسند تحریک کا تانا بانا بُنا جا رہا تھا۔ اختر الایمان کا اسلوب اور ڈکشن باقی شاعروں سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں تشبیہ، استعارہ اور تلمیحات کو جاگیردارانہ نظام کی یادگار کہا ہے۔

دشت ہویدا کا دیوانہ تند بگولوں سے کہتا ہے
آگ ہے میرے پاؤں کے نیچے دکھ سے چور مری نس نس ہے
ایک دفعہ دیکھا ہے اس کو ایک دفعہ کی اور ہوس ہے

ان کی نظموں میں افسانویت ملتی ہے۔ یہی علامت کی شکل میں، کہیں تمثیل کی شکل میں، اور کہیں مکالماتی ڈرامائیت کی شکل میں اور کہیں

حکایت کی شکل میں۔ ان میں موپاساں اور منٹو کی طرح اختتام ڈرامائی ہوتا ہے اور قاری انہیں پڑھ کر چونک جاتا ہے۔ اختر الایمان اپنی نظموں کے اختتام پر قاری کو جھنجھوڑ کر رگ و پے میں ایسی آگہی پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری کے لیے نظم کے ابتدائی حصے کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح کی نظمون میں اتفاق، پکنک، بے تعلقی، عمر گریزاں کے نام وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:

یک بہ یک شور ہوا
تقویت ذہن نے دی۔ ٹھہرو، نہیں خون نہیں
پان کی پیک ہے۔ اماں نے تھوکی ہو گی

اختر الایمان کی شاعری کے موضوعات ضرور ترقی پسندوں کے ہیں لیکن ان کا بیانیہ مشہور ترقی پسند شعرا سے مختلف ہے۔ انہونے شاعری کو نعرہ بازی نہیں بنایا۔ وہ ایسی جدیدیت کے بھی قائل نہیں تھے جو انسان کو دنیا سے لاتعلق کر دے۔ وہ شاعری کو ضمیر کے کرب کا اظہار، معاشرے پر تنقید اور طنز و تضحیک کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یادیں کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"شاعری میرے نزدیک کیا ہے۔ اگر امیں اس بات کو ایک لفظ میں واضح کرنا چاہتا ہوں تو 'مذہب' کا لفظ استعمال کروں گا۔ کوئی بھی کام جسے انسان دیانتداری سے کرنا چاہے اس میں جب تک وہ لگن اور تقدس نہ ہو جو صرف مذہب سے وابستہ ہے اس کام کے اچھا ہونے میں ہمیشہ شبہ کی گنجائش رہے گی۔ یہ شاعری جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس میں وہ لگن یا تقدس ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے مجھے نہیں معلوم البتہ یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں میں نے اپنی شاعری کو اپنا ایمان اور مذہب سمجھنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میں نے آج تک زندگی اور اس کے نشیب و فراز کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتا نہیں کیا جو میری شاعری کو مجروح کرتا ہو۔"

(یادیں، اختر الایمان، میٹرو پرنٹنگ اینڈ لیتھو ورکس، ممبئی، 1961)

اختر الایمان کی شاعری کی ابتدا خاصی کم عمر میں طالب علمی کے زمانے میں ہوئی۔ ابتدا میں انہوں نے غزلیں کہین لیکن وہ محض تک بندی تک محدود رہیں۔ 1934 کے بعد سے ان کا رجحان نظموں کی طرف رہا۔ 1940 سے قبل انہوں نے کچھ افسانے بھی تحریر کیے لیکن بعد میں افسانہ نگاری بھی ان کے مزاج کے مطابق نہ ٹھہری۔

اختر الایمان کی نظموں کا پہلا مجموعہ "گردا" 1943 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "تاریک سیاہ" 1946 میں، تیسرا مجموعہ "سب رنگ" 1948 میں شائع ہوا جو ایک طویل تمثیلی نظم ہے۔ چوتھا مجموعہ "آب جو" میں 'گرداب' اور 'تاریک سیاہ' کی نظموں کو یکجا کر کے 1960 میں شائع کیا۔ 1969 میں اختر الایمان کا چھٹا شعری مجموعہ "بنت لمحات" اور ساتواں مجموعہ "نیا آہنگ" 1977 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1983 میں "سر و سامان" کے عنوان سے ان کا کلیات شائع ہوا اور 2000 میں "کلیات اختر الایمان" منظر عام پر آیا۔ کلیات میں

نواں شعری مجموعہ "زمین زمین" بھی شامل ہے۔ دسواں شعری مجموعہ "زمستاں سرد مہری کا" 1997 میں شائع ہوا اور ان کی سوانح عمری "اس آباد خرابے میں" 1996 میں شائع ہوئی۔ بیدار بخت نے اختر الایمان کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

اختر الایمان کی شاعری کا مرکز زندگی کی بدلتی ہوئی قدریں ہیں اور اس تبدیلی کا سبب 'وقت' ہے۔ وقت کی جبریت کا احساس ان کی نظم نقش پا، مسجد، موت، پرانی فصیل، باز آمد، کوزہ گر، وقت کی کہانی میں ہوتا ہے۔ وقت کا یہ رد عمل جدید نظم کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

سیاسی انتشار بھی اختر الایمان کی شاعری کا اہم مسئلہ ہے۔ ان کے یہاں معاشرے میں انسان کی بے ضمیری، خود غرضی اور رشوت خوری جیسی سماجی برائیوں کا شدید احساس ملتا ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل سے متاثر ہوتی ہے۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ سماجی بے انصافی کے خلاف لوگ آواز نہیں اٹھاتے۔ ان کی شاعری میں کشمکش کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ کشمکش اختر الایمان کی ابتدائی نظموں شہر اور گاؤں، سادگی اور چالاکی، ماضی اور حال، رومانیت اور حقیقت کے درمیان نظر آتی ہے۔ ترقی کی رفتار، تبدیلی، زندگی کے دروازے پر، مداوا، کاوش، خلا، پس منظر اور کربال جیسی نظمیں اس کی بہترین مثال ہیں۔

اختر الایمان کی نظموں میں گاؤں کی زندگی سے قربت ملتی ہے لیکن حقیقت میں اس کی طرف واپس نہ جانے کا انہیں عمر بھر افسوس رہا۔ شہر میں اقدار کے زوال اور بے چینی کے وہ خواہاں نہیں لیکن انہیں گاؤں کی سادگی پسند زندگی بھی میسر نہیں ہے جس کا ذکر ان کی نظم ایک لڑکا، میر ناصر حسین اور یادیں میں ملتا ہے۔

اختر الایمان ترقی پسند فکر سے متاثر تھے اور انہوں نے ترقی پسند موضوعات پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ وہ ترقی پسندی کے ادارہ جاتی کردار کے مخالف تھے۔ ان کی نظمیں نعرہ بازی، خطابت یا کسی نظریہ کے تابع نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں ترقی پسند موضوعات دیگر سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کی طرح ہیں۔

ان موضوعات کے علاوہ عشقیہ مضامین پر بھی اختر الایمان کی نظمیں دستیاب ہیں لیکن ان کے عشق کا اظہار اردو کے روایتی شعر اسے مختلف ہے۔ اعتراف، انجان، تجدید، سکون، تجھے گمان وغیرہ نظموں میں کرب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن زیادہ تر نظموں میں خوش گوار نرم نازک مثبت جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

اختر الایمان نے اپنی شاعری میں مختلف تجربات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف وقت، معاشرتی مسائل، ترقی پسند اور عشق کو اپنا موضوع بنایا بلکہ اردگرد کے ماحول میں تجربات کے ذریعے حاصل شدہ کرداروں کو موضوع بنایا ہے جس کی وجہ سے موضوعات میں ایسی وسعت اور رنگارنگی پیدا ہو گئی ہے جو ان کے کسی معاصرین میں نظر نہیں آتی۔ اور یہ اختر الایمان کی انفرادیت ہے کہ کسی بھی تحریک، نظریہ یا رجحان سے وابستہ ہوئے بغیر تمام تجربات پر ذاتی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے جو زبان استعمال کی ہے وہ روزمرہ کی کھردری زبان ہے۔ ان کے ابتدائی مجموعہ گرداب میں کلاسیکی اور فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے لیکن کلاسیکی الفاظ اپنے روایتی مفہوم میں (جو غزل میں ہوتا ہے) استعمال نہیں ہوتے ہیں۔ ان کی زبان میں روزمرہ کی بول چال اور کھڑی بولی کے الفاظ

ملتے ہیں لیکن علامتوں کا استعمال ہونے کے باوجود ان کے یہاں ابہام نہیں ملتا۔ ان کے یہاں علامت اس طرح استعمال ہوتی ہے کہ وہ بالکل واضح ہوتی ہے۔

اختر الایمان کی طویل نظموں میں 'ایک لڑکا' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کو ان کا ایک اہم کارنامہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں اختر الایمان کا فن بھرپور طریقے سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس نظم میں ضمیر کو ایک علامت کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اختر الایمان جانتے تھے کہ ان کی نظمیں علامت کے استعمال کی وجہ سے ایک بار میں قاری کو مشکل سے سمجھ آتی ہیں اور نظم ''قلوپطرہ'' اس کی بہترین مثال ہے جس میں انھوں نے علامتوں کو ایک الگ طریقہ سے استعمال کیا ہے ۔

اختر الایمان کا شمار ان چند اہم شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے نظموں میں پہلے مصرعے کو عنوان بنا کر بقیہ اشعار اس کی تشریح کی ہے ۔ اس کی مثال ان کی نظم ''یادیں'' کو پیش کی جا سکتی ہیں۔ اختر الایمان نے اپنے عہد میں تصور حسن عشق کی تبدیلی کو سب سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اب ہم اختر الایمان کی اسی نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی تشریح کریں گے۔

16.2.2 نظم 'یادیں' کا متن اور تنقیدی جائزہ:

لو وہ چاہِ شب سے نکلا پچھلے پہر پیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رکتے رکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو گزری بات ہے نقش بر آب
یہ روداد ہے اپنے سفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

شہر تمنا کے مرکز میں لگا ہوا ہے میلا سا
کھیل کھلونوں کا ہر سو ہے اک رنگیں گل زار کھلا
وہ اِک بالک جس کو گھر سے اک درہم بھی نہیں ملا
میلے کی سج دھج میں کھو کر باپ کی انگلی چھوڑ گیا
ہوش آیا تو خود کو تنہا پا کے بہت حیران ہوا
بھیڑ میں راہ ملی نہیں گھر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

وہ بالک ہے آج بھی حیراں میلہ جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت کہیں نجابت کہیں محبت کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

ہونٹ تبسم کے عادی ہیں ورنہ روح میں زہر آگیں
گھپے ہوئے ہیں اتنے نشتر جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جس پر ناز ہے ہم کو اتنا جھکی ہے اکثر وہی جبیں
کبھی کوئی سفلہ ہے آقا کبھی کوئی ابلہ فرزیں
بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی آباد خرابے میں

کالے کوس غم الفت کے اور میں نان شبینہ جو
کبھی چمن زاروں میں الجھا اور کبھی گندم کی بو
نافۂ مشک تتاری بن کر لیے پھری مجھ کو ہر سو
یہی حیات صاعقہ فطرت بنی تعطل کبھی نمو
کبھی کیا رم عشق سے ایسے جیسے کوئی وحشی آہو
اور کبھی مر مر کے سحر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

کبھی غنیم جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
ارض الم میں خوار ہوئے ہم بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا تو بیت گئے جگ ہوئی نہ رات
ہر سو مہ وش سادہ قاتل لطف و عنایت کی سوغات

شبنم ایسی ٹھنڈی نگاہیں پھولوں کی مہکار سی بات
جوں توں یہ منزل بھی سر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

راہ نورد شوق کو رہ میں کیسے کیسے یار ملے
ابر بہاراں عکس نگاراں خال رخ دلدار ملے
کچھ بالکل مٹی کے مادھو کچھ خنجر کی دھار ملے
کچھ منجدھار میں کچھ ساحل پر کچھ دریا کے پار ملے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یوں ہی ہاتھ پسار ملے
صرف ان کی خوبی پہ نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

ساری ہے بے ربط کہانی دھندلے دھندلے ہیں اوراق
کہاں ہیں وہ سب جن سے جب تھی پل بھر کی دوری بھی شاق
کہیں کوئی ناسور نہیں گو حائل ہے برسوں کا فراق
کرم فراموشی نے دیکھو چاٹ لیے کتنے میثاق
وہ بھی ہم کو رو بیٹھے ہیں چلو ہوا قرضہ بے باق
کھلی تو آخر بات اثر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

خواب تھے اک دن اوج زمیں سے کاہکشاں کو چھو لیں گے
کھلیں گے گل رنگ شفق سے قوس قزح میں جھولیں گے
باد بہاری بن کے چلیں گے سرسوں بن کر پھولیں گے
خوشیوں کے رنگیں جھرمٹ میں رنج و محن سب بھولیں گے
داغ گل و غنچہ کے بدلے مہکی ہوئی خوشبو لیں گے
ملی خلش پر زخم جگر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

خوار ہوئے دمڑی کے پیچھے اور کبھی جھولی بھر مال
ایسے چھوڑ کے اٹھے جیسے چھوا تو کر دے گا کنگال
سیانے بن کر بات بگاڑی ٹھیک پڑی سادہ سی چال
چھانا دشت محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر کبھی قلندر کبھی بگولہ کبھی خیال
سوانگ رچائے اور گزر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

زیست خدا جانے ہے کیا شے بھوک تجسس اشک فرار
پھول سے بچے زہرہ جبینیں مرد مجسم باغ و بہار
مرجھا جاتے ہیں اکثر کیوں کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے روح ارض کو آخر اور یہ زہریلے افکار
کس مٹی سے اگتے ہیں سب جینا کیوں ہے اک بیگار
ان باتوں سے قطع نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی آباد خرابے میں

دور کہیں وہ کوئل کوکی رات کے سناٹے میں دور
کچی زمیں پر بکھرا ہوگا مہکا مہکا آم کا بور
بار مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چور
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے لو دیکھو وہ صبح کا نور
چاہِ شب سے پھوٹ کے نکلا میں مغموم کبھی مسرور
سوچ رہا ہوں ادھر ادھر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

نیند سے اب بھی دور ہیں آنکھیں گو کہ رہیں شب بھر بے خواب
یادوں کے بے معنی دفتر خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو گزری بات ہے نقش بر آب

مستقبل کی سوچ، اٹھا یہ ماضی کی پارینہ کتاب
منزل ہے یہ ہوش و خبر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

تنقیدی جائزہ:

اختر الایمان کی یہ نظم ان کی مشہور نظم "ایک لڑکا" کے بعد لکھی گئی ہے اور اس طرح اسے 'ایک لڑکا' کی توضیح بھی کہا جا سکتا ہے۔ نظم تیرہ بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں سات مصرع ہیں اور ہر بند کا آخری مصرع ترجیع کا ہے جو تمام بندوں میں یکساں ہے۔ یہ اختر الایمان کے شعری ارتقا میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں نظموں میں کچھ مماثلات بھی ہیں۔ مثلاً دونوں نظمیں پس منظر میں ایک گاؤں اور پیش منظر میں ایک صنعتی شہر رکھتی ہیں اور دونوں کا کردار ایک بچہ اور ایک بالغ ہے۔ یادیں کا کردار ایک میلے میں گم ہو جاتا ہے اور یہیں سے نظم کی شروعات ہوتی ہے۔

یہ میلا زمین کا میلا ہے اور یہ رنگ برنگے کھیل کھلونے وہ تمنائیں ہیں جو شہر تمنا میں ہر معصوم روح کو مسحور کر دینے کے لیے کافی ہیں اور 'باپ' کو اس میں پائیدار اقداری نظام تجسیم سمجھنا چاہیے جو ایک سادہ لوح انسان میں وہ محفوظیت کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور جس سے الگ ہو کر وہ خود کو ایک اجنبی دنیا میں تنہا پاتا ہے۔ وہ دنیا جس کی چمک دمک نے اسے مرعوب کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک انتہائی پریشان کن صورت حال کو منکشف کرتی ہے اور اسے ہر طرف سے گھیر لیتی ہے جو کہ دوسرے بند میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس بند میں ایک ایسی صورت حال پیش کی گئی ہے جو انسانی اقدار کی عبرت ناک تصویر سامنے لاتی ہے۔ اس عبرت ناک صورت حال پر حیران اور تذبذب کا شکار ہونے والے بالک کو احمق کہا گیا ہے۔ ظاہر کہ جہاں بالک کی معصومیت، بے لوث اور بے ریا نقطہ نظر کے ساتھ دنیا کو اس تضادات کے ساتھ دیکھ رہی ہے وہاں بالک کو احمق قرار دینا بجائے خود ایک طنزیہ قول محال کی طرح ہے۔ ورنہ ایک خود فریبی کا شکار واحد متکلم کو راہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہ پیش آتی ہے۔ نظم کے باقی مختلف حصوں میں اس بالغ لڑکے کے دنیاداری کے سفر میں اسی کے ساتھ رہتے ہین اور اسی کے ساتھ جیتے ہیں اور بڑے قریب سے یہ منظر دیکھتے ہیں کہ وہ اس بے حس دنیا او غیر ذاتی ماحول میں کس طرح زندگی گزارنے کا فن سیکھتا ہے اور کیسے وہ اپنی آرزوؤں، تمناؤں، بے ساختہ جذبات یعنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر سمجھتے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ کبھی وہ ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالوں سے نظریں چراتا ہے، کبھی اپنے فن کا سودا کرتا ہے، کبھی اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے سر جھکا کر ذلت سہتا ہے، کبھی ظلم و ستم اور ریاکاری کے ہاتھوں مات کھاتا ہے اور کبھی اپنی ہوشیاری سے دوسروں کی چالاکی کو کاٹتا ہے۔ کبھی پرانی محبتوں کے کھنڈر اس لڑکے کو اداس کر جاتے ہیں اور کبھی ان اوراق پارینہ کو کرم فراموشی کے حوالے کر کے لمحہ حال کی لذتوں سے فیضیاب ہوتا ہے اور حسن و عشق کے نئے تجربوں سے گزرتا ہے۔ کبھی حصول زر اور سماجی برتری کی دوڑ میں وہ اپنا ضمیر بیچتا ہے اور کبھی عزت نفس کی چنگاری جاگ اٹھتی ہے۔ نظم کے چوتھے اور پانچویں بند میں اس کیفیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔

زندگی کے دشوار سفر میں اس سماجی زندگی کے عقدے بھی کھلتے ہیں اور وسیع تر زندگی کا کچھ اوراک بھی حاصل ہوتا ہے اور مسلسل فرار کی کوششوں کے باوجود کہیں کہیں وہ انکشافات ذات کے مرحلوں سے بھی گزرتا ہے۔ لیکن ان تمام پر غالب اس لڑکے کی نمایاں خصوصیات اس کی قوت برداشت اور جئے جانے کی صلاحیت ہے جس کا اظہار اس مصرعے کی تکرار پر ترجیع کے طور پر ہوتا ہے:

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

اس پیش کش میں شاعر کے لہجے کی بتدریج تبدیلی بھی قابل توجہ ہے۔ جیسا کہ نویں بند میں ہے یادوں کی کسک، خوابوں کی مہک، شکست خوابوں کی جھلک اور نوجوانی کی ولولہ انگیزی کی جھلک بھی موجود ہے۔ اس میں اس کی خواہشات کی جھلک دکھائی دیتے ہیں کہ وہ کیا کیا کرنے کی تمنائیں رکھتا تھا۔ لیکن اسے اس کے بدلے میں زخم جگر پر خش کے علاوہ کچھ نہیں ملتا ہے۔

اس نظم کے سیاق وسباق میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لڑکا خود اختر الایمان نہیں بلکہ ان کا ایک خیالی کردار ہے اور ایک عام انسان کا استعارہ ہے۔ یہ عام آدمی اختر الایمان کی شاعری میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے جسے مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔

16.3 ن۔م۔راشد

16.3.1 ن۔م۔راشد کے حالات زندگی اور نظم نگاری

ن۔م۔راشد یکم اگست 1910 کو مغربی پاکستان کے ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے اکال گڑھ (علی پور جٹھ) میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ دریائے چناب سے جنوب کی طرف چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ والد کا نام فضل الٰہی چشتی اور دادا کا نام غلام رسول فضلی تھا۔ پہلی شادی ماموں زاد بہن صفیہ سے 1935 میں ہوئی جن سے ان کو پانچ اولادیں (نسرین، یاسمین، شاہین، شہریار، تمرین) ہوئیں۔ راشد نے دوسری شادی لندن میں شیلا انجلبینی سے کی جن سے انہیں ایک اولاد (نزیل راشد) ہوئی۔ ن۔م۔راشد نے 1926 میں گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1928 میں گورنمنٹ کالج لائل پور سے انٹر میڈیٹ، 1930 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے اور 1932 میں اسی کالج سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

ن۔م۔راشد کی نظموں کا پہلا مجموعہ 1941 میں ماورا کے نام سے منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ 'ایران میں اجنبی' 1955 میں، تیسرا مجموعہ لا=انسان 1969 میں اور چوتھا شعری مجموعہ 'گمان کا ممکن' 1977 میں منظر عام پر آیا۔ راشد کے مقالات کا مجموعہ 'مقالات راشد' کے عنوان سے اور خطوط کا مجموعہ 'ن۔م۔راشد کے خطوط' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ راشد کے ترجمے (یاما طوائف، امی میں تمہارا ہوں، وقت کا آسماں، جدید فارسی شاعری) بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ن۔م۔راشد اپنی عمر کے آخری وقت تک لندن میں مقیم تھے اور یہیں 19 اکتوبر 1975 کو ان کا انتقال ہوا۔

ن۔م۔راشد کی شخصیت کی تعمیر میں اس کی ابتدائی زندگی کے واقعات نے حصہ لیا۔ پہلی مختصر نظم 'انسپیکڑ اور مکھیاں' طالب علمی کے زمانے میں سات آٹھ سال کی عمر میں 1917 میں لکھی۔ اس کے بعد اور بہت سی نظمیں لکھیں جن میں حمد، نعت، غزل وغیرہ شامل رہے لیکن اب وہ کلام دستیاب نہیں۔ اسکول میں تعلیم کے دوران راشد کا رجحان ترجمے کی طرف ہوا اور انہوں نے ملٹن، ورڈس ورتھ اور لانگ فیلوں کی انگریزی نظموں کے ترجمے کیے۔ راشد نے گورنمنٹ کالج لائل پور اور گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ راشد کے تخلیقی سفر کی ابتدا میں ان کالجوں کا اہم رول رہا ہے۔ یہاں کے مشاعرے میں طلبا اپنی نظم اور غزل لکھ کر پیش کرتے تھے۔ راشد نے اس مشاعرے میں حصہ لیا اور کئی دوسرے مقامات پر شعری مقابلوں میں انعام کے مستحق بھی ہوئے۔ اس زمانے میں لکھے گئے سانیٹ (Sonnet) ان کے مجموعہ 'ماورا' میں شامل ہیں۔

راشد نے 1932 میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد دو سال تک وہ ملتان میں رہے اور اسی درمیان آزاد نظم کہنا شروع کیا۔ انہوں نے جنس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ راشد کے والد اور دادا فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ گھر کے ادبی اور علمی ماحول نے ان کی ذہنی ترتیب میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ کالج میں راشد نے پطرس بخاری، کیننگ ہارن اور ڈکنسن جیسے اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ اسی زمانے میں چراغ حسن حسرت کا بڑا چرچہ تھا جن کے اطراف اس وقت کے طالب علموں کا خاصا مجمع لگا رہتا تھا جس میں میراجی اور ن۔م۔راشد جیسے لوگ شامل رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ وحید کیلانی، محمد دین تاثیر اور اختر شیرانی جیسے لوگوں کے خیالات و نظریات نے انہیں متاثر کیا اور ان کی اصلاحیں 'ماورا' کی ترتیب میں شامل ہیں۔ ہکسلے، آسکر وائلڈ، ڈی ایچ لارنس، ای ایم فاسٹر، تالستائی، دوستوفسکی، ملارمے، ڈی ایس ایلیٹ، رومی، حافظ، سعدی، اقبال اور غالب سے ان کی معنوی نسبت رہی۔

اگرچہ ن۔م۔راشد کی ابتدائی نظموں کے تعلق سے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا لیکن مغنی تبسم نے اپنی کتاب 'ن م راشد: شخصیت اور فن' میں کچھ کلام جمع کیا ہے جسے وہ راشد کا ابتدائی کلام شمار کرتے ہیں۔ یہ کلام غیر مطبوعہ ہے اور اس میں چھ نظمیں اور دو غزلیں شامل ہیں۔ دسمبر 1931 تک راشد نے 'مولانا خاطف' اور 'راشد وحیدی' کے قلمی نام سے لکھا۔

راشد کے کلام میں سب سے پہلے غزل ہے لیکن اس میں کوئی نیا پن نہیں۔ بلکہ محض روایتی قسم کی سادہ غزل ہے۔ اس کے بعد ایک نظم 'خیالات پریشاں' کے نام سے ملتی ہے۔ یہ نظم مولانا حاطف کے نام سے ماہنامہ 'تفریح' بجنور میں شائع ہوا۔ اس غزل اور نظم کے معیار سے معلوم ہوتا ہے کہ راشد کا ابتدائی مزاج اور رجحان روایتی تھا۔ تیسری نظم 'آرزو' کے عنوان سے ماہنامہ خیالستان، لاہور میں راشد وحیدی کے نام سے شائع ہوئی۔ 1931 میں ایک نظم 'مجھے تم سے محبت ہے' کے عنوان سے رسالہ 'خیالستان' میں شائع ہوئی۔ اسی سال ایک اور نظم 'مجھے کس سے پیار ہے' کے عنوان سے ماہنامہ 'کائنات' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس نظم پر اختر شیرانی کی رومانیت غالب ہے۔ ایک اور نظم 'زندگی، جوانی، عشق' کے عنوان سے رسالہ 'ہمایوں' میں دسمبر 1932 میں شائع ہوئی۔ یہ نظم 'ماورا' میں 'زندگی جوانی حسن' کے نام سے شامل ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ راشد کی پہلی نظم سے 'زندگی، جوانی، عشق' تک کا سفر چودہ پندرہ سال کے عرصے کو محیط ہے جس میں راشد کا تخلیقی رجحان مسلسل بدلتا رہا۔

راشد کا پہلا شعری مجموعہ ماورا' 1941 میں شائع ہوا۔ اس میں کل 37 نظمیں ہیں۔ اس مجموعہ کی انفرادیت کا امتیاز اس کی آزاد نظمیں ہیں جن کی تعداد 21 ہے، باقی 16 نظمیں قدیم طرز پر سانیٹ کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ ماورا کی نظموں میں ارتقا کا ایک زمانی تسلسل ہے۔ جو موضوع، خیال، اسلوب اور ہیئت سب کو محیط ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم 'میں اسے واقف الفت نہ کروں' ہے۔ اس کے علاوہ "رخصت، انسان، خواب کی بستی، گناہ اور محنت، ایک دن۔ لارنس باغ میں، ستارے، مری محبت جواں رہے گی، بادل، فطرت اور عہد نو کا انسان، مکافات، شاعر کا ماضی، خوابِ آوارہ" کے بارے میں کوئی قطعی اطلاع نہیں ملتی اور نہ پہلی نظم کے متعلق کوئی تاریخی ثبوت ملتا ہے۔ 'جرات پرواز' اس مجموعے کی پہلی آزاد نظم ہے جو فکر اور ہیئت دونوں اعتبار سے منفرد ہے۔

انہوں نے پابند نظموں سے زیادہ آزاد اور معریٰ نظم کو اپنی تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا اور اس میں مختلف ہئیتی تجربے کیے۔ ''ماورا''، ''ایران میں اجنبی'' انسان'' اور ''گمان میں ممکن'' ان کے شعری مجموعے ہیں جو اردو شاعری میں نئی حسیت اور نئے تجربوں کی امین ہیں۔ '' رات کے سناٹے''، '' اتفاقات''، '' دریچے کے قریب''، '' رقص''، انتقام''، '' اجنبی عورت''، '' نمرود کی خدائی'' راشد کی نمائندہ نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان کی نظم '' اتفاقات'' سے ان کے شعری رویئے اور فکری جہات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک
آ اسی خاک کو ہم جلوہ گہہ راز کریں
روحیں مل سکتی نہی ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں
آ اسی لذّتِ جاوید کا آغاز کریں
صبح جب باغ میں رس لینے کو گرہوا آئے
اس کے بوسوں سے ہو مدہوش سمن اور گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکر یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے

ان کی ایک اور نظم '' دریچے کے قریب'' بھی ملاحظہ ہو۔

اسی مینار کے سائے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت اداس
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں

ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوہ کوئی

مذکورہ بالا دونوں نظموں میں دو الگ الگ فکری لہریں موجزن ہیں۔ ایک میں ذاتی احساسات و کیفیات کا بیان ہے تو دوسرے میں سو سالوں سے ذلّت اور محرومیوں کے تاریک غار میں سوئی ہوئی قوم کا نوحہ ہے۔ یہ نظم ان کی سماجی وابستگی کا آئینہ ہے گو کہ وہ فرد کی آرزوؤں، تمنّاؤں اور اس کے وجودی مسائل کا ذکر بھی اپنی نظموں میں کرتے ہیں۔ اس طرح وہ فرد کے ساتھ ساتھ سماج کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں کیونکہ راشدؔ کا دور سیاسی انتشار اور سماجی اضطراب کا زمانہ تھا۔ اُس دور میں بیک وقت کئی سیاسی، ادبی اور سماجی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ لہذا، راشدؔ کے لیے ان تبدیلیوں اور تحریکوں سے منہ موڑنا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راشدؔ کی نظموں میں فرد کی داخلی اضطراب کے ساتھ معاشرے کا اجتماعی درد بھی فنی تقاضوں کے دائرے کے اندر ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں رومانی فضا بھی ملتی ہے مگر اس میں ایک اضطراب، ایک بے چینی اور روحانی کرب کا اظہار بھی ملتا ہے اور وہ اس اضطراب اور بے چینی کی کیفیت سے کہیں دور نکل جانا چاہتے ہیں۔

میں نالہء شب گیر کے مانند اٹھوں گا

فریاد اثر گیر کے مانند ٹھوں گا

تُو وقتِ سفر مجھ کو نہیں روک سکے گی

پہلو سے تیر کے مانند اٹھوں گا

گھبرا کے نکل جاؤں گا آغوش سے تیری

عشرتِ گہہ سرمست وضیا پوش سے تیری

(نظم۔ رخصت)

راشدؔ کے یہاں محبت کا رومانی تصور وہی ہے جو فیضؔ کے یہاں ملتا ہے۔ فیضؔ کے یہاں عشق سماجی ذمہ داریوں پر قربان ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں عشق ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ معاشرے کی پریشانیاں اور محروی عشق پر مقدم ہے اس لیے وہ کہتے ہیں۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کے راحت کے سوا

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

راشدؔ کے یہاں سماجی ذمہ داریوں کا یہی احساس اسے محبوب کی عشرت گہہ سرمست وضیا پوش سے نکل جانے پر اُکساتا ہے مگر یہاں راشد اپنی باتیں رمز وایما کے پردے میں کہتے ہیں۔ ان نظموں میں زندگی سے فرار یا پھر ایک نئے جہان کی تلاش کا جذبہ جھلکتا ہے۔ ان کی نظم ” وادیء پنہاں“ میں یہی خواہش جاگزیں ہے۔

مجھ کو ہے اب تک تلاش

زندگی کے تازہ جولاں گاہ کی

اور بیزاری سی ہے

زندگی کے کہنہ آہنگ مسلسل سے مجھے

سرزمیں زیست کی افسردگی محفل سے مجھے

یہی خواہش یہی تلاش راشدؔ کے ذہن میں باغیانہ میلان کو جنم دیتی ہے جو ان کے ہمعصر میراجیؔ اور بعد کے شعراء میں نظر آتا ہے۔ فرسودہ روایات وعقائد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا یہ سماج راشدؔ کے اندر گھٹن کا احساس پیدا کرتا ہے اور وہ تمام سماجی حد بندیوں کو توڑ کر ایک ایسی دنیا میں نکل جانا چاہتے ہیں جہاں " زندگی کا کہنہ آہنگِ مسلسل" نہ ہو اور زیست کی سرزمیں افسردہ نہ ہو۔ وہ خدا کی ذات کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو جدیدیت کے دور کی نمایاں خصوصیت ہے اور جنس کے تیئں بھی ایک باغیانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جو میراجیؔ کے یہاں بھی ملتا ہے۔ جنس میراجیؔ اور راشدؔ کے یہاں شجرِ ممنوعہ نہیں ہے اور نہ ہی جنسی خواہشات اور فرسٹریشن کے اظہار میں جھجھک ہے۔ کیونکہ وہ جنس کو انسانی فطرت کا ایک اہم جز تصور کرتے ہیں۔ اس کے گرد تقدیس کا ہالہ بُننے کے منافقانہ زاویئے کا تمسخر اُڑاتے ہیں۔ اپنی نظم " حزنِ انسان" میں انہوں نے اپنے اسی مؤقف کا اظہار کیا ہے۔ راشدؔ جنس کے مذہبی تصور کو نہیں مانتے اور اسے ویشومت کے فلسفے کے زیر اثر روحانی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

جنس سے متعلق معاشرے کے روایتی مشرقی تصور کے علاوہ راشدؔ کے یہاں خدا سے متعلق ایک باغیانہ لہجہ ملتا ہے جو نطشےؔ سے متاثر ہے۔ حلقہء ارباب ذوق اور بعد میں جدیدیت کے تحت ہونے والی شاعری میں خدا کی ذات سے متعلق تشکیک اور باغیانہ رویّہ عام تھا۔ نطشےؔ نے خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ دراصل سماجی انتشار، انسان کی بدحالی اور دنیا میں تباہی وبربادی پر شاعروں اور فلسفیوں کا غیر روایتی ردِّ عمل تھا۔ راشدؔ کے یہاں بھی خدا سے بغاوت کا کم وبیش یہی انداز ملتا ہے۔ "پہلی کرن"، "دریچے کے قریب"، "شاعرِ درماندہ" اور " اتفاقات" انکی ایسی ہی نظمیں ہیں۔

راشدؔ کی شاعری میں اگرچہ فرد کے داخلی کرب اور عقیدے کا اظہار زیادہ ہوا ہے مگر وہ گہرا سماجی شعور بھی رکھتے ہیں اور سماجی مسائل سے بھی مضطرب رہتے ہیں۔ راشدؔ ترقی پسندوں کی سماجی انقلاب کے پروپگنڈوے اور شاعری میں سیاسی نعرے بازی کے مخالف تھے مگر وہ سماج کے درد کو شاعری میں فنی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے پرونے میں بھی یقین رکھتے تھے۔ انکی نظم " مجھے وداع کر" میں اس سماجی شعور کی کارفرمائی ہے۔

راشدؔ جس دور میں شاعری کر رہے تھے وہ دور تحریک آزادی کے شباب کا دور تھا۔ غیر ملکی استبداد کے خلاف قلمی وعلمی طور پر جدوجہد جاری تھی۔ شاعروں نے اپنے اپنے اسلوب ولہجے میں اس غیر ملکی غلبے اور سامراجی طاقت کے خلاف القلاب وبغاوت کا پیغام دیا۔ راشدؔ نے بھی ایسی نظمیں کہیں جن میں بغاوت کی ترغیب اور ایک نئی صبح کی بشارت ہے۔ ان کی نظم " زنجیر" اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ آنے والے صفحات میں ہم ان کی اسی نظم کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔

راشدؔ نے موضوعاتی سطح پر جہاں اپنی انفرادیت قائم کی وہیں انہوں نے اپنے ہم عصروں میں لفظیات، اسلوب، اور ہئیت کے معاملے میں بھی الگ راہ اختیار کی۔ وہ اگرچہ میراجیؔ کے ہم عصروں میں تھے اور میراجی نےؔ اپنے ہمعصروں پر گہری چھاپ چھوڑی تھی مگر راشدؔ لفظیات کے معاملے میں میراجیؔ سے بہت مختلف تھے۔ میراجیؔ کی شاعری میں جہاں ہندی الفاظ اور ہنو دیومالا و اساطیری فضا ملتی ہے اہیں راشدؔ کے یہاں عربی و عجمی روایات کی پاسداری ہے۔ نیز راشدؔ کی لفظیات اقبالؔ کی لفظیات سے متاثر ہے۔ اپنی نظموں کو انہوں نے الفاظ کے رکھ رکھاؤ، نزاکت اور فنی تجربوں سے فنی شاہکار بنادیا۔

ن۔م۔راشد نے جدید نظم کو انتہائی بلندی عطا کی اور نئی نظم کو اظہار کے نئے زاویئے سے روشناس کیا۔ انہوں نے اردو نظم کو مغربی شاعری کے فنی و جمالیاتی اقدار سے متعارف کرایا اور جدید دور کے انسان کے مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو نظموں کا لبادہ عطا کیا۔ علاوہ ازیں نظم کی ہئیت کو نئے موضوعات کی پیش کش کے لیے اپنایا اور اسے عروج عطا کیا۔ وہ ہئیت کے متعلق اپنے موقف کا اظہار اپنے مضمون ”جدیدیت کیا ہے“ میں کرتے ہیں:

” جدید شاعری کے نزدیک جہاں ہئیت کی کوئی پابندی نہیں وہیں موضوعات کا میدان بے کنار ہے بلکہ ہئیت کی پابندی بھی اس لیے نہیں تا کہ وہ موضوعات کی مجبوری کا بہانہ نہ بن جائے۔“

اس طرح راشد نظم کو ہئیتی پابندیوں سے اس لیے آزاد کرتے ہیں تا کہ اس میں انسان اور معاشرے سے متعلق کوئی بھی موضوع کسی بھی نقطہء نظر یا عقیدے کے تحت نظم کی جا سکے اور اس موضوع کو نظم کرنے میں ہئیت آڑے نہ آئے۔ راشدؔ کے پہلے دو شعری مجموعوں ” ماورا“ اور ” ایران میں اجنبی“ میں پابند نظموں کا آہنگ ملتا ہے مگر بعد میں انہوں نے کھل کر آزاد نظوں کی ہئیت کا استعمال کیا اور اس میں اظہار کے نئے نئے طریقے تلاش کیے۔ انہوں نے مصرعوں میں داخلی آہنگ اور موسیقیت پر زیادہ زور دا اور الفاظ کی نشست و برخاست پر خصوصی توجہ دی۔ راشدؔ نے اردو نظم کو موضوعاتی، ہئیتی اور اسلوبیاتی سطح پر باغیانہ روش سے مالا مال کیا اور اردو ادب پر جو جمود طاری تھا اس کو توڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ راشدؔ جدید اردو نظم میں ایک ہم سنگ میل کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے۔

16.3.2 نظم 'زنجیر' کا متن اور تنقیدی جائزہ:

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگ خارا ہی سہی خار مغیلاں ہی سہی
دشمن جاں دشمن جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں

یہ بھی تو مخمل نہیں دیبا نہیں ریشم نہیں
ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لیے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تارہائے سیم و زر
ان کے مردوں کے لیے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال
شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں ریگ زاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آور کو
حیلۂ شب خوں بناؤ

تنقیدی جائزہ:

یہ نظم ن۔م۔راشد کے شعری مجموعہ 'ایران میں اجنبی' میں شامل ہے اور اس کا تجزیہ میر اجی نے 'زنجیر ایک جائزہ' کے نام سے کیا ہے۔ اس نظم میں راشد نے سالہا سال سے غلامی اور بے بسی میں زندگی بسر کر رہے ملک کا نقشہ استعاروں اور کنایوں میں بیان کیا ہے۔ نظم کے دوسرے اور تیسرے بند کا مفہوم نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے لیکن پہلا بند نہایت پیچیدہ اور الجھن میں ڈالنے والا ہے۔ دوسرے بند میں پیلہ سیمیں اور تیسرے بند میں ہنگام باد آور کے معنی جلد ہی متعین ہو جاتے ہیں لیکن پہلے بند میں سنگ خارا، خار مغیلاں، دوسرے وغیرہ کے استعارے ذرا مبہم دکھائی دیتے ہیں۔ اگر مفہوم کا تسلسل قائم کرنا چاہیں تو دوسرے بند کو پہلا اور پہلے کو دوسرا بند سمجھ کر پڑھنا ہوگا۔ یوں صرف دو تصور قائم ہو سکیں گے، یعنی پہلی تصویر اپنے حجلہ سیمیں میں مصروف پیلہ ریشن کی اور شاعر اسے باہر نکلنے کو کہہ رہا ہے کیونکہ ہر جگہ سینہ نخچیر میں ایک نیا ارمان، نئی امید پیدا ہونے کو ہے۔ یہ پہلی تصویر سمٹی ہوئی ہے اور دوسری تصویر پھیلی ہوئی۔ یعنی شاعر کی

للکار کے اثر سے کوہسارو، ریگ زاروں سے اس کی گونج پلٹ کر آرہی ہے اور گویا اس کی دعوت عمل کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ لیکن ان دو تصویروں کے تعین کی صورت میں درمیانی بند (جس کو پہلا بند فرض کیا ہے) کچھ بے جا معلوم ہو گا۔ نیز عنوان (زنجیر) اور اس کے متعلقات حشو محسوس ہوں گے۔ اس لیے پہلے بند کو دیکھتے ہیں۔

شاعر کے ذہن میں ایک ملک کی غلامی کا تصور ہے، پابندی کا اور وہ ملک اسے ایک پابہ زنجیر ہستی معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسی ہستی جس کی فعالیت محض اپنی غلامانہ مشقت تک محدود ہو کر رہ چکی ہے۔ یہ غلامانہ مشقت کولہو کے بیل کی سی کیفیت ہے، اس کے ذہن کو ریشم کے کیڑے کی طرف لے جاتی ہے اور اس رغبت کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اس کے خیال میں اس غلام کی محنت اور مشقت کا تمام ثمرہ ایک دور کے ملک میں وہاں کی عورتوں کی آرائش اور زینت میں صرف ہوتا ہے۔ غالباً عورتوں کا دھیان آتے ہی حجلہ سیمیں شبنم، مخمل، دیبا، ریشم وغیرہ ایسے الفاظ اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ غلام کا بنایا ہوا سامان عورتوں کی زینت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ یہ خیال اس کے ذہن کو ریشم کے کیڑے کی ملک کی گزشتہ تاریخ کا ایک تلخ واقعہ یاد دلاتا ہے۔ جب پیلہ ریشم کو دست بریدہ بنا دیا گیا تھا۔ 'بے دست وپا' اسی نسبت سے آیا ہے۔ نیز اس نسبت سے بھی کہ پیلہ ریشم بھی اپنے حجلہ سیمیں کے اندر سمٹا سمٹایا بے دست وپا ہیولیٰ ہے۔

اس کے بعد کے بند میں شاعر اور پیلہ سیمیں، پیلہ ریشم کا مکالمہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر جگہ پھر سینہ نخچیر میں ایک نیا ارمان، نئی امید پیدا ہو چلی ہے، اس لیے حجلہ سیمیں سے تو بھی پیلہ ریشم نکل۔ پیلہ ریشم کہتا ہے کہ اس وقت اگر میں نے جنبش کی تو میں بالواسطہ مدد کروں گا جو اپنی بربریت اور ظلم و سختی کے باعث سنگ خاراں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر سنگ خاراہیں تو سنگ خاراہی سہی۔ پیلہ ریشم کہتا ہے کہ میں بالواسطہ (ن) کی مدد کروں گا جو اپنے عمل کی تیزی اور اپنے مظالم کی تندی کے باعث خار مغیلاں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ خار مغیلاں ہی سہی۔ پیلہ ریشم کہتا ہے کہ اس کے علاوہ یہ سنگ خارا اور یہ کار مغیلاں۔ جو میرا دوست ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دوست ہے تو اس کے باوجود بھی۔

ریشم کہتا ہے کہ نکل! کیوں کہ دوست بھی تو سنگ خارا اور مغیلاں ہی کم نوع سے ہے۔ یہ بھی تو شبنم نہیں مخمل نہیں مخمل نہیں دنیا نہیں، ریشم نہیں۔ یہاں پہنچ کر جب شاعر کے ذہن میں مخمل، دیبا، ریشم کا خیال آتا ہے تو اس کا ذہن پیلہ ریشم کی گزشتہ تاریخ کی طرف رجوع کرتا ہے اور وہ گریز کرتا ہے کہ اے کیڑے اگر تو نے جن عورتوں کے لیے سالہا سال تارہائے سیم وزر بنے ہیں ان کے مردوں کے لیے بھی آج ایک جال بنا دے۔ معلوم نہیں اس پیلہ ریشم پر اس وعظ کا کیا ردعمل ہوتا ہے لیکن شاعر کے ذہن میں یہ عکس پیدا ہوتا ہے کہ اب قیدی کی زنجیر جو ڈھیلی پڑی تھی تن گئی ہے۔ کیونکہ اس کے کھونٹے والے حصے میں نہ صرف جنبش بلکہ ایک لرزش پیدا ہو چلی ہے۔ یہاں اس کا لحاظ رہے کہ جنبش کا وقفہ کم اور لرزش کا وقفہ زیادہ ہوتا ہے۔ جنبش محض ایک حرکت ہے اور لرزش ایک متواتر حرکت ہے چنانچہ لرزش سے قیدی کی فعالیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح کا ایک کنایہ دوسرے مصرعے (ایک نئی جنبش ہویدا ہو چلی) میں ہے۔ نئی اس لیے کہ پہلی جنبش غلامانہ مشقت کی ضرورت سے تھی۔ یہ دوسری جنبش نئی ہے۔ یہ غلامی کو دور کرنے کے لیے ایک نئی حرکت ہے۔

ن۔م۔راشد نے اپنے استعاروں اور کنایوں کی بنیاد پر اس نظم کو بلند و بالا بنا دیا ہے۔ نیز سیاسی لحاظ سے یہ ان کی پہلی خالص نظم

ہے۔ اگرچہ اس میں بھی فرنگی عورتوں اور ان کے حسن روز افزوں کی زینت کا احساس اس کی جنسی رغبت کی غمازی کرتا ہے اور یہ خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ شاید اسی قسم کی عورتوں کے حضور میں ناکامی ہی شاعر کے لیے اس للکار کی تحریک کا باعث بنی ہوئی ہے، لیکن اگر یوں ہے تو بھی یہ نفس لاشعوری کی بات ہے۔

16.4 میراجی

16.4.1 میراجی کے حالات زندگی اور نظم نگاری:

میراجی منشی مہتاب دین سب انجینئر (ریلوے) کے ہاں 25 مئی 1912ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام محمد ثناء اللہ ثانی ڈار تھا۔ والد صاحب ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں کا رخ کرتے رہے، اس لیے میراجی کی تعلیم ادھوری دی گئی اور آپ میٹرک بھی نہ کر سکے۔ میراجی نے گجرات کاٹھیاواڑ، بلوچستان، بکھر اور ملتان کی سیاحت کی۔ اس سیاحت کے اثرات ان کی شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آپ ایک ہندو بنگالن لڑکی میرا سین کے عشق میں گرفتار ہوئے اور ثناء اللہ ڈار سے میراجی ہو گئے۔ آپ کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ آپ نے دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کا مطالعہ کیا۔ ادبی دنیا، ساقی (دہلی) اور خیال (ممبئی) کی ادارت کی۔ آل انڈیا ریڈیو میں آپ نے ملازمت بھی کی۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں آپ نے گیت لکھنے شروع کر دیے۔ 3 نومبر 1949ء کو بمبئی میں کنگ ایڈورڈ ہسپتال میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ آپ کے جنازے میں چار آدمی شریک ہوئے اور کمیٹی کے قبرستان میرن لائن میں آسودہ خاک ہوئے۔

میراجی نے صرف 38 سال کی حیات میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں نظم، گیت، تراجم اور تنقید شامل ہیں۔ شاعری کے میدان میں میراجی نے گیت، میراجی کی نظمیں، گیت ہی گیت، پابند نظمیں جیسی کتابوں کے ذریعے اردو شاعری میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ میراجی کی نظمیں کے عنوان سے انیس ناگی اور مرغوب علی نے ان کی نظموں کو ترتیب بھی دیا ہے۔ تنقید کے میدان میں میراجی کی 'اس نظم میں' سے کون واقف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مشرق و مغرب کے نغمے، نگار خانہ اور خیمے کے آس پاس کے عنوان سے ترجمے بھی کیے ہیں۔ جمیل جالبی نے میراجی کے ان تمام کارناموں کو یکجا کر کے 'کلیات میراجی' کے عنوان سے شائع کرایا ہے۔

میراجی کی ذات سے بہت سی کہانیاں منسوب کی جاتی ہے۔ ان کی ہیئت کذائی بڑی عجیب و غریب تھی۔ ان کے بال لمبے تھے، مونچھیں بڑی بڑی تھیں، ان کے گلے میں موٹے دانوں کی لمبی مالا پڑی ہوتی تھی۔ کٹی پتلونیں پہنتے تھے۔ اس کے اوپر کہنیوں سے پھٹی ہوئی شیروانی پہنتے۔ جیبوں میں ایک پائپ، تمباکو بھری کاغذ کی پوٹلی، پان کی ڈبیا اور ہومیو پیتھک ادویات ہوتیں۔ اعجاز احمد، میراجی کے حلیے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "زندگی کے آخری سالوں میں اس نے اپنے آپ پر کمال عیاری کے ساتھ ایسی ہیئت طاری کر لی تھی کہ دیکھنے والا اسے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔ سادھو، نیوراتی، مجرم، کسی فیکٹری کا ادنیٰ ملازم، چلتی

پھرتی لاش، جب اس نے جوانی میں ہی انتقال کیا تو مرنے کی عمر اس کی ابھی نہ تھی۔ مگر جینا اس کے لیے دوبھر بھی ہو چکا تھا اور شاید بے معنی بھی۔ اس کی زندگی کی داستاں دکھوں کی ایک بقچی ہے، جس میں ہر رنگ کی کترن ملے گی اور شخصیت میں جھوٹ، چالاکی، ذہانت، علم، عیاری، درد سب کچھ ہے۔"

میرا جی کی زندگی شاعری سے عبارت تھی۔ شاعری کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین، جو "مشرق و مغرب کے نغمے" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ میرا جی روس کے شاعر پشکن، فرانس کے فرانساں ویلاں، مغربی شاعر طامس مور، انگلستان کے جان فیلڈ، فرانس کے بادلیئر، بنگال کے چنڈی داس، جرمن کے ہائنے اور انگلینڈ کے ڈی ایچ لارنس سے متاثر تھے اور ان کی شاعری میں ان تمام شعرا کے نظریات وخیالات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ میرا جی کا شمار جدید شاعری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے جدید شاعری کی ہئیت میں نئے نئے تجربات کیے اور شاعری کو نئے امکانات اور نئے رجحانات سے مالامال کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق میرا جی کی شاعری کا کینوس وسیع ہے۔ وہ نئے امکانات اور نئے رجحانات کے شاعر ہیں لیکن ناقدین نے ان کی ہیئت کذائی، ان کے حلیے اور ان کی عجیب وغریب عادات پر زیادہ خامہ فرسائی کی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میرا جی مغرب کے جن شعرا سے متاثر تھے انہوں نے ان جیسی عادات اپنائی اور اردو ادب میں نئی شاعری کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی میرا جی کی جدید شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا جی کی شاعری نے اردو شاعری کی شعری ساخت پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ رموز او قاف کو کامیابی کے ساتھ شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ آج کا شاعر زبان و بیان، طرز و اسلوب اور جدید میشوں کو جس اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہے، اس میں میرا جی کا حصہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔"

جب میرا جی کی شاعری منظر عام پر آئی ان دونوں ترقی پسند تحریک شاعری کو ایک بنے بنائے سانچے میں ڈھال چکی تھی۔ میرا جی نے ان سانچوں سے انحراف کیا اور اپنی شاعری میں نئے موسم اور نئے رنگ متعارف کروائے۔ انہیں بنے بنائے راستوں پر چلنا گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے سیدھی سادی منظر کشی اور تصویر کشی سے گریز کیا اور مدہم نقطوں اور مٹی ہوئی لکیروں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی شاعری میں علامات اور استعارے ملتے ہیں۔ بات کو بڑھانا انہیں خوش نہ آیا بلکہ انہوں نے بات کو سمیٹنا اور پیٹنا پسند کیا۔ میرا جی ماضی میں جھانکتے ہیں یعنی ان کی شاعری میں ہندی تہذیب مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ جنس ان کی شاعری میں برقی رو کی طرح دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میرا جی کی شاعری پڑھ کر انسان میٹھا میٹھا درد محسوس کرتا ہے۔ یہاں فیض کی طرح انقلابی لہریں موجود ہیں۔

میرا جی نے جس وقت شاعری شروع کی اس وقت فن شاعری میں جنس کا اظہار شجر ممنوعہ تھا۔ اردو غزل میں محبوب کا تذکرہ بھی ایک مذکر کردار کے ذریعے ہوتا تھا۔ میرا جی نے جنسی جذبے کو اپنے فن کا حصہ بنا دیا۔

میرا جی کی زندگی میں ایک ہندو بنگالن عورت میرا سین داخل ہوئی۔ میرا جی اس کے عشق میں اتنے ڈوب گئے کہ انہیں اپنے

ظاہر کی کوئی خبر نہ رہی۔ انہوں نے عشق کی ناکامی کا بدلہ اپنی ذات سے لیا۔ اپنے غیر مقبول حلیہ کی وجہ سے وہ عام معاشرے کے لیے قابل نفرت ہو گئے۔ ویسے بھی وہ دوستوں کو اپنے سے بے زار اور ناراض کر دیتے تھے۔ شراب اتنی زیادہ پیتے کہ راستوں اور گزر گاہوں میں گرے ہوتے۔

میرا جی کی جنسی علامات کو سمجھنا آسان نہیں۔ چاند میرا جی کے ہاں محبت اور الفت کی علامت ہے۔ دن فرد کی غیر جنسی زندگی کو ظاہر کرتا ہے اور رات کا سایہ جنس کی علامت ہے۔ جمیل جالبی میرا جی کی جنسیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میرا جی نے جنسی خواہشات کو قلبی رفاقت سے علیحدہ کر کے جنسی زندگی کی ساری سماجی اہمیت کو نظر انداز کر دیا اور اس حد تک انتہا پسند ہو گئے کہ جنسی بے راہ روی اور نراج کو بھی برا نہ سمجھا۔ لب جوئے بار، اونچا مکان، حرامی، طوائف اور اغوا جیسی نظمیں اس نظریہ کی شاہد ہیں۔"

میرا جی نے جب نئے موضوعات، نئی علامات اور نئی ہیئت و تراکیب کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا تو ایک ابہام پیدا ہو گیا۔ جب نئے راستے دریافت کیے جا رہے ہوں، اظہار و ابلاغ کے چبائے ہوئے نوالوں کو چبانے سے گریز کیا جا رہا ہو، جب شاعری کے ان دیکھے جزیروں کی سمت سفر جاری ہو تو ابہام کا در آنا بعید نہیں ہوتا۔ آغاز میں ابہام تک رسائی حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا، رفتہ رفتہ ابہام خود بخود آسان ہوتا چلا گیا۔ جنس نگاری اور جنس پرستی کی بدولت ابہام پیدا ہوا تھا۔ میرا جی کی شاعری کا انسان بزدل، بے حوصلہ اور احساس کمتری کا شکار ہے۔ افسردگی، اداسی اور پریشانی ان کی شاعری کے نمایاں عناصر ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

جیون کی ندی رک نہ جائے
رک جائے تو رک جائے
رک جائے تو رک جائے

میرا جی اپنی شاعری میں ابہام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جدید شاعری کی آمد اور مغربی تعلیم و تہذیب کے اثرات سے شاعری میں ابہام کے بعض نئے پہلو بھی نکل آئے ہیں اور ان پر غور و خوض کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ شاعر کی ذہنی اور نفسی حرکات کو بھی تخلیق فن میں پہلے سے اب بہت زیادہ دخل ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہ لیجیے کہ اب شاعری پہلے کی نسبت، بہت زیادہ ذاتی و انفرادی ہوتی جا رہی ہے۔ شاعر کے ذہن میں ایک خیال یا تصور پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کے اظہار کے لیے عام زبان سے ہٹ کر خاص اور مناسب الفاظ کی تلاش کرتا ہے، جو اس کے تصورات سے پورے طور پر ہم آہنگ ہوں اور اس اجنبیت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بھی شاعر کے نقطہ نظر سے اپنے ذہن کی حرکت

کو شروع کریں ورنہ ہمیں اس کی تخلیق میں ابہام اور اغلاق نظر آئے گا اور اگرچہ وہ ابہام ہمارے سمجھنے میں ہو گا یعنی ہماری ذات میں لیکن ہم اسے بے صبری میں شاعر کے سر منڈھ دیں گے۔"

میرا جی کی زندگی نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھی۔ اس نے جنسی تسکین کے لیے خود لذتیت جیسی بیمار سوچ کو اپنایا۔ یہی اس کا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ عورت سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور مریضانہ تخیل کی وادیوں میں پناہ لیتا ہے۔ یہ جذبہ اس کی نظموں میں ایک نفسیاتی المیہ بن کر ابھرتا ہے۔ میرا جی انسان کے لباس کو مورد الزام ٹھہراتا ہے کہ اس لباس نے انسان کے اندر جذبہ تجسس کو ابھارا، جب انسان کو لباس کی ضرورت نہیں تھی، اس وقت اس کی آنکھ کو کچھ دیکھنے کی خواہش نہیں تھی۔

میرا جی کی شاعری میں ہندوستانی عورت بطور علامت سامنے آتی ہے۔ میرا جی اس عورت کے جسمانی خدوخال کی تصویریں بناتا ہے۔ میرا جی کی محبت میں پیار، الفت، روح کی بے چینی اور جسم کی پکار جھلکتی ہے۔ اس کے گیت سن کر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک عورت نے کسی جوگی کے دل میں پیار کی جوت جگائی اور پھر پیار کی چنگاری بجھ گئی۔ وہ جوگی اس پیار کو عمر بھر فراموش نہ کر سکا اور اس نے اپنے لاشعور کی زندگی کو اپنا لیا۔ میرا جی ناآسودہ خواہشات اور کچلی ہوئی جنسیت کی ناؤ میں سوار تھے۔ اس لیے ان کی نفسیاتی الجھنوں نے انہیں بھری محفل میں تنہا کر دیا۔ وہ جنس پر معاشرے کی عائد کردہ پابندیوں کے مخالف ہیں۔ وہ جنس کو فطرت کا ایک تحفہ گردانتے ہیں۔ میرا جی نسوانی پیکر تراشتے ہیں۔ وہ رنگ اور روشنی کا اظہار کرتے ہیں۔ میرا جی کی زندگی عجیب و غریب محرومیوں اور الجھنوں کا موقع ہے۔ نقاد ان کی ناآسودگیوں اور محرومیوں کی بڑی وجہ ان کے ناکام عشق کو گردانتے ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کہتے ہیں کہ میرا جی خود اذیتی اور ناآسودگی کا شکار تھے۔ کیا یہ خود اذیتی اور ناآسودگی ان کی اپنی پیدا کردہ تھی۔ ن۔ م۔ راشد یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ وہ دوسروں سے منفرد دکھائی دیں۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی کہ میرا جی نے ظاہری زندگی سے منہ موڑ کر اندر کی دنیا میں پناہ تلاش کی؟ انہوں نے جنسی تسکین کے لیے جو حربہ اختیار کیا، کیا یہ مہذب تھا؟ میرا جی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اس میں سیاسی و سماجی جبر اور دباؤ موجود تھا۔ اسی جبر اور دباؤ نے انہیں ایک نیا جزیرہ دریافت کرنے پر مجبور کیا۔

میرا جی کو اپنے گردوپیش میں خلا ہی خلا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم کی یہ سطور دیکھیے:

بہت دور انسان ٹھٹکا کھڑا ہے
ایسے ایک شعلہ نظر آ رہا ہے
مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلا ہے
تخیل نے یوں اس کو دھوکا دیا ہے
عدم اس تصور پہ جھنجھلا رہا ہے
نفس در نفس کا بہانہ بنا ہے
حقیقت کا آئینہ ٹوٹا پڑا ہے

تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا ہے وہ کیا ہے
خلا ہی خلا ہے خلا ہی خلا ہے

شاعری کا اصل مقصد ابلاغ ہے۔ شاعری میں بات قارئین تک پہنچانے کے لیے تشبیہات، استعارات، اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ شاعر اپنی بات کو مخفی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اسے کھل کر بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ ایسے میں علامتیں اور اشارے اس کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ معاشرے میں جبر، حکومتی دباؤ اور دیگر سماجی بندشیں شاعری کو علامتوں کے استعمال پر مجبور کر دیتی ہیں۔ پڑھنے والے اگر شاعر کی ان علامتوں کو سمجھ لیں تو شاعر کا تخیل واضح ہو جاتا ہے۔ میرا جی کا دور سیاسی سماجی لحاظ سے انتشار سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے اردو ادب میں جدید شاعری کی بنا میرا جی نے رکھی۔ میرا جی نے فرانسیسی شاعروں کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے فرانسیسی شاعروں کی علامتوں کو سمجھا اور پھر اپنی شاعری میں علامتوں کو استعمال کیا۔ میرا جی نے جن مسائل پر لکھا ہے، اگر انہیں صاف صاف لکھ دیا جائے تو وہ شاعری نہیں بن پائے گی۔ میرا جی علامتوں میں بڑی سہولت سے بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے تھے۔ وہ الگ بحث ہے کہ ان کی علامتیں غیر واضح اور الجھی ہوئی ہیں۔ ”چاند“ میرا جی کی شاعری میں محبت اور ”رات“ جنسی جذبے کی علامت ہے۔ ”ندی“ اور ”کنواں“ عورت کی علامات ہیں۔ میرا جی علامتیں استعمال کرتے ہوئے اعلیٰ سلیقے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لاشعور کی داستان علامتوں کے پردے میں سنائی ہے۔ وہ جنس کے اجاڑ رستوں کو بادل، سمندر اور ٹیلے جیسی علامات کے ذریعے سامنے لاتے ہیں۔ میرا جی اشاروں کنایوں کے حوالے سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہیئت اور آہنگ کے لحاظ سے آزاد نظم کو مکمل طور صرف میرا جی نے برتا ہے۔ میرا جی نے جس معاشرے میں جن موضوعات کا راگ چھیڑا، اس معاشرے کی سماعتیں ایسے راگ سے مانوس نہیں تھیں۔ یہ تو اُردو ادب میں ایک بہادری کا کام تھا۔ میرا جی نے بات اپنے انداز میں کی۔ انہوں نے قدیم شعری روایات سے انحراف کیا اور اپنے لیے نئے نئے راستوں کا انتخاب کیا۔ غالب نے کہا تھا:

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

میرا جی بھی بت شکن ثابت ہوئے۔ انہوں نے اردو شاعری کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ ہیئت اور عروض کے تجربات بھی کیے۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اگلے لوگوں کو اظہار و ابلاغ کے نئے راستے مل گئے۔ میرا جی کی تشبیہات، استعارات اور علامات اردو شعری روایات سے ہٹ کر تھیں۔ انھوں نے جنس کو موضوع بنایا اور پھر اس کے لیے نئی نئی علامات تخلیق کیں۔ صراحی بھی نئی تھی اور شراب بھی نئی۔ میرا جی کا محبوب موضوع جنس ہے۔ انہوں نے ہندی شعری روایت اپنائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عورت کے جسم و روح کی تصویر کشی کرنا چاہتے تھے۔

16.4.2 نظم 'کلرک کا نغمہ محبت' کا متن اور تنقیدی جائزہ:

سب رات مری سپنوں میں گزر جاتی ہے اور میں سوتا ہوں

پھر صبح کی دیوی آتی ہے
اپنے بستر سے اٹھتا ہوں منہ دھوتا ہوں
لایا تھا کل جو ڈبل روٹی
اس میں سے آدھی کھائی تھی
باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ ہے
دنیا کے رنگ انوکھے ہیں
جو میرے سامنے رہتا ہے اس کے گھر میں گھر والی ہے
اور دائیں پہلو میں اک منزل کا ہے مکاں وہ خالی ہے
اور بائیں جانب اک عیاش ہے جس کے ہاں اک داشتہ ہے
اور ان سب میں اک میں بھی ہوں لیکن بس تو ہی نہیں
ہیں اور تو سب آرام مجھے اک گیسوؤں کی خوشبو ہی نہیں
فارغ ہوتا ہوں ناشتے سے اور اپنے گھر سے نکلتا ہوں
دفتر کی راہ پر چلتا ہوں
رستے میں شہر کی رونق ہے اک تانگہ ہے دو کاریں ہیں
بچے مکتب کو جاتے ہیں اور تانگوں کی کیا بات کہوں
کاریں تو چھچھلتی بجلی ہیں تانگوں کے تیروں کو کیسے سہوں
یہ مانا ان میں شریفوں کے گھر کی دھن دولت ہے مایا ہے
کچھ شوخ بھی ہیں معصوم بھی ہیں
لیکن رستے پر پیدل مجھ سے بدقسمت مغموم بھی ہیں
تانگوں پر برق تبسم ہے
باتوں کا میٹھا ترنم ہے
اکساتا ہے دھیان یہ رہ رہ کر قدرت کے دل میں ترحم ہے
ہر چیز تو ہے موجود یہاں اک تو ہی نہیں اک تو ہی نہیں
اور میری آنکھوں میں رونے کی ہمت ہی نہیں آنسو ہی نہیں
جوں توں رستہ کٹ جاتا ہے اور بندی خانہ آتا ہے

چل کام میں اپنے دل کو لگا یوں کوئی مجھے سمجھاتا ہے
میں دھیرے دھیرے دفتر میں اپنے دل کو لے جاتا ہوں
نادان ہے دل مورکھ بچہ اک اور طرح دے جاتا ہوں
پھر کام کا دریا بہتا ہے اور ہوش مجھے کب رہتا ہے
جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپراسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے ووں کہتا ہے لیکن بے کار ہی رہتا ہے
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لیے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں
اور دل میں آگ سلگتی ہے میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا
اور تو ہوتی
لیکن میں تو اک منشی ہوں تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے

تنقیدی جائزہ:

یہ نظم 'کلیات میراجی' کی اڑتیسویں نظم ہے۔ اس نظم میں میراجی نے خود ایک کردار کے طور پر ایک ایسے معاشرے کے فرد کی نمائندگی کی ہے جو زندگی کو جوش و خروش کے ساتھ جینے کی تمنا تو رکھتا ہے لیکن ناسازگار حالات کی بنیاد پر اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل پاتی۔ اگرچہ کا عنوان 'کلرک' سے متعلق ہے لیکن اس نظم کا انطباق معاشرے کے دوئم درجے کی زندگی گزارنے والے ہر فرد پر ہوتا ہے۔ اس نظم میں کلرک کی ذہنیت اور نفسیات کی عکاسی بھی بڑے خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ ذہنی انتشار کو شاعر نے فن کاری کے ساتھ نظم کی شکل میں پیش کیا ہے۔

اس نظم میں میراجی نے ایمائیت کے سہارے یہ بات بھی قاری کے ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ عام انسان قدرت کے سب سے انمول تحفے (محبت) کے حصول میں بھی ناکام ہے۔ یہ محرومی ناسازگار حالات کی وجہ سے اس کی تقدیر بنی ہوئی ہے۔ اس بنا پر نظم کا مرکزی کردار واحد متکلم کا لہجہ کہیں کہیں تلخ اور ترش بھی ہو جاتا ہے اور وہ سماج کے ٹھیکے داروں کے سامنے خدا کو بھی طنز کا شکار بنا دیتا ہے۔ اس نظم میں میراجی نے جذبہ محبت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ویسے تو میراجی کی یہ نظم مختلف ٹکڑوں کی شکل میں موجود ہے لیکن محسوسات کی سطح پر اس کے مختلف حصے کیے جاسکتے ہیں۔

اس نظم کے ابتدائی حصے میں زندگی کے عام معمولات کا سادہ بیان ہے۔ مصرعے چھوٹے ہیں لیکن غنائیت اور نغمگیت سے بھرپور ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ پوری نظم ہی موسیقیت اور نغمگیت سے بھرپور ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ چونکہ یہ کلرکر کا نغمہ محبت ہے اور نظم واحد متکلم کے صیغے میں ہے اس لیے شاعر کے بجائے کلرک کے نام سے مخاطب کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

کلرک کی تمام رات خوابوں میں گزر جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے خواب میں اقتصادی کشمکش، محبت کا فقدان جیسی چیزیں ہی آتی ہوں گی۔ وہ پوری رات خواب دیکھتا ہے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے۔ رات میں خواب کی مناسبت سے صبح کی دیوی کا استعمال ہوا ہے۔ پھر وہ اٹھتا ہے اور اپنا منہ دھو کر ایک روز قبل لائی گئی ڈبل روٹی کھاتا ہے جس میں سے آدھی ایک روز پہلے ہی کھالی تھی۔ ایک ڈبل روٹی کو آدھا کھانا اور پھر اسے اگلے دن تک اس کو رکھنا اس کلرک کی مفلسی کا استعارہ ہے۔

اگلے بند میں وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کے رنگ انوکھے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جیسی میری زندگی ہے اسی طرح کی دوسروں کی زندگی ہے۔ وہ اپنے آس پاس کی خبر رکھتا ہے۔ اس کے سامنے والے گھر میں ایک عورت رہتی ہے اور دائیں جانب کا مکان خالی ہے۔ بائیں جانب ایک عیاش شخص رہتا ہے جس کے ساتھ ایک بغیر منکوحہ عورت رہتی ہے۔ واحد متکلم کہتا ہے کہ میں ان لوگوں کے درمیان میں ہی رہتا ہوں لیکن میرے پاس دنیا کی کوئی آسائش موجود نہیں ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے تو جیسے تیسے گزاری جا سکتی ہے لیکن محبت کے بغیر اسے گزارنا مشکل ہے اس لیے وہ کہتا ہے کہ میرے پاس دوسرے آرام تو میسر ہیں لیکن زلفوں کی خوشبو نہیں ہے۔

ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ گھر سے دفتر کے لیے نکلتا ہے تو راستے کی تفصیلات بھی بتاتا جاتا ہے۔ راستے میں شہر کی رونق دکھتی ہے۔ جس میں تانگہ اور کاریں ہیں۔ بچے اسکول جا رہے ہیں۔ لوگوں کو تانگہ پر بیٹھا دیکھ کر اس کے دل پر تیر چلتے ہیں کیونکہ وہ اپنی تنگ دستی کی وجہ سے اس پر سوار نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بات بھی قبول کرتا ہے کہ اس میں کچھ لوگ شریف بھی ہیں، کچھ شوخ معصوم ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات کو کہنے سے گریز نہیں کرتا ہے کہ ان میں ہی میرے جیسے سڑک پر چلتے ہوئے بدقسمت لوگ بھی ہیں۔ راستے میں چلتے ہوئے تانگوں پر برق ترنم ہے یعنی خوبصورت لوگ بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں اور یہ بات اسے بار بار اکساتی ہے کہ قدرت کے دل میں تو رحم بھی ہے تو وہ رحم مجھ پر کیوں نہیں۔ اسی بات پر اس کو اپنی تنہائی بار بار ستاتی ہے اور وہ بار بار کہتا ہے کہ میرے پاس اور چیزیں تو ہیں لیکن تو نہیں ہے۔ چونکہ اس کی آنکھیں اس کے انتظار میں پتھر ہو چکی ہیں اس لیے اس میں نہ رونے کی ہمت ہے نہ آنکھ میں آنسو ہیں۔

یہ تمام باتیں سوچتے ہوئے کسی طرح اس کا رستہ کٹ جاتا ہے اور وہ اپنے دفتر پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے کہ اب اپنے کام پر لگ جا۔ راستے میں جو کچھ آرام و آسائش دیکھیں ہیں ان کو نظر انداز کر اور اپنے کام پر دھیان دے۔ اس طرح وہ آہستہ آہستہ اپنے دل کو دفتر میں لگا لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے مقدر میں خوشی اور محبت نہیں آئے گی لیکن وہ اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے۔ اس کے کام کی کثرت کی وجہ سے اسے اپنا ہوش تک نہیں رہتا ہے۔

جب آدھا دن گزر جاتا ہے تو اس کا افسر آتا ہے۔ یہاں پر میراجی نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تمام قوانین ادنیٰ درجے کے نوکروں کے لیے ہی ہوتے ہیں، بڑے لوگوں کے لیے نہ تو کوئی قانون ہوتا ہے اور نہ وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ آدھا

دن گزرنے کے لیے بعد افسر آتا ہے اور مجھے چپراسی سے اپنے کمرے میں بلواتا ہے۔ وہ اپنا رعب جمانے کے لیے بہت ساری باتیں کہتا ہے اور کلرک اس کی باتوں کو سنتا ہے اور سنتے سنتے تھک جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں کوئی بل لینے کے لیے آتا ہے تو اس کے دل میں پھر سے وہ آگ سلگتی ہے کہ اگر میں بھی اس کی طرح کوئی افسر ہوتا تو میرا گھر بھی شہر کے کسی کشادہ مقام پر ہوتا ہے اور تب شاید (معشوقہ) ہوتی۔

ان سب باتوں کو سوچنے کے بعد اسے پھر خیال آتا ہے کہ میں تو ایک منشی ہوں اور تو (معشوقہ) اونچے گھر کی رانی ہے۔ یہ اس کی وہ پریم کہانی ہے جو ہمیشہ سے ہے۔ آخری مصرعے میں دھرتی سے بھی پرانی کہہ کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کہانی کسی ایک انسان کی نہیں ہے بلکہ ازل سے ہی یہ مسئلہ چلا آ رہا ہے۔

اس نظم کو پڑھنے کے بعد رشید احمد صدیقی کا ایک انشائیہ 'وکیل صاحب' یاد آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میراجی نے وکیل کے کردار کو کلرک سے بدل کر اس کو نظم میں محض چند مصرعوں میں پیش کر دیا ہے۔ اس نظم میں جہاں طبقاتی کشمکش کا شدید احساس ہے وہیں یہ بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ یہ کشمکش معاش کی بنیاد پر قائم ہے۔ دولت اور سرمائے کے زور پر انسانیت کے نت نئے رشتے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے یہ تاثر بھی پوشیدہ رکھا ہے کہ ایک عام انسان جو معاشی سطح پر مستحکم نہیں، اسے زندگی کی دوسری آسائشوں کے ساتھ محبوب کی قربت بھی نصیب نہیں ہو سکتی اور وہ محبت کے بنیادی جذبے سے محروم ہو کر وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی ایک لاش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

نظم کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ میراجی نے یہ نظم خیالی محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے مکتوب کے انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں ایک حساس عاشق اپنے ہم خیال محبوب ک اپنی زندگی کے درد میں شریک کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ اپنے دیرینہ جذبات کا بیان کر رہا ہے۔ نظم میں جگہ جگہ محبوب سے خیالی گفتگو کا گمان ہوتا ہے۔ جس کے لیے شاعر نے 'تو نہیں' یا 'اور تو ہوتی' کا جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نظم محبت کے ایک اچھوتے تصور کو واضح کرتی ہے جس میں محرومی اور مایوسی کو زندگی کے ناگزیر پہلو کی طرح پیش کیا گیا ہے۔

16.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اختر الایمان 12 نومبر 1915 کو قلعہ پتھر گڑھ (نجیب آباد) ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔
- ان کے بچپن کا دور خانہ بدوشوں کی طرح گزرا۔ والد امامت کے سلسلے میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے تھے۔
- اینگلو عربک کالج سے بی اے کرنے کے بعد ایم اے میں داخلہ نہ مل سکا۔ پھر 1941 میں ساغر نظامی کی سفارش پر چالیس روپے کے عوض 'ایشیا' کی ادارت کے سلسلے میں میرٹھ چلے گئے۔
- اختر الایمان اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ڈھائی سال تک ڈائلسس پر رہے۔ ہفتے میں دو بار ڈائلسس کرانے کی وجہ سے ان کا جسم

لاغر ہو گیا تھا۔

- اختر الایمان کے شعری مجموعوں کے دیباچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی نظم نگاری کے سلسلے کو حالی، آزاد اور بجنوری سے جوڑتے ہیں۔
- اختر الایمان کا شمار ان چند اہم شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے نظموں میں پہلے مصرعے کو عنوان بنا کر بقیہ اشعار اس کی تشریح کی ہے۔اس کی مثال ان کی نظم "یادیں" کو پیش کی جاسکتی ہیں۔
- ان کی نظم "یادیں" کو ان کی مشہور نظم "ایک لڑکا" کے بعد لکھی گئی ہے اور اس طرح اسے 'ایک لڑکا' کی توضیح بھی کہا جاسکتا ہے۔
- راشدؔ کی شاعری میں اگر چہ فرد کے داخلی کرب اور عقیدے کا اظہار زیادہ ہوا ہے مگر وہ گہرا سماجی شعور بھی رکھتے ہیں اور سماجی مسائل سے بھی مضطرب رہتے ہیں۔
- راشدؔ نے موضوعاتی سطح پر جہاں اپنی انفرادیت قائم کی وہیں انہوں نے اپنے ہم عصروں میں لفظیات، اسلوب، اور ہئیت کے معاملے میں بھی الگ راہ اختیار کی۔
- راشدؔ نے موضوعاتی سطح پر جہاں اپنی انفرادیت قائم کی وہیں انہوں نے اپنے ہم عصروں میں لفظیات، اسلوب، اور ہئیت کے معاملے میں بھی الگ راہ اختیار کی۔
- میراجی کی ذات سے بہت سی کہانیاں منسوب کی جاتی ہے۔ ان کی ہیئت کذائی بڑی عجیب و غریب تھی۔ ان کے بال لمبے تھے، مونچھیں بڑی بڑی تھیں، ان کے گلے میں موٹے دانوں کی لمبی مالا پڑی ہوتی تھی۔ کٹی پتلونیں پہنتے تھے۔
- میراجی کی ذات سے بہت سی کہانیاں منسوب کی جاتی ہے۔ ان کی ہیئت کذائی بڑی عجیب و غریب تھی۔ ان کے بال لمبے تھے، مونچھیں بڑی بڑی تھیں، ان کے گلے میں موٹے دانوں کی لمبی مالا پڑی ہوتی تھی۔ کٹی پتلونیں پہنتے تھے۔
- میراجی نئی نظم کو خام مواد اور امکانات کا ایک نیا ذخیرہ دے گئے ہیں۔ یہ کام بہت اہم سہی لیکن یہی تو سب کچھ نہیں۔
- میراجی کی جنسی علامات کو سمجھنا آسان نہیں۔ چاند میراجی کے ہاں محبت اور الفت کی علامت ہے۔ دن فرد کی غیر جنسی زندگی کو ظاہر کرتا ہے اور رات کا سایہ جنس کی علامت ہے۔

16.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
چاہِ شب	:	گہرا کھودا ہوا گڑھا، جس میں زیر زمین سوتوں سے پانی جاری ہو، کنواں
پارینہ	:	گزرا ہوا، کہنہ، قدیم، پرانا، فرسودہ، بوسیدہ
شہاب	:	لَو، زبانۂ آتش، شعلہ بلند، شعلہ جوالہ، دہکتی ہوئی آگ، دہکتی ہوئی لکڑی

تذبذب	:	شک وشبہ، پس وپیش، تردد، غیر یقینی حالت پیچ
مفر کی راہ	:	بھاگنے کی جگہ، جائے فرار،)مجازاً(کسی امر سے نجات ملنے کی صورت، چارہ کار، بچ نکلنے کی سبیل، بچاؤ، چھٹکارا
زہر آگیں	:	زہر سے بھرا ہوا، پُر، مالامال، کے معنی میں مستعمل
سفلہ	:	کمینہ، رزیل، پاجی، چھچھورا، کم ظرف، کم حوصلہ، پستی یا کم ظرفی کا، پھوہڑ پن یا کمینگی کا، گھٹیا، بے لیاقت، ناتجربہ کار، بیوقوف
ابلہ	:	بیوقوف، احمق، سادہ لوح، بھولا بھالا، نادان
فرزیں	:	سمجھدرا، چوسر میں رانی کی گوٹی
شبینہ	:	روکھی سوکھی روٹی ڈھونڈنے والا، شب کی طرف منسوب، رات کا یعنی باسی
نافۂ مشک تتاری	:	ہرن کے نافے کی خشک شدہ رطوبت جس کے دانے سیاہ سرخی مائل اور خوشبو نہایت تیز ہوتی ہے، (ہرن زیادہ تر تبت، نیپال، روس اور چین کے کوہستانی علاقوں میں پایا جاتا ہے)، کستوری، مسک
صاعقہ	:	گرنے والی بجلی جو زمین پر گرے، آسمانی بجلی، کڑک
تعطل	:	بیکاری، بیکار ہونا، معطلی، کسی سرکاری ملازم کو کسی جرم والزام کی وجہ سے اس کی مفوضہ خدمت کی ادائی سے بیکار اور باز رکھنا، معطل کرنا
غنیم	:	لٹیرا، حملہ آور بادشاہ
مہ وش	:	جس کا چہرہ چاند کی طرح ہو
شاق	:	دشُوا، مشکل، سخت، دوبھر، جو ناگوار گزرے، بار خاطر، بُرا محسوس ہونے والا، طبیعت پر بار ہونے والا
میثاق	:	عہد نامہ، عہد وپیماں، قول وقرار، اقرار مدار، وعدہ؛ معاہدہ (عموماً سیاسی)۔
بے باق	:	چکا دینا، مکمل ادائیگی، قرض اتارنا
دمڑی	:	ایک قسم کا پرانا سکہ جس کی قیمت ایک آنہ کے بتیسویں حصہ کے برابر ہوتی تھی، پیسوں کا آٹھواں حصہ
مغموم	:	غم سے بھرا ہوا
جزو لاینفک	:	ناقابل تقسیم حصہ، جو کسی چیز کا لازم جزو ہو، جس کے بغیر کوئی کام مکمل نہ ہو
مسرور	:	مغموم کا مخالف، خوش، شادماں، مگن
قالب	:	سانچہ، وہ آلہ جس میں کچھ ڈھالا جائے
رجعت	:	لوٹنا، واپس آنا، رجوع کرنا
ٹکے	:	جڑے ہوئے
غبار	:	دھند، دھواں

نقوش	:	نشانات، نقش کی جمع	کمینگی	:	سفلہ پن، دھوکے بازی
قاصر	:	ناکارہ، بے عمل، مجبور	گفت	:	بات چیت، گفتگو کا مخفف
مبہم	:	دھندلی سی، جو عیاں نہ ہو	صبح صادق	:	صبح کی سرخی مائل روشنی
مہاجر	:	ہجرت کرنے والا	جبر	:	زور، زبردستی، ظلم، دباؤ
شفاف	:	صاف، چمک دار	مضمر	:	چھپا ہوا، پوشیدہ، پنہاں
نخچیر	:	مارا ہوا شکار	ہویدا	:	کھلا ہوا، کشادہ
مغیلاں	:	خار دار درخت	حجلہ	:	دلہن کے بیٹھنے کا کمرہ
دنبالہ	:	پنچھلے دار ،دُم والا	شبگیر	:	آدھی رات کے بعد کا وقت
داشتہ	:	بغیر منکوحہ عورت	مغموم	:	غمگین، غم سے بھرا ہوا
ترحم	:	رحم	مورکھ	:	بے وقوف

16.10 نمونہ امتحانی سوالات

16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. اختر الایمان کہاں پیدا ہوئے؟
2. اختر الایمان کی پہلی نظم کس نام سے شائع ہوا؟
3. اختر الایمان کے شعری مجموعوں کا بنیادی موضوع کیا ہے؟
4. کلرک کا نغمہ محبت کا مرکزی کردار کون ہے؟
5. ن۔م۔راشد کی پہلی بیوی کا کیا نام ہے؟
6. ن۔م۔راشد نے کس موضوع پر نظمیں لکھیں؟
7. ن۔م۔راشد کی نظم 'زنجیر' کس مجموعے میں شامل ہے؟
8. میراجی مغرب کے کن شعرا سے متاثر تھے؟
9. نظم "یادیں" میں کل کتنے بند ہیں؟
10. میراجی کے دوست کا نام کیا ہے؟

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. اختر الایمان کے حالات زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

2. اخترالایمان کے تخلیقی سفر پر اظہار خیال کیجیے۔

3. ن۔م۔راشد کے حالات زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

4. میراجی کے سوانحی کوائف پر روشنی ڈالیے۔

5. میراجی کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیجیے۔

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اخترالایمان کے تخلیقی سفر میں ان کی پرورش کا کیارول رہا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

2. میراجی کی نظم نگاری کا مفصل جائزہ لیجیے۔

3. ن۔م۔راشد کی نظم نگاری کا جائزہ لیجیے۔

16.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جدید نظم حالی سے میراجی تک	کوثر مظہری
2. اس آباد خرابے میں	اخترالایمان
3. ن م راشد: فکر و فن	شہریار
4. میراجی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر رشید امجد

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات:۷۰ Marks : 70 وقت:3 گھنٹے Time: 3hours

ہدایات:

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (10x1=10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال:1

(i) نظم کے لغوی معنی کیا ہیں؟

(a) پرونا (b) الگ کرنا (c) جوڑنا (d) بانٹنا

(ii) آٹھ مصرعوں پر مشتمل بند کو کیا کہتے ہیں؟

(a) مربع (b) مسدس (c) مثمّن (d) معشّر

(iii) نظیر اکبر آبادی کا اصل نام کیا تھا؟

(a) محمد ولی (b) ولی محمد (c) ولی احمد (d) احمد ولی

(iv) ہائیکو کس ملک کی صنف ہے؟

(a) ہندوستان (b) ایران (c) جاپان (d) چین

(v) انجمن پنجاب کی بنیاد کب رکھی گئی؟

(a) 1860 (b) 1865 (c) 1870 (d) 1875

(vii) "ساقی نامہ" کس کی نظم ہے؟

(a) مولانا حالی (b) محمد حسین آزاد (c) علامہ اقبال (d) چکبست

(vii) نظم "رامائن کا ایک سین" کس ہیئت میں لکھی گئی ہے؟

(a) مسدس (b) مخمس (c) مربع (d) مسبع

(viii) اختر شیرانی اور حافظ محمود شیرانی میں کیا رشتہ تھا؟

(a) بھانجا اور ماموں (b) ناتی اور نانا (c) پوتا اور دادا (d) بیٹا اور باپ

(ix) ''نقش فریادی'' کس کا شعری مجموعہ ہے؟

(a) فیض احمد فیضؔ (b) جوش ملیح آبادی (c) اختر شیرانی (d) مخدوم محی الدین

(x) نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں کل کتنے بند ہیں؟

(a) دو (b) چار (c) چھ (d) آٹھ

حصہ دوم

2۔ نظم کی تعریف بیان کیجیے۔

3۔ مستزاد کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کی ایک مثال لکھیے۔

4۔ نظم ''آدمی نامہ'' کا خلاصہ بیان کیجیے۔

5۔ نثری نظم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔

6۔ مولانا حالی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

7۔ اختر شیرانی کی قومی وسیاسی نظموں کا احاطہ کیجیے۔

8۔ ترقی پسند اردو نظم کے موضوعات پر نوٹ لکھیے۔

9۔ فیض احمد فیضؔ کی نظم نگاری کا جائزہ لیجیے۔

حصہ سوم

10۔ اردو نظم نگاری کی روایت پر مضمون قلم بند کیجیے۔

11۔ انجمن پنجاب کی ادبی خدمات کا احاطہ کیجیے۔

12۔ اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

13۔ نظم ''رامائن کا ایک سین'' کی تشریح کیجیے۔

14۔ حلقہ ارباب ذوق کا نظریہ ادب کیا تھا؟ بیان کیجیے۔